# تاریخی مقالات

پروفیسر محمد اسلم

# تاریخی مقالات

## پروفیسر محمد اسلم

صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی

لاہور

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

مسلم ہند کے سیاسی، مذہبی اور سماجی حالات کا مرقع

# تاریخی مقالات

پروفیسر محمد اسلم
صدر شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی
لاہور

بک ٹاک
میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ۔ لاہور

954
27 م

مسلمان - پاک و ہند — ~~سیاسیات~~ ست اور حکومت

" — " — معاشرتی حالات

۱۹۹۱ء
ناشر :- رانا سلطان محمود
پریس :- رومی پرنٹرز لاہور
تزئین سرورق :- نعیم احسن
قیمت :- ۱۷۵/- روپے

## انتساب

میں اپنی اس تالیف کو
اُردو زبان و ادب کے نامور محقق

**پروفیسر مختار احمد**

سابق صدر شعبۂ عربی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

**کے نام**

محبت اور خلوص کے جذبات کے ساتھ
معنون کرتا ہوں۔

# عرضِ مصنف

۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان میرے بہت سے تحقیقی مضامین برعظیم پاک و ہند کے مختلف علمی رسائل میں شائع ہوئے۔ میرے علم دوست احباب میں سے جناب محمد عبداللہ قریشی اور جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ میری بھی یہ دلی خواہش تھی کہ ان متفرق مضامین کو نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں محفوظ کر لوں۔ چنانچہ یہ مضامین "تاریخی مقالات" کے عنوان سے ندوۃ المصنفین لاہور سے طبع ہو گئے۔ میری توقع سے بڑھ کر تاریخی مقالات کی پذیرائی ہوئی۔ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں نے اس کتاب کو ایم اے تاریخ کے نصاب میں شامل کر لیا، وفاقی پبلک سروس کمیشن نے اسے سی ایس ایس کے نصاب میں شامل کر کے میری عزت افزائی کی۔ مدت سے یہ کتاب بازار سے دستیاب نہ تھی اب میں نے طلبہ کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے دوبارہ طبع کر دیا۔ میں نے پرانے ایڈیشن کے تین مقالے نکال کر ان کی جگہ موجودہ ایڈیشن میں تین ایسے مقالے شامل کر دیے ہیں جن کی ایم اے اور سی ایس ایس کے امیدواروں کو زیادہ ضرورت رہتی ہے۔

نئے ایڈیشن کی طباعت کے لئے میں جناب محمد اسلم شاد اور بک ٹاک کے رانا سلطان محمود صاحب کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں، مجھے امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن کی پذیرائی پہلے ایڈیشن سے بھی بڑھ کر ہوگی۔

محمد اسلم
صدر شعبہ تاریخ
پنجاب یونیورسٹی،
لاہور

مورخہ ۷، ستمبر ۱۹۹۱ء

# فہرست

پیش لفظ ۷
کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ سے منسوب تھی ۱۱
فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی اور ان کا ایک نادر رسالہ ۳۴
مبلغ الرجال ۶۳
احسن الاقوال کی تاریخی اور سماجی اہمیت ۸۵
شاہانِ مغلیہ کا ذوقِ موسیقی ۱۲۲
مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات ۱۷۸
درس نظامی کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت ۱۹۰
فتوحاتِ فیروز شاہی ۲۲۶
نظریۂ خلافت ۲۴۹
اورنگ زیب کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار ۲۸۳
مسجد قبا سے تاج محل تک ۳۰۰
مسلمانوں کی طبی خدمات ۳۱۴
داتا گنج بخش کی لاہور میں آمد ۳۲۵

*

# پیش لفظ

(طبع اول)

شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے جواں سال استاذ اور تاریخ کے ہونہار طالب علم مسٹر محمد اسلم پاکستان، بھارت اور بیرونی ممالک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ جامعات پنجاب، ڈرہم، مانچسٹر اور کیمبرج کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کی اولین تصنیف۔ دینِ الٰہی کے موضوع پر دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ حال ہی میں اس کتاب کا جدید ایڈیشن طویل اضافوں کے ساتھ لاہور سے ندوۃ المصنفین کی اولین پیشکش کے طور پر۔ دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر۔ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دینِ الٰہی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے اور اس کے متعلق عوام میں خاصی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ دینِ الٰہی کے موضوع پر پروفیسر محمد اسلم کی کتاب سے زیادہ مستند کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی تالیف کے دوران ایسے بہت سے مخطوطات سے استفادہ کیا ہے جو اب تک مستشرقینِ یورپ، اور خود ہمارے تاریخ دانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ فاضل مصنف کے بعض نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک ماخذ سے استنباط کا تعلق ہے وہ شک و شبہ سے بالا ہے۔ مصنف نے جس محنت، تجسس اور ذوق و شوق کے ساتھ اس کتاب کے لئے مواد اکٹھا کیا ہے اور

پھر اسے جس قرینے کے ساتھ ترتیب دیا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔

مسٹر اسلم کی تازہ تصنیف "تاریخی مقالات" حال ہی میں قائم ہونے والے ادارے ندوۃ المصنفین کی دوسری پیشکش ہے۔ زیبِ عنوان کتاب عزیزِ موصوف کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو پاکستان اور بھارت کے بلند پایہ علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات، جن کا بظاہر ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں، اپنے اندر وسیع معلومات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جہاں مصنف کے تبحرِ علمی اور وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے وہیں اس صبر آزما محنت اور لگن کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کے ساتھ عزیزِ گرامی نے ہمارے گمشدہ علمی اور ثقافتی ورثے کا کھوج لگا کر اپنے قارئین کو نامور مسلم فضلاء اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا ہے۔

مسٹر اسلم تاریخ کے متبحر عالم ہیں اور انہوں نے تاریخ کے مطالعہ کے بعد خود کو مسلمانوں کی اعلیٰ علمی روایات اور تاریخ نگاری کے حقیقی معیار تک پہنچا دیا ہے۔ وہ اپنے نتائجِ فکر کو نہ تو دوسروں پر ٹھونسنے کے عادی ہیں اور نہ ہی وہ اپنے قاری کو اپنا ہم خیال بنانے کی خواہ مخواہ کوشش کرتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نئے حقائق تلاش کریں اور منصفانہ طریقے سے ہماری علمی و ادبی تاریخ کے تاریک گوشوں کو اجاگر کرتے چلے جائیں۔ وہ اس بات کا فیصلہ اپنے قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ خود ان کی ذوقِ تجسس کے ساتھ جمع کردہ معلومات اور مستند تحریروں کی روشنی میں کسی شخص کا علمی مقام متعین کریں۔ اُنھوں نے یہ مقالات بڑے علمی ذوق اور خلوصِ نیت کے ساتھ لکھے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ ان کی تحریروں میں شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔

ان مقالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک قاری دو گونہ اثر لیتا ہے

جہاں ایک طرف وہ ان بلند پایہ علمی مقالات سے شاد کام ہوتا ہے وہیں اُسے یہ حسرت رہ جاتی ہے کہ ان موضوعات پر اور زیادہ کیوں نہیں لکھا گیا، حالانکہ یہ موضوع ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک جامع کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے ان مقالات کے مطالعہ کے بعد جہاں ایک قاری ایک کیف سا محسوس کرتا ہے وہیں وہ تشنگی بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کتاب کی قدر و قیمت کم ہو جاتی ہے بلکہ یہاں یہ بات مدِنظر رکھنی چاہیے کہ جن رسائل میں یہ مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں ہر مضمون کے لئے بنی تلی ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ اس لئے ایسے مقالات میں مصنف کے لئے زیادہ تفصیل میں جانے یا اپنی قابلیت کے جوہر دکھلانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

یہ کتاب جو تیرہ مقالات پر مشتمل ہے، تاریخ، موسیقی، فنِ لغت، طب، شاعری، سوانح اور جغرافیہ جیسے موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس اعتبار سے اس کتاب میں ہر شخص کے ذوق کا سامان موجود ہے۔ اس کتاب کا ہر مقالہ اپنی جگہ پر منفرد ہے اور ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فاضل مصنف ہر موضوع پر عالمانہ انداز میں لکھ سکتا ہے۔ اس کتاب میں چند مقالات ایسے بھی آئے ہیں جہاں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ تاہم اس کتاب کا مطالعہ تاریخ کے اساتذہ اور طلباء کے لئے سود مند ہونے کے علاوہ ان میں تحقیق کا ذوق پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوگا۔ آخر میں میں فاضل مصنف کو اس کتاب کی اشاعت پر خلوصِ دل سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

**شیخ عبدالرشید**

سمن آباد
لاہور

# کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی
# حضرت بابا فریدالدین گنجشکرؒ سے منسوب تھی؟

سلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے عقد کا واقعہ زبان زدِ خلائق ہے۔ اس موضوع پر راقم السطور نے جو تحقیق کی ہے وہ ہدیۂ قارئین ہے، اس سوال کے جواب کے لئے سب سے پہلے ہم حضرت بابا صاحبؒ کے محرمِ راز، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

فوائد الفواد، حضرت سلطان المشائخؒ کے ملفوظات کا ایک بیش قیمت مجموعہ ہے جسے ان کے فاضل مُرید خواجہ حسن سجزیؒ نے مرتب کیا تھا، اس کتاب کی تاریخی حیثیت ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے۔ چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے وابستہ فقراء کے نزدیک اس کا وہی مقام ہے جو سہروردیہ سلسلہ کے درویشوں کے ہاں حضرت ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف کا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے زیادہ بابا صاحبؒ کا کوئی دوسرا محرمِ راز نہ تھا تاہم اس ۳۶۴ صفحات کی ضخیم کتاب میں جہاں بابا صاحبؒ کے بے شمار فضائل بیان کئے گئے ہیں وہاں سلطان غیاث الدین بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کے

رشتہ کا اصلاً کوئی ذکر موجود نہیں، اگر ایسا ازدواجی رشتہ موجود ہوتا تو حضرت نظام الدین اولیاؒ اس کا کبھی نہ کبھی تو ضرور ہی ذکر فرماتے۔[۱]

امیر حسن سجزیؒ کی طرح سید محمد مبارک امیر خورد کرمانیؒ بھی حضرت سلطان المشائخؒ کے دامن ارادت سے وابستہ تھے اور انھوں نے سیر الاولیاء کے نام سے خواجگانِ چشت کے سوانح پر ۵۶۴ صفحات کی ایک ضخیم کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے، اس کتاب میں باباصاحبؒ کے حالات ۵۷ صفحہ سے ۹۱ صفحہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔[۲] باباصاحبؒ کے سوانح حیات پر سید امیر خوردؒ نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو فاضل مصنف کی نگاہ باریک بیں سے اوجھل نہیں رہا۔ اس کتاب کے اندراجات کے متعلق پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب رقمطراز ہیں:۔

"اس کتاب میں بابا فریدؒ کی زندگی کے واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور ان کے علاوہ ان کے خاندان اور خلفاء کے حالات بھی اس کتاب میں مندرج ہیں، امیر خوردؒ کی معلومات اپنے گھرانے کی یادداشت پر مبنی ہیں یا پھر خواجہ نظام الدینؒ کے ارادت مندوں سے حاصل کی گئی ہیں جنھوں نے اس سرمایہ کو محفوظ کر لیا تھا۔[۳]

اس کے باوجود اس کتاب میں باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کے رشتہ کا مطلق کوئی ذکر موجود نہیں۔ حالانکہ امیر خوردؒ نے ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں اور نواسوں تک کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں۔

---

[۱] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء [۲] امیر خورد، سیر الاولیاء مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ

[۳] پروفیسر شیخ عبدالرشید ہسٹوریز آف انڈیا، پاکستان اینڈ سیلون، مطبوعہ لندن ۱۹۶۱ء ص ۱۳۵

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے جانشین حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے ملفوظات ان کے ایک مرید حمید قلندر نے خیر المجالس کے نام سے مرتب کئے تھے جنھیں استاد گرامی جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بڑے خوبصورت ٹائپ میں علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔[۴] ۳۰۷ صفحات کی اس عظیم کتاب میں بھی اس واقعہ کا سرے سے کوئی ذکر ہی موجود نہیں ہے، اگر حضرت نصیرالدینؒ نے ایسی کوئی بات حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زبانِ حقیقت بیان سے کبھی سنی ہوتی تو وہ اس کا کبھی نہ کبھی تو اپنی مجلس میں ذکر فرماتے۔

عہد سلطنت کے سب سے نامور مؤرخ ضیاءالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان بلبن کے حالات ۱۱۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس کتاب میں بھی سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ باباصاحبؒ کی نسبت کا کوئی ذکر موجود نہیں۔[۵] اس پر لطف یہ ہے کہ ضیاالدین برنی حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کے دامن ارادت سے وابستہ تھا اور اگر اس نے کبھی حضرت محبوب الٰہی کی زبان فیض ترجمان سے ایسی بات سنی ہوتی یا کسی اور ذریعہ سے اُسے اس رشتہ کا علم ہوتا تو وہ بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر کرتا۔ اس کی تاریخ فیروز شاہی باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی لاتعلقی پہ ایک خاموش گواہ کی حیثیت سے موجود ہے۔

عہد فیروزی کے مشہور مؤرخ شمس سراج عفیف نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف تاریخ فیروز شاہی میں مشائخ چشت کا جابجا ذکر کیا ہے، فاضل مصنف باباصاحبؒ

---

[۴] حمید قلندر، خیر المجالس، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۵۹ء

[۵] ضیاالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد اول، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۲۹-۱۴۶

کے خلیفۂ اوّل حضرت قطب جمال ہانسویؒ کے جلیل القدر پوتے حضرت قطب الدین منورؒ کا مرید تھا۔ اس نے اپنے مشائخ کے فضائل و مناقب بڑے عمدہ پیرایہ میں بیان کئے ہیں لیکن اس کی ۵۱۶ صفحات کی تاریخ فیروز شاہی باباصاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کی لاتعلقی پر بہترین گواہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش ہے۔[۶]

یحییٰ سرہندی، سلاطین سادات کے عہد کا ایک نامور مورخ ہے اور اس کی تاریخ مبارک شاہی علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں سلطان بلبن کا ذکر ۳۹ صفحہ سے ۵۲ صفحہ تک کیا ہے لیکن وہ بھی باباصاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتے سے بے خبر تھا۔[۷]

شیخ جمالی، سلطان سکندر لودھی کے اُستاد اور اکبر کے سب سے پہلے صدر الصدور شیخ گدائی کے والد، اپنے زمانے میں بڑے نامور صوفی اور شاعر ہو گذرے ہیں۔ مولانا جامیؒ کے ساتھ ان کے تعلقات کے سلسلہ میں کئی دلچسپ لطائف قارئین میں سے اکثر و بیشتر نے سنے ہوں گے۔ شیخ جمالی نے خواجگان چشت کے حالات سیر العارفین میں بڑی محنت سے، اور اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو سب سے پہلے، سائنٹیفک طریقہ پر قلمبند کئے ہیں۔ اس کتاب میں باباصاحبؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے شیخ جمالی رقمطراز ہیں کہ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں بلبن، جو ان دنوں اُلغ خان کے لقب سے ملقب اور سلطان کا وزیر تھا، چار گاؤں کی جاگیر کا قبالہ لیکر باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؒ نے یہ فرماتے ہوئے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

---

[۶] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء

[۷] یحییٰ سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۳۹ - ۵۲

| | |
|---|---|
| "ہر کرا طالب و راغب دانید | جو اس سے رغبت رکھتا ہو یا اس کا |
| برسانید" | طالب ہو اُسے پہنچا دو۔ |

اس موقعہ پر بھی شیخ جمالی نے کسی ازدواجی رشتہ کا ذکر نہیں فرمایا حالانکہ یہ اس کے بیان کا بہترین موقعہ تھا۔[۸]

بابر و ہمایوں کے عہد میں چشتیہ سلسلہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بڑے نامور بزرگ ہو گذرے ہیں۔ اور جن مشائخ نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے تحریک چلائی تھی، آپ ان کے علمبردار تھے۔ آپ کے ملفوظات آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدینؒ نے مُرتب کئے تھے، ان میں بھی حضرت باباصاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتہ کا کہیں ذکر نہیں آیا۔[۹]

ملّا نظام الدین احمد، صاحبِ طبقات اکبری و مرتبِ تاریخ الفی اکبر کے عہد میں نامور مؤرخ ہو گذرا ہے۔ اس نے طبقات اکبری میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ذکر صفحہ ۸۰، سے صفحہ ۱۰۳ تک کیا ہے۔ بلبن کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے ملّا صاحب رقمطراز ہیں[۱۰]:-

| | |
|---|---|
| "بصیامِ نفل و قیامِ شب و مواظبت | سلطان بلبن نفلی روزے رکھنے کے |
| جمع و جماعات و نمازِ اشراق و تہجد | علاوہ رات کو قیام کرتا اور پابندی کے |
| اشتغال داشت و اصلاً بے وضو | ساتھ نماز جمعہ میں شریک ہوتا تھا۔ |
| نبودے و بے حضور علماء و صلحاء دست | وہ نماز باجماعت کا بڑا خیال رکھتا تھا اور |

---

[۸] شیخ جمالی، سیر العارفین، قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۵ P II، ورق ۳۰ الف تا ۵۴ ب،

[۹] لطائف قدوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، تعداد صفحات ۱۰۷

[۱۰] نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد اوّل، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ص ۸۲

> بطعام نبردے، در وقت طعام خوردن مسائل شرعی از علمائے تحقیق نمودے و در خانہای بزرگان رفتے و لبعد از نماز جمعہ زیارت مقابر کردے و در جنازۂ اکابر حاضر شدے و تعزیت رفتے و پسران و خویشان میت را بخلعت نوازش فرمودے و وظیفہ میت بر وارثان او مقرر داشتے و باچندین حشمت و دبدبہ اگر در عین سواری خبر یافتے کہ فلان جا مجلس وعظ است در ساعت فرود آمدے و تذکیر شنیدے و گریہ کردے "

اشراق و تہجد کبھی نوبت نہ ہونے دیتا۔ سلطان ہمیشہ باوضو رہتا اور جب تک علماؑ و صلحاؑ موجود نہ ہوتے وہ کھانے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ کھانے کے دوران بھی وہ علما سے شرعی مسائل دریافت کیا کرتا تھا۔ سلطان بزرگانِ دین کے گھروں میں بھی چلا جاتا اور نمازِ جمعہ کے بعد وہ مقابر کی زیارت کو نکل جاتا تھا۔ وہ بزرگوں کے جنازوں میں شریک ہوتا اور ان کی تعزیت کے لیے بھی جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میت کے بیٹوں اور رشتہ داروں کو کپڑے دیتا اور مرنے والے کا وظیفہ اس کے وارثوں کے نام منتقل کر دیتا تھا۔ اس قدر جاہ و جلال کے باوجود اگر وہ کبھی سوار ہو کر نکلتا اور اسے خبر ملتی کہ فلاں جگہ وعظ ہو رہا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے سواری سے اُتر آتا، وعظ سنتا اور رونے لگتا۔

نظام الدین احمد نے اس کے اوصافِ حمیدہ کے ضمن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ اس نے اپنی دخترِ نیک اختر ایک درویش کے عقد میں دے دی تھی۔

اسی عہد کے دوسرے نامور اور شہرۂ آفاق مؤرخ ملّا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کی تینوں جلدیں میرے پیشِ نظر ہیں۔ جلد اوّل میں سلطان غیاث الدین بلبن کا ذکر ۱۲۷ صفحہ سے ۱۵۷ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے[11]۔ ملا صاحب نے بھی سنی العقیدہ اور معتقد فقرا ہونے کے باوجود باباصاحبؒ کے ساتھ اس کی بیٹی کے رشتہ کا متعلق ذکر نہیں فرمایا۔ حالانکہ ملا صاحب بال کی کھال اتارنے اور رائی کا پہاڑ بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اس کے باوجود انھوں نے اس بات کا ذکر اشارۃً بھی نہیں فرمایا۔

---

[11] منتخب التواریخ، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۱۲۷ - ۱۵۷۔

ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ بھی اکبر کا ہم عصر مؤرخ تھا، اس کی تاریخ گلزارِ ابراہیمی سے، جو عوام میں تاریخِ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے، تاریخ کا ہر طالبِ علم واقف ہے، گلزارِ ابراہیمی میں فرشتہ نے ہندوستان کے اولیائے عظام کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور باباصاحبؒ کے سوانح حیات فل سکیپ سائز کے ۱۴ صفحات پہ پھیلے ہوئے ہیں[12]۔ باباصاحبؒ کے متعلق فرشتہ کی معلومات ہم میں سے اکثر و بیشتر اشخاص سے کہیں زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ باباصاحبؒ کے رشتہ سے وہ بھی بے خبر تھا۔

ابوالفضل علامی مغل شہنشاہ اکبر کا وزیرِ اعلیٰ اور اپنے زمانے کا بہترین اہلِ قلم تھا، اس کی تصانیف میں سے انشائے ابوالفضل، آئینِ اکبری اور اکبر نامہ اس کی علمیت پر دال ہیں۔

اکبر نامہ ابوالفضل کی بڑی اہم تصنیف ہے جو تین جلدوں میں طبع ہو چکی ہے، ہر چند کہ یہ کتاب عہدِ اکبر کے واقعات پر مشتمل ہے تاہم اس میں بزرگانِ دین کا ذکرِ خیر بھی ضمناً آ گیا ہے، اکبر نامہ جلد دوم میں باباصاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے لیکن بنتِ بلبن سے ان کی نسبت کا ذکر موجود نہیں[13]۔

---

[12] فرشتہ، گلزارِ ابراہیمی، جلد دوم مطبوعہ ۱۸۳۲ء، ص ۷۱۵ - ۷۲۹

[13] ابوالفضل، اکبر نامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۹ء، ص ۳۵۹،

آئین اکبری اس کی دوسری اہم کتاب ہے اس کی تیسری جلد کا انگریزی ترجمہ کرنل ایچ، ایس، جیرٹ نے کلکتہ سے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں "اولیائے ہند" کے عنوان سے ابوالفضل نے جن بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر قلم اُٹھایا ہے ان میں باباصاحب کا نامِ نامی بھی موجود ہے[14] لیکن سلطان بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کے رشتہ سے ابوالفضل بھی بے خبر ہے۔ اگر ابوالفضل اکبرنامہ میں یہ بات لکھنی بھول گیا تھا تو آئینِ اکبری میں ہی اس کا ذکر آجانا چاہیئے تھا۔

عبدالباقی نہاوندی، عبدالرحیم خانخاناں کے دسترخوان کرم کا ریزہ چین تھا۔ اس نے اپنے محسن، اس کے آباؤ اجداد، ہم عصر علماء، شعراء اور فضلاء کا ذکر بڑے عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ اس کی مایہ ناز تصنیف مآثر رحیمی ۱۹۲۴ء میں کلکتہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں ہندوستان کے قدیم سلاطین کا ذکر بھی موجود ہے اور اس ضمن میں اس نے سلطان بلبن کے سوانح حیات بھی قلمبند کئے ہیں لیکن وہ بھی ایسے رشتہ سے بے خبر تھا[15]

بزرگوں کے سوانح حیات پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اخبار الاخیار اس پایہ کی کتاب ہے کہ جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں اس کتاب کی تصنیف پر شیخ محدثؒ کو خراج تحسین پیش کیا ہے[16] اس کتاب کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ شیخ محدثؒ کے بعد آنے والے تمام تذکرہ نویسوں نے اس سے

---

[14] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء، ص ۳۶۳ - ۳۶۴،

[15] عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء، ص ۳۰۵ - ۳۰۶

[16] تزک جہانگیری، (سرسید ایڈیشن) علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۸۲ -

استفادہ کیا ہے۔ اخبار الاخیار میں باباصاحبؒ کا ذکر خیر بھی موجود ہے لیکن بلبن کی بیٹی کے ساتھ ان کی نسبت پر شیخ موصوف بھی خاموش ہیں[17]

محمد غوثی منڈوی صاحب گلزار ابرار عہد اکبر و جہانگیر میں مشہور تذکرہ نویس ہو گزرے ہیں۔ گلزار ابرار کا اُردو ترجمہ تو مدت ہوئی اذکارِ ابرار کے نام سے شائع ہو چکا ہے، لیکن اصل کتاب ہنوز زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کا ایک بڑا عمدہ قلمی نسخہ جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر میں محفوظ ہے جس کی مائیکروفلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ محمد غوثی نے آٹھ صفحات پر باباصاحبؒ اور ان کی اولاد اور خلفاء کے حالات درج کئے ہیں اور انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بنتِ بلبن اور باباصاحبؒ کے رشتہ سے بے خبر تھا[18]

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے اور جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ایک مرید علی اکبر حسینی اردستانی نے مجمع الاولیاء کے نام سے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات کی ایک عظیم اور ضخیم کتاب شاہجہان کی تخت نشینی کے چھ سال بعد قلمبند کی تھی۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے جس کی مائیکروفلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس کتاب میں باباصاحبؒ کے سوانح حیات بھی ملتے ہیں لیکن اس رشتہ کا ذکر کہیں موجود نہیں[19] حالانکہ مجمع الاولیاء ایک ایسی کتاب ہے کہ اس میں بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو صرف سننے میں

---

[17] شیخ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۵۲ - ۵۴

[18] گلزار ابرار، فارسی مخطوطہ نمبر ۱۰۵، جان رے لینڈ لائبریری مانچسٹر، ورق ۲۶ الف تا ۲۹ ب،

[19] مجمع الاولیاء۔ انڈیا آفس لائبریری، مخطوطہ نمبر ایتھے ۶۴۵، ورق ۶۵۱ الف تا ۶۵۴ ب،
(مجمع الاولیاء کا ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی محفوظ ہے)

آتے ہیں لیکن پڑھنے میں نہیں آتے ۔

مجمع الاولیاء کی تصنیف کے چھ سال بعد ۱۰۴۹ھ میں شہزادہ دارا شکوہ نے بزرگانِ دین کے سوانح حیات پر سفینۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، اس میں بھی بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے[۲۰]۔ اگر سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بابا صاحبؒ کے حرم میں ہوتی تو شہزادہ دارا شکوہ اس کا ذکر بڑے فخریہ پیرائے میں کرتا۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ دارا شکوہ نے بابا صاحبؒ اور ان کی رفیقۂ حیات کا مکالمہ نقل کیا ہے جس میں وہ نیک بخت بابا صاحبؒ سے تنگ دستی اور فاقہ مستی کا گلہ کرتی ہے، کم از کم ایسے موقع پر تو دارا شکوہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ وہ سلطان بلبن کی بیٹی تھی اور اس نے اچھا وقت دیکھا ہوا تھا اور جب فاقوں تک نوبت پہنچی تو بابا صاحبؒ سے شکوہ کرنے لگی۔

دارا شکوہ کی بہن شہزادی جہاں آرا نے اپنے طور پر خواجگانِ چشت کے سوانح حیات مونس الارواح کے نام سے مرتب کیے تھے، اس کتاب میں بابا صاحب کا ذکرِ خیر آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے[۲۱]۔ اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں آرا بھی خواجگانِ چشت سے عقیدت کے باوجود بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کے رشتہ سے بے خبر تھی۔

عہدِ عالمگیر کے مشہور مؤرخ بختاور خاں کی ریاض الاولیاء بھی اسی سلسلے کی ایک اہم اور ضخیم کتاب ہے۔ یہ کتاب بھی بدقسمتی سے ہنوز طبع نہیں

---

[۲۰] دارا شکوہ، سفینۃ الاولیاء، مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۲ء، ص ۹۶ - ۹۷،

[۲۱] جہاں آرا، مونس الارواح، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی نمبر ۱۱۹۱/۲ III PF، ورق ۹۰ ب تا ۹۴ الف

ہوئی لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے، جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ اس میں بابا صاحبؒ کے سوانح حیات بھی مندرج ہیں لیکن بنتِ بلبن کے ساتھ ان کے رشتۂ ازدواج کا ذکر موجود نہیں ہے[۲۲]۔

اسی سلسلے کی ایک کتاب سفینۃ العارفین۔ مرتبہ محمد امان کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے جس کی مائیکرو فلم راقم الحروف کے پاس موجود ہے اس میں بابا صاحبؒ کا ذکر خیر موجود ہے لیکن محمد امان بھی بنتِ بلبن کے ساتھ ان کے تعلق سے بے خبر ہے[۲۳]۔

بہر حال سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک ساڑھے چار سو سال میں جن مطبوعہ کتبِ تاریخ یا صوفیانہ تذکروں میں جہاں کہیں سلطان بلبن یا بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر آیا ہے۔ وہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ان کتابوں میں بابا صاحبؒ اور سلطان بلبن کی بیٹی کی نسبت کا کسی نے کھل کر تو کیا اشارۃً یا کنایۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ اگر اس مفروضہ میں ذرہ بھر بھی حقیقت ہوتی تو کوئی نہ کوئی تذکرہ نویس اس کا ذکر ضرور کرتا۔ آخر اتنا اہم اور بڑا واقعہ تاریخ نگاروں یا تذکرہ نویسوں کی نظروں سے کیونکر اوجھل رہ سکتا تھا۔

انگریزی عہد میں جب پہلی بار ۱۸۸۳ء میں گزیٹیر آف منٹگمری ڈسٹرکٹ شائع ہوا تو اس میں بھی بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود تھا، لیکن اس میں بھی بابا صاحبؒ کے سوانح حیات کے ضمن میں فاضل مرتب نے بنتِ بلبن کے ساتھ ان کی

---

[۲۲] ریاض الاولیاء، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن نمبر اورینٹل ۱۷۴۵، ورق ۵۲ اب تا ۵۳ اب،

[۲۳] سفینۃ العارفین قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن نمبر اورینٹل ۲۱۳، ورق ۲۲ الف، ۲۲ ب

نسبت کا کوئی ذکر نہیں کیا[24]

زمانہ حال کے مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب کا بڑا اونچا مقام ہے۔ آپ نے "آبِ کوثر" میں بارہ صفحات میں بابا صاحبؒ کے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں۔ سلطان بلبن اور بابا صاحبؒ کے تعلقات کے ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ سلطان بلبن اپنے زمانۂ وزارت میں بابا صاحبؒ کی خدمت میں چار گاؤں کی ایک جاگیر کا پروانہ لے کر حاضر ہوا لیکن بابا صاحبؒ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ بلبن کی بیٹی کے ساتھ بابا صاحبؒ کی نسبت کا ذکر کرنے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن شیخ صاحب بھی اس نسبت کے متعلق خاموش ہیں[25]

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں آرٹیکل "فریدالدین مسعود گنج شکر" موجود ہے اور فاضل مصنف نے ببلیوگرافی میں بے شمار ایسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن میں بابا صاحبؒ کا ذکرِ خیر موجود ہے، لیکن اُسے بھی ایسی کوئی شہادت نہ مل سکی جس سے یہ ثابت ہوتا کہ بابا صاحبؒ کے نکاح میں سلطان بلبن کی کوئی بیٹی بھی تھی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی ہمارے زمانے میں عہدِ سلطنت کی تاریخ و ثقافت اور چشتیہ خاندان کے بزرگوں پر آخری سند سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب "دی لائف اینڈ ٹائمز آف حضرت فریدالدین گنجشکر" علی گڑھ سے شائع ہو چکی ہے۔ مشہور مستشرق اور ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سر ہملٹن گب نے

---

[24] گزیٹیئر آف دی منٹگمری ڈسٹرکٹ، مطبوعہ لاہور ۱۸۸۸ء، ص ۱۸۴ - ۱۸۵،

[25] آبِ کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۶ - ۲۵۸

کبھی کسی کتاب پر تقریظ نہیں لکھی، لیکن اس کتاب میں پروفیسر خلیق احمد نظامی کی تحقیق و کاوش بلاحظہ کرتے ہوئے انھوں نے پہلی بار اپنا اصول توڑا۔ قارئین کو شاید یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ اس کتاب میں بھی کسی ایسی نسبت کا ذکر موجود نہیں[26]

"سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات" پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ایک اور مایۂ ناز تصنیف ہے اور حق تو یہ ہے کہ آج تک اس موضوع پر ایسی پُر مغز کتاب کسی اسکالر کے قلم سے نہیں نکلی۔ اس میں سلطان بلبن کے مذہبی رجحانات کے ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"جواہر فریدی میں گلشن اولیاء کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ بلبن کی ایک بیٹی کی شادی بابا صاحب سے ہوئی تھی اور بعد کے تذکروں میں اس سلسلہ میں بہت سے قصے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن کئی وجوہ کی بنا پر ہم اس روایت کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ کسی معاصر مورخ یا تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا، برنی کی تاریخ اور میر خورد کے تذکرہ میں متعدد مقامات ایسے آئے ہیں جہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ روایت کسی حقیقت پر مبنی ہوتی تو وہ اس کا ضرور ذکر کرتے، علاوہ ازیں بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا اس کے پیش نظر اس قسم کے رشتہ کی توقع نہیں کی جا سکتی"[27]

یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ وہ واقعات جن کا ذکر بلبن کے عہد سے

---

[26] خلیق احمد نظامی، دی لائف اینڈ ٹائمز آف حضرت فریدالدین گنج شکر، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۵ء

[27] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۶۷

ے کر اورنگ زیب کے عہد تک کسی مؤرخ یا تذکرہ نویس نے نہیں کیا اُن کا ذکر گذشتہ صدی کے آواخر میں شائع ہونے والی کتابوں مثلاً خزینۃ الاصفیا، حقیقتِ گلزارِ صابری، جواہرِ فریدی اور چراغِ الچشت میں موجود ہے، مؤخر الذکر تینوں کتابوں میں اکثر و بیشتر ایسے بے سر و پا قصّے پڑھنے میں آتے ہیں کہ ان کا ذکر کرنے کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ ان کتابوں کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ فنِ تذکرہ نویسی کے معیار پر پورا اترتی ہیں۔ ان کتابوں میں فوائد السالکین، راحت القلوب اور افضل الفوائد جیسی وضعی کتابوں کے حوالوں سے بہت سی ایسی باتیں نقل کی گئی ہیں جو حقیقت سے بعید ہیں۔

اسی طرح اُن کے مصنف اکثر جگہ بابا صاحبؒ کی زندگی کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے یوں لکھنے کے عادی ہیں کہ "نقل ہے کہ" اور محدثینؒ کی اصلاح میں ایسا شخص جو روایت بیان کرے لیکن راوی کا نام چھپائے اُسے مدلس کہتے ہیں اور ایسے مصنفوں کے سوانح حیات پر طبقات المدلسین نام کی ایک کتاب موجود ہے۔ اسی طرح ان کتابوں میں افراط و تفریط بھی بہت پائی جاتی ہے بابا صاحبؒ نے بقول امیر خورد اور شیخ محدثؒ چالیس شب چلہ معکوس کیا تھا[27][28] انیسویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے چالیس شب کو پانچ سال پھر بارہ سال اور آخر میں چالیس سال بنا دیا۔

مفتی غلام سرور لاہوری کی خزینۃ الاصفیاء پر سبھی مؤرخ اور تذکرہ نویس اعتماد کرتے ہیں۔ مشہور مستشرق پروفیسر آربری نے اس کتاب کی تعریف میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا پہلا تذکرہ ہے جو سائینٹفک

---

[27] سیر الاولیاء، ص ۷۰، [28] اخبار الاخیار، ص ۵۳،

طریقہ پر لکھا گیا ہے۔ مفتی صاحب نے خدا جانے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ سلطان بلبن کی بیٹی ہزیرہ بانو بابا صاحبؒ کے حرم میں تھی۔ مفتی صاحب نے بنتِ بلبن کا نام بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالا ہے۔ مفتی صاحب کی خزینۃ الاصفیاء جس کی پروفیسر آربری نے اس قدر تعریف کی ہے، رطب و یابس سے مملو ہے۔ مفتی صاحب کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، مثلاً ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ جب داتا گنج بخش علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے تو لوگ حضرت حسین زنجانیؒ کا جنازہ اُٹھانے کے لئے جا رہے تھے۔[29] دوسرے موقع پر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ داتا صاحبؒ نے بقول بعض سنہ ۴۶۰ھ اور بقول بعض سنہ ۴۶۵ھ میں وفات پائی[30] اور تیسرے موقع پر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت حسین زنجانیؒ کا انتقال سنہ ۶۰۰ھ میں ہوا۔[31] یعنی داتا صاحب کی وفات کے ۱۴۰ یا ۱۳۵ سال بعد جب خزینۃ الاصفیاء میں اس طرح کی روایات عام ہوں تو اس پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اسی سلسلہ میں سیر الاقطاب مصنفہ شیخ الہدیہ چشتی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ اس کتاب میں بابا صاحب کا ذکر خیر سترہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مصنف دیباچہ میں رقمطراز ہے کہ اس نے یہ کتاب "سن ستہ و ثلثین والف (۱۰۳۶) میں حضرت ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہان غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنۃ، کے عہد میں لکھی ہے[32] شاہجہان سن سبع و ثلثین والف

---

[29] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم، مطبوعہ کانپور ۱۹۱۴ء، ص ۲۳۴،
[30] ایضاً، ص ۲۳۴ [31] ایضاً، ص ۲۵۱
[32] شیخ الہدیہ، سیر الاقطاب، مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۳ء، ص ۳

(۱۰۴۷ء) میں تخت نشین ہوا تھا۔ کم از کم ایک ہم عصر تذکرہ نویس ایسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی وضعی ہے اور اس کی روایات پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

آیئے اب دوسرے شواہد سے اس روایت کا تجزیہ کریں۔

۱۔ بابا صاحبؒ نے ۱۲۶۵ء میں پچانوے سال کی عمر میں وفات پائی۔ بابا صاحبؒ کی عمر کے متعلق امیر خورد نے ایک بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے سوال کیا تھا کہ "عمر شریف حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز چند سال بود؟" آپ نے ارشاد فرمایا "نود و پنج سال"[۳۳]۔ غیاث الدین بلبن بابا صاحب کی وفات کے ایک سال بعد ۱۲۶۶ء میں تخت نشین ہوا، اگر ہم یہ کہیں کہ بلبن نے اپنے زمانۂ وزارت میں اپنی بیٹی کا عقد بابا صاحبؒ کے ساتھ کر دیا تھا تو اس وقت یہ بات ذہن میں ہونی چاہیئے کہ جب ناصر الدین محمود نے بلبن کو قلمدانِ وزارت سونپا تو اس وقت بابا صاحبؒ کی عمر ۷۰ سال اور بلبن کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس طرح بلبن کی بیٹی اگر وہ بابا صاحبؒ سے منسوب ہوتی تو اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس برس ہونی چاہیئے تھی، بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کی عمروں میں اس قدر تفاوت کے پیشِ نظر یہ رشتہ طے ہونا ناممکن سا تھا۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ بلبن کے عہدۂ وزارت پر متمکن ہونے سے پہلے اس کی ایک بیٹی ناصر الدین محمود کے عقد میں تھی اور اس کی اگر کوئی دوسری بیٹی ہوتی تو وہ اور بھی کم سن ہوتی، اس طرح میرے خیال میں ایسا رشتہ ہونا ناممکن تھا۔

۲۔ کتب تواریخ میں سلطان بلبن کی اولاد کے ضمن میں فقط سلطان محمد،

---

[۳۳] سیر الاولیاء، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۹۱

بغرا خان اور ایک بیٹی کا ذکر ملتا ہے جو ناصر الدین محمود کے حرم میں تھی۔ ان تینوں بچوں کے علاوہ اور کسی بچے کا نام کسی کتاب میں پڑھنے میں نہیں آیا، ویسے بھی بلبن موجودہ اصطلاح میں "خاندانی منصوبہ بندی" کا بڑا حامی تھا۔ سلطان بلبن کے فرزند شہزادہ بغرا خان نے ایک موقعہ پر اپنے بیٹے کیقباد کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا۔

"پدر ما سلطان بلبن کہ در تجارب ملکی و خانی و بادشاہی پیر شدہ بود بارہا بگفتی کہ من می تواہم کہ از زنان و کنیزکان پسران و دختران بسیار بزایم ولیکن از بزرگانِ دین و دولت شنیدہ ام کہ بادشاہ را پسران و دختران بسیار نشاید چہ اگر ملک بدست یک پسر افتد ہمان پسر برادران و برادرزادگان را شریک ملک خود داند یا بر ہمہ را بکشد و یا در اقلیم ہای دُور دست جلا کند ایمن نشود، و دامادان بادشاہ را از جہت دختران بادشاہ بوی بادشاہی در دماغ افتد و ہمان بوی ایشان را زندہ بودن نگذارد"[۳۴]

ہمارے والد سلطان بلبن جو ملک، خان اور بادشاہ کی حیثیت سے تجربے کرتے کرتے بوڑھے ہو گئے تھے، اکثر کہا کرتے تھے کہ میری یہ بڑی خواہش تھی کہ میری بیویوں اور کنیزوں سے میرے بہت سے بیٹے اور بیٹیاں ہوتے لیکن یہ خواہش اس لئے پوری نہ ہوئی کہ میں نے بزرگان دین اور اکابر سلطنت کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ بادشاہ کے زیادہ بیٹے اور بیٹیاں نہیں ہونے چاہئیں۔ وہ اس لئے کہ جب اُس کا ملک کسی بیٹے کے قبضے میں آئے گا تو وہ اپنے دوسرے بھائیوں اور بھتیجوں کو اپنی سلطنت میں شریک سمجھے گا۔ اس صورت میں یا تو وہ ان سب کو قتل کر ڈالے گا یا انہیں جلاوطن کر کے دور دراز علاقوں میں بھیج دے گا۔

بہر صورت وہ غیر محفوظ ہوں گے اسی طرح بادشاہ کے دامادوں کے ذہنوں میں بھی، بادشاہ کی بیٹیوں کے ساتھ تعلق کی بنا پر۔ بادشاہی کی بو سما جائے گی۔ اور یہی بو انہیں زندہ نہ رہنے دے گی۔

---

[۳۴] برنی، تاریخ فیروز شاہی، جلد اول، علیگڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۱۴۲

سطور بالا کی روشنی میں یہ بات یقینی کہی جا سکتی ہے کہ سلطان بلبن کی ایک بیٹی کے علاوہ، جو ناصر الدین محمود کے حرم میں تھی، دوسری کوئی بیٹی نہ تھی۔

۳۔ سلطان بلبن کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد اپنے والد کی زندگی میں ملتان کا گورنر تھا اور اس کے تعلقات خاندان شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ساتھ بڑے خوشگوار تھے، اگر اس کی بہن اجودھن میں ہوتی تو اس کے تعلقات خاندانِ فرید کے ساتھ کہیں زیادہ خوشگوار ہوتے اور وہ ملتان سے اپنی بہن یا اس کی اولاد سے ملاقات کے لئے اکثر اجودھن آیا کرتا۔ کسی تذکرہ نویس یا مؤرخ نے اس کے سفرِ اجودھن کا ذکر نہیں کیا درانحالیکہ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی جیسے مؤرخ اور تذکرہ نویس اس کے درباری تھے۔

۴۔ بابا صاحبؒ کا امراء اور سلاطین کی طرف جو رویہ تھا وہ اس نصیحت سے عیاں ہے کہ جو انھوں نے سیدی مولہ کو کی تھی، آپ فرماتے ہیں:۔

"اے سیدی تو در دہلی میروی و می خواہی دری بکشائی و بازنام پیدا آری، تو دانی ہرچہ دران صلاح و صواب خود بینی ہم چنان بکنی، اما یک وصیت از من نگہداری، باید کہ با ملوک و امراء اختلاط نہ کنی و آمد و شد ایشان را در خانقاہ خویش از مہلکات تصور کنی کہ ہر درویشی کہ در اختلاط با ملوک و امراء بکشاید عاقبت او وخیم گردد"[35]

سیدی تم دہلی جا رہے ہو اور چاہتے ہو کہ وہاں دروازہ کھولو اور نام پیدا کرو۔ جو چیز اپنے حق میں درست و بہتر سمجھتے ہو اس کو تم جانو اپنے صوابدید کے مطابق ہی کر لینا لیکن میری ایک وصیت کا خیال رکھنا اور وہ یہ ہے کہ ملوک و امرا کے ساتھ اختلاط نہ رکھنا اور اپنے گھر میں ان کی آمد و رفت کو مہلکات میں سے تصور کرنا۔ جو درویش ملوک و امرا سے اختلاط کا دروازہ کھولتا ہے اس کا انجام خراب ہوتا ہے۔

(ترجمہ بشکریہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

---

[35] برنی: تاریخ فیروز شاہی، جلد دوم، مطبوعہ علیگڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۳۰

سطور بالا کی روشنی میں بابا صاحبؒ اور بنتِ بلبن کا رشتہ ایک مفروضہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

۵۔ بابا صاحبؒ لوگوں کو امراء و سلاطین کے پاس جانے سے روکتے تھے اگر سلطان بلبن کی کوئی بیٹی ان کے حرم میں ہوتی تو آپ لوگوں کو اس طرح کی نصیحت نہیں کر سکتے تھے، بصورت دیگر آپ کی مثال اس شخص جیسی ہوتی جو مسروقہ مرغی بغل میں دبا کر لوگوں کو دیانتداری اور راستبازی کی تلقین کرتا پھرے۔[36]

۶۔ بابا صاحبؒ کا سلاطین اور امراء کی طرف جو رویہ تھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ سلاطین و امراء تو رہے ایک طرف، بابا صاحبؒ عوام سے بھی بھاگتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ آپ ہانسی کی سکونت ترک کر کے اجودھن چلے گئے جہاں کے باشندے "درویش آزار اور درشت خو" مشہور تھے[37] ان حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ بابا صاحبؒ بلبن کی بیٹی کے ساتھ عقد کرتے۔

۷۔ بابا صاحبؒ کی زندگی اتنی درویشانہ تھی اور آپ اس حد تک قانع تھے کہ آپ نے کریہ کے پھل (ڈیلے: ٹینٹ) اور پیلو پہ مدتوں گذارہ کیا بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ روزہ افطار کرنے کے لئے آپ کے توشہ خانہ سے چٹکی بھر نمک بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ جب آپ نے رحلت فرمائی تو آپ کے

---

[36] خلیق احمد نظامی، دی لائف اینڈ ٹائمز آف شیخ فرید الدین گنجشکر، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۳،

[37] امیر خورد، سیر الاولیاء، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ، ص ۶۴،

جنازہ پر ڈالنے کے لئے گھر سے چادر بھی نہ مل سکی اور امیر خورد کی دادی نے ایک چادر اس مقصد کے لئے پیش کی، جب لحد کا منہ بند کرنے کا وقت آیا تو کچی اینٹیں بھی میسر نہ آسکیں اور خانقاہ کے کسی حجرہ کا در، جو کچی اینٹوں سے بند کیا ہوا تھا، اُکھاڑ کر کام چلایا گیا۔ ایسے درویش کو جس کے زہد کا یہ عالم ہو اور جس کے گھر میں کئی کئی دن کا فاقہ ہو اور وہ عالمِ اضطراب میں سنگریزے منہ میں ڈال لے، جس کے متعلق محمد غوثی مندوی یہ لکھنے پر مجبور ہو کہ۔ "ہند کے تمام مشائخ متفق اللفظ ہیں کہ ریاضت اور پرورشِ روح میں گنج شکرؒ کی مانند کوئی درویش پیدا نہیں ہوا" اُسے بلبن جیسا قیصر صفت اور کسریٰ مزاج بادشاہ اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے تو رہا۔

۸۔ بلبن ذات پات کا بڑا قائل تھا اور نیچ ذات کے لوگوں کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"من خود را از آلِ افراسیاب و از فرزندان افراسیاب از آن می دانم کہ باری تعالیٰ در من خاصیتی آفریدہ است کہ ہیچ کم اصل و دون و سفلہ و رذالہ را در شغل و منصب دولت نتوانم دید، و بہ مجرد آن کہ این طائفہ در نظرِ من در آیند جملہ رگہائی اعضائے من در جنبش در آید، و چون حال برین جملہ باشد کہ با شما گفتم من نتوانم کہ لئیم و کم اصل و ناکس زادہ را در صدر دولتی، کہ من از خدا یافتہ ام، شریک کنم و شغل و اقطاع و تصرف دہم۔"[۳۸]

میں افراسیاب کی اولاد ہوں اور میرے آباؤ اجداد کا شجرہ نسب افراسیاب سے جا ملتا ہے میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے میری فطرت ایسی بنائی ہے کہ میں کسی کم اصل، کمینے یا نیچ ذات کے فرد کو کسی سرکاری منصب پر نہیں دیکھ سکتا۔ جونہی ان میں سے کوئی شخص میرے سامنے آتا ہے میری ایک ایک رگ پھڑکنے لگتی ہے۔ جب میری یہ حالت ہو جو میں تمہارے سامنے بیان کر رہا ہوں تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا کہ میں اس دولت میں جو خدا نے مجھے عطا کی ہے کسی کمینے، نیچ ذات کے فرد یا حرام زادے کو شریک کروں اور اسے سرکاری ملازمت یا جاگیر بخشوں۔

۹۔ بابا صاحبؒ اور بلبن کے نظریات میں بُعد المشرقین تھا اس لئے یہ کسی صورت بھی ممکن نہ تھا کہ ان کے درمیان اس طرح کا رشتہ قائم ہوتا۔

۱۰۔ بلبن کا اپنے مخدوم زادے اور داماد سلطان ناصر الدین محمود کے ساتھ جو سلوک تھا اس کی ایک جھلک بعض کتبِ تواریخ میں پائی جاتی ہے۔ بعض مؤرخ یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ اس نے تمام اختیارات حکومت اپنے ہاتھ میں لے لئے اور ناصر الدین محمود مجبوراً خانہ نشین ہو گیا اور اس نے وہ ریاضت اور تقویٰ اختیار کیا جو اب تک ضرب المثل ہے۔ بعض مؤرخ تو یہاں تک کہہ گئے کہ جب تمام اختیاراتِ حکومت اس نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تو تختِ حکومت حاصل کرنے کے لئے اس نے ناصر الدین محمود کو زہر دے کر مار ڈالا[۳۹] اور عوام میں "غلام خواجہ کُش" کے لقب سے مشہور ہوا، سلطان فیروز تغلق کے متعلق روایت ملتی ہے کہ وہ دہلی کے اکثر و بیشتر سلاطین کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتا تھا لیکن بلبن کو "خواجہ کُش" سمجھتے ہوئے وہ اس کے مزار پر فاتحہ نہ پڑھتا تھا۔[۴۰]

ناصر الدین محمود کا ذکر لوگ اولیائے اللہ کے زمرہ میں کرتے ہیں۔ اگر بلبن اس جیسے ولی کو مروا سکتا ہے تو بابا صاحبؒ جیسے ولی سے کب ایسی

---

[۳۸] برنی، تاریخ فیروز شاہی جلد اوّل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۴۴

[۳۹] رحلۃ ابن بطوطہ، جلد دوم، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۶۹ء، ص ۲۱

[۴۰] نور الحق، زبدۃ التواریخ، قلمی نسخہ، برٹش میوزیم لندن، نمبر ایڈیشنل ۱۰۵۸۰، ورق ۱۵ ب،

عقیدت رکھ سکتا تھا کہ اپنی بیٹی کا رشتہ ان کو دیتا۔

۱۱۔ اب رہی یہ بات کہ بلبن درویشوں سے عقیدت رکھتا تھا اور ان کے گھروں پہ جایا کرتا تھا اور اگر ان میں سے کوئی فوت ہو جاتا تو اس کے جنازہ میں شرکت کرتا اور تعزیت کے لئے اس کے لواحقین کے پاس جاتا اور ان کو نقدی اور کپڑے عطا کرتا، ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں، وہ ضرور ایسا کرتا ہو گا، لیکن یہ اس کی نیکی کی دلیل نہیں ہے۔ بڑے بڑے جابر اور فاسق بادشاہ درویشوں سے عقیدت رکھتے تھے لیکن اس عقیدت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان سے اپنی بیٹیاں بیاہ دیتے تھے، ایسے بادشاہوں کے متعلق علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ رقمطراز ہیں۔

> "معاصی پہ اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحاء کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور اُن سے وہ اپنے حق میں دعائیں کراتے ہیں، شیطان ان کو سمجھاتا ہے کہ اس سے گناہوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس خیر سے اس شر کا دفعیہ نہیں ہو سکتا"[۴۱]

مؤرخین نے بلبن کی حس درویش نوازی کا بڑے زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹا ہے وہ سطور بالا کی روشنی میں اس کی نیکی کی دلیل نہیں بن سکتی۔

۱۲۔ بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد بابا صاحبؒ کی اولاد کے ساتھ جو اس مفروضہ رشتہ کی بنا پر بلبن کے نواسے ہوتے ہیں، بلبن نے اگر کوئی سلوک کیا ہوتا تو اس کا ذکر تذکروں میں ضرور ہوتا، آخر ان میں سے سبھی تو ایسے درویش

---

[۴۱] ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ اوّل، مطبوعہ اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۰
(مولانا علی میاں نے مفقد مسالک الولاۃ والسلاطین کا حوالہ دیا ہے جو لاہور میں موجود نہیں)

صفت نہ تھے جو ہدیۂ سلطانی کو رد کر دیتے۔ بابا صاحبؒ کے ایک فرزند نظام الدینؒ تو سرکاری ملازمت کو عار نہ سمجھتے تھے کم از کم وہ تو جاگیر قبول کر لیتے۔

۱۳۔ اگر واقعی بابا صاحبؒ نے بلبن کی بیٹی سے عقد کیا تھا تو اس کا ذکر حضرت نظام الدین اولیاءؒ یا شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے کیوں نہیں کیا؟

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مستند تاریخی شواہد اور براہین کا تعلق ہے حضرت بابا صاحبؒ کے ساتھ سلطان غیاث الدین بلبن کی کسی بیٹی کی نسبت محض ایک افسانہ ہے اور حقیقت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

* * *

# فضل اللہ بن روزبہان اصفہانیؒ

## اور

## ان کا ایک نادر رسالہ

ابوالخیر فضل اللہ بن جمال الدین روزبہان[1] بن فضل اللہ[2]، الخنجی، الشیرازی، الاصفہانی، المتخلص بہ امین[3]، المشہور بہ خواجہ مولانا اصفہانی[4]، شیراز میں ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا فضل اللہ کا سال پیدائش ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔ ان کے ہم عصر اور استاد شہرۂ آفاق محدث شمس الدین محمد السخاویؒ نے ان کے سوانح حیات اپنی مشہور عالم تصنیف الضوءُ اللامع میں بڑی تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے ہیں لیکن ان کے سال پیدائش کے متعلق انھیں بھی یقین نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے ان کی ولادت ۸۶۰ - ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ - ۱۴۵۶ء کے درمیان

---

[1] فضل اللہ، تاریخ عالم آرائے امینی، مخطوطہ فاتح لائبریری استانبول، ورق ۹ الف

[2] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۶

[3] ایضاً۔ ص ۷۵، ۱۳۱، ۱۳۶، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۵۹، ۳۲۱، ۳۳۸

[4] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا۔ ص ۳۵۶۔

بتائی ہے[5]۔ عصر حاضر کے ادیب شہیر عمر رضا کحالہ کے خیال کے مطابق آپ ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء میں پیدا ہوئے[6]۔ تاریخ عالم آرائے امینی کے انگریزی ترجمہ کے دیباچے میں ایک فٹ نوٹ میں پروفیسر مینورسکی تحریر فرماتے ہیں کہ فضل اللہ ۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء میں بغداد میں وارد ہوئے اس لئے گمان غالب ہے کہ وہ اندازاً ۲۵ سال کی عمر میں اصفہان سے نکلے ہوں گے اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء کی ہونی چاہئے[7]۔ کچھ عرصہ بعد حسن اتفاق سے پروفیسر مینورسکی کو خود مولانا فضل اللہ کی تصنیف تاریخ عالم آرائے امینی سے ایک شہادت مل گئی جس سے یہ ثابت ہوا کہ مولانا ۲۵ برس کی عمر میں ۸۷۵ھ/۱۴۷۰ء میں اصفہان سے نکلے تھے اس حساب سے ۸۵۰ھ/۱۴۴۶ء مولانا کا سال پیدائش ہے[8]۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل اللہ شافعی المذہب علماء کے ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس کے افراد پشتہا پشت سے عہدہ قضا پر فائز چلے آرہے تھے۔ ہرچند فضل اللہ نے اپنے والد اور دادا کے علاوہ اپنے کسی مورثِ اعلیٰ کا ذکر نہیں کیا تاہم ان کے والد کے غیر معمولی نام روزبہان کا تعلق فسا اور خنج کے اسی نام کے ایک خاندان سے جوڑا جا سکتا ہے[9]۔ یہ فسا وہی شہر ہے جہاں کی خاک پاک سے شہرۂ آفاق صوفی اور عالم حضرت

---

[5] السخاوی، الضوء اللامع، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۴ھ، ج ۶، ص ۱۷۱

[6] عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین مطبوعہ دمشق ۱۹۵۹ء، جلد ۸، ص ۶۸۔

[7] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ تا ۱۴۹۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۷ء، ص ۲۔ [8] ایضاً ص ۱۲۷

[9] جنید شیرازی۔ شدالازار مطبوعہ تہران ۱۹۴۹ء۔ ص ۱۷۱ تا ۱۷۵

روزبہان بن ابی نصر البقلیؒ (م ۶۰۶/۱۲۱۰) پیدا ہوئے تھے۔[10] حسن فسائی نے اپنی قابل قدر تصنیف فارس نامۂ ناصری میں ایک اور عالم زین العابدین علی بن روزبہان (م ۸۰۳/۱۴۰۰) کا ذکر کیا ہے جو اپنے دور میں مولانا فضل اللہ کے آبائی وطن خُنج میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔[11]

فضل اللہ اپنی مشہور تصنیف تاریخ عالم آرائے امینی میں اپنے والد "جمال الحق والحقیقت روزبہان" کے متعلق رقم طراز ہیں کہ وہ سرداروں کے زمرہ میں داخل تھے لیکن ان پر کچھ ایسی گزری کہ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے اوقات پڑھنے لکھنے میں بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کا شمار ان علماء میں ہونے لگا جن پر سلطان یعقوب (م ۱۴۹۰ء) کی نظرِ عنایت رہتی تھی۔[12]

فضل اللہ اپنی والدہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اصفہان کے ممتاز گھرانے صاعدی کی فرد تھیں۔[13] یہ خاندان اپنی علم دوستی اور علمی سرپرستی کے لئے ایران بھر میں مشہور تھا۔ کمال اسمٰعیل اصفہانی جیسا صاحبِ کمال اور نامور شاعر اسی خاندان کے دسترخوانِ کرم کا ریزہ چین تھا اور اس نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۶ قصائد اس خاندان کے مختلف افراد کی مدح میں لکھے ہیں۔[14] فضل اللہ کا ایک ماموں جمال الدین صاعدی شیراز کے

---

[10] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۲۰۰ ب۔

[11] حسن فسائی فارس نامۂ ناصری، مطبوعہ تہران ۱۳۱۱ش جلد دوم۔ ص ۱۹۷

[12] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۸۹ الف

[13] ایضاً ورق ۶۷ الف

[14] کمال اسمٰعیل اصفہانی، دیوان، مطبوعہ بمبئی، ص ۱۲، ۱۵، ۱۷۔

قراقیونلو حاکم پیر بوداق بن جہان شاہ کے دور میں عہدۂ وزارت پر فائز تھا۔[15] فضل اللہ کا دوسرا ماموں مسعود شاہ شیراز کے حاکم جہان شاہ کا منظورِ نظر تھا جسے اس نے اپنے قبیلے کی سرداری کے علاوہ نقارہ و علم بھی عطا کیا تھا۔[16] جہان شاہ کے انتقال کے بعد مسعود شاہ ہمیں سلطان یعقوب کے دربار میں نظر آتا ہے جہاں حسبِ سابق اس کی ساکھ قائم تھی۔[17] فضل اللہ نے اپنے ایک قریبی عزیز خواجہ نظام الدین احمد صاعدی کا ذکر بھی کیا ہے جس کے دسترخوانِ کرم سے ہر روز اندازاً ایک ہزار درویشوں کو کھانا ملتا تھا۔[18] اس کا ایک دوسرا رشتہ دار قاضی عضد الاسلام صاعدی گرجی عیسائیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوا تھا۔[19]

فضل اللہ کی انہی رشتہ داریوں کے پیشِ نظر پروفیسر مینورسکی رقمطراز ہیں کہ ان پر غور کرنے سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو سُنّی عقائد کے علمبردار تھے۔[20] ایک دوسرے موقع پر موصوف نے فضل اللہ کو "سُنّی مذہب کے فاضل علمبردار" کے لقب سے بھی یاد فرمایا ہے۔[21] مولانا کے یہی عقائد ان کے مخالفین کے ذل میں کھٹکتے رہتے

---

[15] فضل اللہ، تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۶۶ الف

[16] ایضاً ورق ۶۶ الف [17] ایضاً ورق ۶۷ الف

[18] ایضاً ورق ۱۸۶ ب

[19] ایضاً ورق ۱۷۶ الف

[20] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸۔ ۱۴۹۰ ص ۲

[21] مینورسکی۔ بولیٹن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، جلد ۱۶/۲ ۱۹۵۵ء ص ۴۶۱۔

تھے اور اس کا اندازہ حسن روملو کی احسن التواریخ کے مطالعہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے مولانا کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک متعصب سنّی اور شیبانی خان کے درباری تھے اور اہلِ بیت کے ساتھ اپنی دشمنی کے لئے رسوائے عالم تھے۔[۲۲] زمانہ حال کے ادیبوں میں سے پروفیسر براؤن[۲۳] اور اسٹوری[۲۴] نے بھی مولانا فضل اللہ کو جھگڑالو اور متعصب سنّی لکھا ہے۔

اس زمانے میں شیراز کا شمار دنیائے اسلام کے گنے چنے عالمی مراکز میں ہوتا تھا اور اس دور کے بلاشبہ سب سے بڑے شافعی فاضل مولانا جلال الدین دوانیؒ وہاں درس دیا کرتے تھے۔ مولانا فضل اللہ کی یہ بڑی سعادت تھی کہ انھیں برسوں دوانی کے حلقہ درس میں بیٹھنے کا موقع ملا۔[۲۵] محدث السخاوی نے ان کے اساتذہ میں عمید الدین شیرازی کا بھی ذکر کیا ہے۔[۲۶] فضل اللہ تاریخ عالم آرائے امینی کے آغاز میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے علوم عربیہ کی تعلیم شیراز میں پائی اور سترہ برس کی عمر میں حج کی نیت سے عازم حجاز ہوئے۔[۲۷] ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بیت اللہ کے بعد وہ شیراز واپس لوٹ لئے تھے۔

زمانے کے دستور کے مطابق فضل اللہ نے نوجوانی کے عالم ہی میں سہروردیہ

---

[۲۲] حسن روملو۔ احسن التواریخ۔ مطبوعہ بڑودہ ۱۹۳۱ء ص ۱۷۴

[۲۳] براؤن، اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، مطبوعہ کیمبرج ۱۹۳۰ء، جلد چہارم، ص ۷۹-۸۰

[۲۴] اسٹوری، پرشین لٹریچر، مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء جلد اول، ص ۳۰۰

[۲۵] فضل اللہ، مہمان نامۂ بخارا، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۳۵

[۲۶] السخاوی، الضوء اللامع، مطبوعہ قاہرہ۔ ۱۳۵۴ھ جلد ششم ص ۱۷۱

[۲۷] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف

سلسلہ کے ایک بزرگ پیر جمال الدین صوفی جمالی اردستانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[۲۸] پیر جمال الدینؒ، جن کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا تھا، اپنے دور کے سربرآوردہ شعراء میں شمار ہوتے تھے۔[۲۹] ان کی کلیاتِ قلمی جس میں ۴۲ مثنویات کے علاوہ رباعیات، غزلیات اور مفردات بھی شامل ہیں، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ پروفیسر نکلسن نے پروفیسر براؤن کے مخطوطات کی فہرست میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ بہت ہی نادر منظوم شاہکار ہے"۔[۳۰] پیر جمال الدینؒ کی کلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے مرید فضل اللہ سے خاص لگاؤ تھا اور وہ اپنے خطوط میں ان کو فرزند کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ دوسروں کے نام خطوط میں بھی وہ اکثر ان کا اور ان کی ہمشیرہ کا ذکر بڑے پیار و محبت سے کیا کرتے تھے۔[۳۱]

پیر جمال الدینؒ کی بیعت کے بعد فضل اللہ نے تصوف کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی نگرانی میں منازلِ سلوک طے کر لے گئے۔ دوسرے سفرِ حجاز میں فضل اللہ نے بڑی رغبت کے ساتھ شیخ ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی عوارف المعارف کا مطالعہ کیا۔[۳۲]

---

[۲۸] ابن سکندر۔ بستان سیاحت، مطبوعہ تہران ۱۸۹۶ء ص ۳۴۸ [۲۹] (۱)، رضا قلی خان۔ ریاض العارفین، مطبوعہ تہران ۱۳۳۵ھ ص ۵۳-۵۴ (۲) پیر جمال، کلیات، قلمی نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۳-۲۳۸ ورق ۳۰۱ الف، ۳۰۵ ب [۳۰] (۱) نکلسن۔ فہرست مخطوطات براؤن کیمبرج ۱۹۳۲ء ص ۲۳۹ ب، نکلسن۔ عجب نامہ، کیمبرج ۱۹۲۲ء صفحہ ۳۶۴ تا ۳۷۰

[۳۱] پیر جمال۔ کلیات۔ ورق ۳۱۱ الف، ۳۱۲ ب [۳۲] فضل اللہ۔ تاریخ عالم آرائے امینی، ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف

۲۵ سال کی عمر میں ۸۷۵ھ – ۱۴۷۱ء میں فضل اللہ اپنی والدہ اور پیر جمال الدینؒ کو ساتھ لے کر تلاش علم میں مصر کی جانب روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں قاہرہ میں شیخ محمد الخیضریؒ (م ۹۰۴ھ/۱۴۹۹ء) کے علم و فضل کا بڑا چرچا تھا اور یہ فضل اللہ کی سعادت تھی کہ انھیں شیخ موصوف کے درس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا[۳۳]۔ ادھر فضل اللہ نے اپنی تعلیم مکمل کی ادھر ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور وہ بددل ہو کر اپنے پیر و مرشد کی معیت میں فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔

بیت المقدس پہنچتے ہی پیر جمال الدینؒ نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی تجہیز و تکفین کے بعد فضل اللہ نے مدینہ منورہ کی راہ لی[۳۴]۔

ان دنوں مدینہ منورہ میں مشہور آفاق محدث شمس الدین محمد عبدالرحمٰن السخاویؒ مسجد نبوی میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور دور دور سے تشنگانِ علم ان سے سندِ حدیث لینے آتے تھے۔ فضل اللہ نے بھی ان سے بخاری شریف کا درس لیا اور جس دن انہیں سندِ حدیث ملی اس دن انھوں نے عربی میں ایک زوردار قصیدہ اپنے استاد کی مدح میں لکھا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد جب محدث السخاوی الضوء اللامع میں اپنے شاگردِ رشید کے حالات قلم بند کرنے بیٹھے تو وہ قصیدہ ان کے پاس موجود تھا[۳۵]۔

اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں ایک اور بزرگ ابو عبداللہ محمد بن ابو الفرجؒ بھی حدیث کا درس دیا کرتے تھے، فضل اللہ نے ان کی خدمت میں رہ کر مسلم شریف کی سند حاصل کی[۳۶]۔

---

[۳۳] (i) السخاوی، الضوء اللامع، جلد چہارم۔ ص ۱۷۱ (ii) فضل اللہ نے سلوک الملوک میں ۸۸۶ھ میں اپنے قیام مصر کا ذکر کیا ہے (مخطوطہ لینن گراڈ، ورق ۴۳ الف)

[۳۴] السخاوی، الضوء اللامع، جلد چہارم ص ۱۷۱ [۳۵] و [۳۶] ایضاً۔

امام محمد بن ادریس الشافعیؒ کے مقلدین میں امام محمد غزالیؒ بلاشبہ سب سے بڑے عالم ہوئے ہیں اس لیے شافعی المذہب ہونے کی بنا پر فطرتاً فضل اللہ کا رجحان ان کی طرف تھا۔ قیام حجاز کے دوران انھیں امام غزالی کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور انھوں نے منہاج العابدین اور احیاء العلوم کا مطالعہ بڑے شوق اور انہماک سے کیا[۳۷]۔

حجاز مقدس میں تکمیل تعلیم کے بعد فضل اللہ شیراز واپس لوٹے اور یہاں آتے ہی انھوں نے "بدیع الزمان فی قصۂ حی ابن یقظان" تالیف کی۔ اسی دوران ان کا دل کسی وجہ سے "آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ" سے اُچاٹ ہوا اور انھوں نے حجاز مقدس میں جا بسنے کی ٹھان لی۔ لیکن عین آخر وقت پر حجاز کی بجائے وہ سلطان یعقوب سے ملنے کی غرض سے آذربائیجان روانہ ہوئے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ فضل اللہ کے والد جمال الدین روزبہان سلطان موصوف کے منظورِ نظر علماء میں سے تھے اس لیے بغیر کسی دشواری کے شعبان ۸۹۲ھ / اگست ۱۴۸۷ء میں کوہ سہند کے گرمائی کیمپ میں سلطان کی خدمت میں باریاب ہوئے اور اپنی کتاب بدیع الزمان اس کی خدمت میں نذر گزرانی۔ سلطان نے فضل اللہ کو اپنا کاتب بنا کر ان کی عزت افزائی کی اور شاہی روزنامچہ لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی۔ آپ نے یہ خدمت قبول کرتے ہوئے سلطان کو یقین دلایا کہ خدا کو منظور رہا تو اس روزنامچہ کے سامنے جوینی کی تاریخ جہانگشای کی آب و تاب ماند پڑ جائے گی[۳۸]۔

---

[۳۷] فضل اللہ، تاریخ عالم آرائے امینی ورق ۳۰ ب تا ۳۵ الف۔

[۳۸] ایضاً

چار سال تک مولانا فضل اللہ بحیثیتِ کاتب سلطان یعقوب کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس دوران میں متعدد بار آپ نے اہم دستاویزات تیار کیں۔ ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں سلطان اصفہان کے دورہ پر آیا تو اس نے وہاں کے سربر آوردہ لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا فضل اللہ کو بھی ان کی خدمات کے عوض خلعتِ فاخرہ اور گھوڑا عطا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ان کی تنخواہ میں بھی معقول اضافہ کیا۔[۳۹]

۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء میں سلطان یعقوب نے بیت اللہ کے لیے غلاف تیار کروایا تو فضل اللہ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اس بات کا اعلان کریں کہ جو لوگ محمل کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے جانا چاہیں ان کی مدد سرکاری خزانے سے کی جائے گی۔[۴۰] اسی سال سلطان نے اپنے بیٹے کا ختنہ کیا تو اس تقریب پر سلطان حسین بالقیرا نے اپنا سفیر تحفے تحائف اور خط دے کر سلطان یعقوب کی خدمت میں بھیجا۔ سلطان نے فضل اللہ کو حکم دیا کہ وہ اس خط کا جواب تحریر کریں۔[۴۱] اسی سال جب سلطان یعقوب نے اپنا سفیر حاکم مصر ملک الاشرف ابو النصر سیف الدین قائتبای کے دربار میں بھیجا تو اس کے ہاتھ جو خط ملک الاشرف کے نام بھیجا تو وہ بھی فضل اللہ ہی سے لکھوایا تھا۔[۴۲]

رمضان ۸۹۳ھ/اگست ۱۴۸۸ء میں سلطان یعقوب نے ایک شاہی فرمان کی رو سے اپنی قلمرو میں شراب کے استعمال پہ پابندی لگا دی اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں "لوگوں کے گھروں کو شراب کے پیالوں سے پاک

---

[۳۹] ایضاً ورق ۱۳۱ الف

[۴۰] ایضاً ورق ۱۱۶ ب

[۴۱] ایضاً ورق ۱۲۸ ب

[۴۲] ایضاً ورق ۱۱۸ الف و ب

رکھنے کے لئے" محتسب مقرر کئے۔ اس موقع پر فضل اللہ بڑی مسرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس فرمان کے ذریعے یہ قرار پایا کہ "جو شخص بھی پیالہ میں شراب انڈیلتا ہوا پکڑا جائے تو محافظان شریعت اس کے حلق میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل کر اس کی زندگی کا جام خالی کر دیں اور اگر کوئی داڑھی منڈوا کر اپنا چہرہ بے نور کرے تو اس کا سر کاٹ کر اس کی زندگی کا چراغ بے نور کر دیا جائے"۔[۴۳]

اگلے ہی سال سلطان نے "نیزۂ دین" تیز کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ احکام شریعت پر سختی کے ساتھ عمل کیا جائے اور خلفائے راشدین کے طریقے کے خلاف جو رسم و رواج پائے جاتے ہیں انھیں فوراً ختم کیا جائے۔[۴۴]

ایسے پاکیزہ ماحول میں فضل اللہ نے چار سال بسر کئے اور اس دوران میں نظام سلطنت میں بہت سی تبدیلیاں مشاہدہ کیں۔ محکمۂ عدل میں بہت سی اصلاحات کی گئیں اور شریعت کی ترویج کے لئے سلطان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ احکامِ شریعت کے نفاذ کے لئے ہر شہر اور قصبے میں محتسب اور شحنے متعین ہوئے۔ قاضی عیسیٰ نے بحیثیت وزیر اعظم ملک کے طول و عرض میں جو زرعی اصلاحات کی تھیں فضل اللہ نے بڑے قریب سے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ سلطان یعقوب اپنی رعایا کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا کرتا تھا اور لہو و لعب سے باز رہ کر حتی الوسع احکام شریعت پر عمل کیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ علما اور فضلا کا بڑا قدر دان تھا۔[۴۵]

---

[۴۳] ایضاً ورق ۱۶۶ ب۔

[۴۴] ایضاً ورق ۱۸۲ الف۔

[۴۵] مینورسکی بلیٹن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقین سٹڈیز لندن، جلد ۱۷/۳، ۱۹۵۵ء ص ۴۵۹

قاضی عیسیٰ نے نظامِ سلطنت میں جو اصلاحات کی تھیں فضل اللہ نے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ آئندہ زندگی میں جب عبید اللہ خان ازبک نے ان سے استدعا کی کہ وہ اسے ایسی کتاب تیار کر دیں جس پر عمل کر کے وہ بحیثیت حکمران نفاذِ شریعت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے تو اس وقت اپنے سابقہ مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر ان کی رائے میں پختگی آچکی تھی اور ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں پر مبنی نہ تھیں۔

سلطان یعقوب نے ۲۴ دسمبر ۱۴۹۰ء کو وفات پائی اور اس سانحہ کے بعد انتظامِ سلطنت میں بدنظمی کا دور دورہ شروع ہوا۔ ان حالات میں فضل اللہ اپنی ذمہ داریوں سے مستعفی ہو کر اصفہان چلے آئے، جہاں وہ تصنیف و تالیف میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ اسی زمانے میں شاہ اسمٰعیل صفوی آذربائیجان کے مطلع پر نمودار ہوا۔ جونہی ۲۳ دسمبر ۱۵۰۳ء کو مولانا فضل اللہ نے کاشان میں مشہور شیعی عالم علامہ حسن مطہر الحلی (م ۱۳۲۵ء) کی کتاب منہج الحق کا رد کتاب ابطال نہج الباطل و اہمال کشف العاطل کے نام سے مکمل کیا اسی روز عراقِ عجم پر شاہ کے "منحوس قبضہ" کی خبر کاشان پہنچی۔

ان حالات میں بقول فضل اللہ ہجرت کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ایران سے نکل کر کہاں سر چھپایا جائے؟ خراسان کے تیموری حکمرانوں کے شاہ اسمٰعیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اس لیے ان کے دربار میں فضل اللہ کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی سوچ و فکر کے دوران مولانا کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ماوراء النہر کا حاکم شیبانی خان کٹر سنی ہونے کی وجہ سے مولانا کا ہم مسلک اور شاہ کا سخت ترین مخالف تھا اس لیے مولانا نے اس کے دربار کی راہ لی۔ ۱۵۰۸ء میں

مولانا فضل اللہ شیبانی خان کے مصاحبوں اور اس کے دربار کے سربرآوردہ علماء کی صف میں نظر آتے ہیں۔[46]

شیبانی خان علماء و فضلا کا قدردان ہونے کے علاوہ بذاتِ خود بڑا پڑھا لکھا اور صاحبِ ذوق حکمران تھا۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قطعات آج بھی پیرس کے کتب خانہ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات وہ دیگر علمائ کی موجودگی میں مولانا فضل اللہ کے ساتھ علمی مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا۔[47] بعض اوقات خراسان اور ماوراء النہر کے علماء کی موجودگی میں خان موصوف مولانا سے ہی درخواست کیا کرتا تھا کہ وہ کسی علمی یا مذہبی مسئلہ پر گفتگو کا آغاز کریں۔[48] ایسی مجالس میں موقع پاتے ہی مولانا شیبانی خان کو شاہ اسمٰعیل کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے پر ابھارتے[49] جو ان کے خیال میں صلیبیوں سے بڑھ کر گمراہ اور بے دین تھا۔[50]

اپنی ایک غزل میں، جو شیبانی خان نے عید الفطر کی صبح لکھی تھی، وہ مولانا فضل اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایسی ہی علمی مجالس کا ذکر کرتا ہے۔[51] بعض اوقات جب خراسان اور ماوراء النہر کے علما کسی مذہبی مسئلے پر خان موصوف کو مطمئن نہ کر سکتے تھے تو وہ مولانا کو بلا کر ان سے صحیح جواب طلب کیا کرتا تھا۔[52] کبھی کبھار خان ان سے خلوت میں ملاقات کرتا

---

[46] فضل اللہ: مہمان نامۂ بخارا، مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء۔ ص ۳۲

[47] ایضاً ص ۳ تا ۳۱، ۶۱ [48] ایضاً ص ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۹

[49] ایضاً ۱۰۵، ۱۰۷ [50] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا مطبوعہ تہران ۱۹۶۲ء ص ۵۰،۴

[51] ایضاً ۱۹۷ [52] ایضاً ص ۲۳، ۲۹۶

اور ایسے مواقع پہ ان کو اپنے ساتھ کھانے میں بھی شریک کر لیتا تھا۔[53] اگر کبھی علالت کی بنا پہ مولانا دربار سے غیر حاضر ہوتے تو خان اپنے کسی مصاحب کو بھیج کر ان کی مزاج پرسی کیا کرتا تھا۔[54] ایک بار جب مولانا خان کے ساتھ قزاقوں کے خلاف مہم میں شریک ہوئے تو اثنائے سفر علیل ہو گئے۔ خان بار بار ان کی مزاج پرسی کے لئے کسی نہ کسی شخص کو ان کے پاس بھیجتا تھا۔ علاوہ ازیں خان نے اپنے ذاتی معالج مولانا نازری کو ان کے معالجے کا حکم دیا۔[55] جب مولانا صحت یاب ہو کر خان سے خواجہ احمد یسویؒ کے مزار مبارک پہ ملے تو خان اُٹھ کر ان سے گلے ملا۔[56]

قزاقوں کے خلاف مہم پہ روانہ ہونے سے قبل سلطان نے علماءؒ سے مشورہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ قزاقوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کریں۔ علماء نے بشمول مولانا فضل اللہ فتویٰ جہاد پر اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔[57]

ایک بار خان موصوف نے اپنے بیٹے تیمور سلطان کو حکم دیا کہ وہ تمام قضاۃ اور صوبہ داروں کے نام یہ فرمان جاری کرے کہ آئندہ سے یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے حصہ دیا جائے۔ اس موقع پہ مولانا فضل اللہ میدانِ عمل میں کودے اور اُنھوں نے حدیث اور فقہ کے دلائل سے خان کو قائل کر کے وہ حکم واپس لینے پر مجبور کر دیا۔[58]

ایک بار خان نے جمعہ کے روز آپ کو حکم دیا کہ اس کی موجودگی میں وہ

---

[53] ایضاً ص ۱۳۳
[54] ایضاً ص ۹۳
[55] ایضاً ص ۱۳۹-۱۴۰
[56] ایضاً ۲۵۹
[57] ایضاً ص ۴۳
[58] ایضاً ص ۲۶، ۲۸

خطبۂ جمعہ ارشاد فرمائیں۔ مولانا نے اپنے خطبہ میں خان کو بحیثیت حکمران اپنے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے اُسے حضرت عمرؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کا مشورہ دیا۔[59] ایک دوسرے موقع پہ خان نے آپ کو ایک انکوائری کمیشن کا صدر بنا کر اساتذہ اور طلبہ کے معاملات میں تحقیق کرنے کا حکم دیا۔ آپ کی سفارش پہ خان نے اساتذہ کا مشاہرہ بڑھاتے ہوئے طلبہ کے لئے وظائف جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔[60]

عام طور پہ مولانا فضل اللہ جامع مسجد سمرقند، مدرسہ شیبانی خان اور موضع خرتنگ میں امام بخاریؒ کے مزار پہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور ان کے اپنے الفاظ میں دُور دُور سے ہزاروں طلبہ ان سے حدیث کا درس لینے آیا کرتے تھے۔[61] جب کبھی مولانا شیبانی خان کے ساتھ سفر پہ جاتے تو طلبہ کا جمِ غفیر ان کے ہم رکاب رہتا اور اثنائے سفر بھی وہ درس حدیث جاری رکھتے۔[62] دیکھتے ہی دیکھتے مولانا کے شاگرد ماوراء النہر اور ترکستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور اُنھوں نے ہر جگہ حدیث اور دوسرے علوم شریعت کا درس جاری کیا۔[63] تذکرۂ حسن نثاری کے مصنف کے قول کے مطابق ماوراء النہر کے اکثر و بیشتر علماء نے مولانا فضل اللہ کے حضور میں زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔[64] خود عبید اللہ خان ازبک والئ بخارا نے حصن حصین مولانا سے پڑھی تھی، اور دوران تدریس وہ ہمیشہ خان موصوف کو قزلباشوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دیا کرتے تھے۔[65]

---

[59] ایضاً ص ۳۳ [60] ایضاً ص ۳۰۶ [61] ایضاً ص ۷۹ [62] ایضاً ص ۲۵۴، ۲۵۵، ۳۴۲
[63] ایضاً ص ۲۶۰، ۲۶۶ [64] مینورسکی۔ پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸۔ ۱۴۹۰ مطبوعہ لندن ۱۹۵۷ء ص ۴۴ پر وفیسر مینورسکی نے تذکرہ حسن نثاری کے روسی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے۔ بدقسمتی سے یہ کتاب میری دسترس سے باہر ہے۔ [65] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا، ص ۵۶

وسط ایشیا کے بے شمار علماء نے مولانا فضل اللہؒ سے روایت حدیث کی اجازت لی[66] علاوہ ازیں خود ان کے الفاظ میں حجاز، مصر، شام، آذربائیجان، دیار بکر، عراق، فارس، خراسان، ماوراء النہر اور ترکستان کے بیشمار لوگوں نے ان سے قصیدہ بردہ پڑھنے کی اجازت لی اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی شمار سے باہر تھی جنھوں نے قصیدہ بردہ کے متن کو مولانا کے متن سے ملاکر صحیح کیا[67]۔

ماوراء النہر کے قیام کے دوران مولانا نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کے عالم ہی تسلیم کئے جاتے تھے بلکہ عوام ان کو ایک خدارسیدہ درویش بھی سمجھتے تھے[68]۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق نقشبندیہ سلسلہ کے شہرۂ آفاق بزرگ خواجہ ناصر الدین عبید احرارؒ کے مرید بھی ان کی خدمت میں کسب فیض کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے[69]۔

١٥٠٩ء میں فضل اللہؒ نے شیبانی خاں کی معیت میں مشہدِ مقدس میں امام علی رضاؑ کے مزار کی زیارت کی اور زیارت سے فارغ ہوتے ہی خان موصوف سے رخصت لے کر آپ امام غزالیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے طوس روانہ ہوگئے[70]۔ طوس میں چند روز قیام کے بعد آپ ہرات چلے گئے۔

---

[66] ایضاً ص ٣٥٦ [67] فضل اللہ۔ شرح قصیدۂ بردہ، مخطوطہ ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری نمبر ١٠٥، ورق ٢١ الف، ٣٢٦ ب۔

[68] مینورسکی۔ پرشیا ان اے ڈی ١٤٧٨ — ١٤٩٠، ص ٤ (پروفیسر مینورسکی نے تذکرہ حسن نثاری کا حوالہ دیا ہے)

[69] فضل اللہ۔ مہمان نامۂ بخارا، ص ٥١ [70] ایضاً ص ٣٣٩

جب ٢٣ رجمادی الاوّل ٩١٥ھ / ١٥٠٩ء میں آپ نے مہمان نامۂ بخارا مکمل کی تو آپ ہرات میں ہی قیام پذیر تھے[71]

فضل اللہ نے آٹھ برس شیبانی خاں کے دربار میں بسر کئے۔ مہمان نامہ بخارا کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ دور ان کی زندگی کا بہترین دور تھا۔ بدقسمتی سے ٢ دسمبر ١٥١٠ء کو شیبانی خاں نے مرو کے مقام پر اسمٰعیل صفوی سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا[72]۔ اور اس کی شہادت کے بعد اسمٰعیل کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے ازبک ترکستان کی طرف چلے گئے۔

اسی اثنا میں بابر نے اسمٰعیل کی بھیجی ہوئی فوج کی مدد سے ماوراء النہر پر قبضہ کرکے سمرقند کو اپنا پایۂ تخت بنایا[73]۔ بابر نے اسمٰعیل کے ساتھ اپنے وعدہ کے مطابق شیعہ علماء کو اپنے عقائد کی تبلیغ کے لئے خاص مراعات دیں اور اس کے علاوہ اپنے سکوں پر ائمہ اثنیٰ عشر کے نام منقوش کروائے[74]۔ ماوراء النہر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی مساجد میں ایک شیعہ حکمران یعنی شاہ اسمٰعیل صفوی کا نام خطبہ میں پڑھا گیا[75]۔ فضل اللہ ان دنوں سمرقند میں قیام پذیر تھا بلکہ بقول اس کے وہ "ملحدوں"[76] میں رہنے پر مجبور تھا۔ یہ زمانہ بلاشبہ

---

[71] ایضاً ص ٣٥٦ [72] غلام سرور۔ ہسٹری آف شاہ اسمٰعیل صفوی، مطبوعہ علی گڑھ ١٩٣٦ء، ص ١١٢

[73] اسکندر منشی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی، مطبوعہ تہران ١٣١٤ھ شمسی جلد اول، ص ٣٠

[74] لین پول۔ کیٹلاگ آف اورینٹل کوئنز ان دی برٹش میوزیم، مطبوعہ لندن ١٨٩٠ء، جلد پنجم، ص ١٩٣

[75] اسکندر منشی۔ تاریخ عالم آرائے عباسی، جلد اول، ص ٣٠۔

[76] فضل اللہ۔ سلوک الملوک، مخطوطہ لینن گراڈ، ورق ٧ ب۔

فضل اللہ کی زندگی کا بدترین دور تھا۔

دو سال بعد ۱۵۱۲ء میں فضل اللہ کے شاگردِ رشید عبید اللہ خان ازبک نے بابر کے حلیف اور ایرانی سپاہ کے قائد نجم ثانی کو غجدوان کے مقام پر شکست دے کر قتل کر ڈالا اور بابر سے دو دو ہاتھ کرنے کے ارادہ سے سمرقند کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں وہ یسی کے مقام پر حضرت خواجہ احمد یسویؒ کے مزار پر دعا کے لئے حاضر ہوا اور وہیں اس نے خواجہ کو گواہ بنا کر خدا سے یہ وعدہ کیا کہ اگر اسے بابر پر فتح ہوئی تو وہ شریعت کے مطابق حکومت کرے گا۔ بابر بقول فضل اللہ نوے ہزار اور بقول حیدر دوغلات چالیس ہزار سپاہ کے ساتھ عبید اللہ کے مقابلہ کے لئے سمرقند سے نکلا۔ کولِ ملک کے مقام پر دونوں میں مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں بابر کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ بمشکل اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانیں بچا کر سمرقند سے کابل کی جانب فرار ہوا۔ خدا تعالیٰ نے فضل اللہؒ کی "دعا سن لی" اور اسے "ملحدوں" کے چنگل سے نجات ملی۔[۴۷] عبید اللہ نے ماوراء النہر پر قابض ہوتے ہی فضل اللہ کو بخارا آنے کی دعوت دی اور اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے ان کی خدمت میں ایک ایسی کتاب لکھنے کی درخواست پیش کی جس میں حکومت کے ہر شعبہ کے متعلق شریعت کے احکام موجود ہوں۔ دو سال کی محنت کے بعد ۱۵۱۴ء/۹۲۰ھ میں آپ نے "سلوک الملوک" اس کی خدمت میں پیش کی۔ حسنِ اتفاق سے اس کتاب کا اصل مسودہ بخارا میں ایک روسی مستشرق اے زیڈ، والی دو کے ہاتھ لگا[۴۸] اور اس نے

---

[۴۷] ایضاً ص ۱۱ ب، ۱۲ الف

[۴۸] مینورسکی، پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸ - ۱۴۹۰ ص ۸

اسے لینن گراڈ کے عجائب گھر موزے الیشیاٹیک کو دے دیا۔ پروفیسر مینورسکی کی سعی و کاوش سے اس کی مائیکروفلم مجھے مل گئی اور میں نے کیمبرج میں قیام کے دوران اس کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔

سلوک الملوک کی تصنیف کے بعد بھی فضل اللہ بے کار نہ بیٹھے بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے۔ ۱۵۱۵ء/۹۲۱ھ میں انھوں نے قصیدۂ بردہ کی شرح لکھی اور اصل قصیدہ کا فارسی میں منظوم ترجمہ بھی کر ڈالا۔[۴۹]

فضل اللہ نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال بخارا میں اپنے سرپرست اور قدردان عبید اللہ خان کے دربار میں گزارے اور حسن روملو کی روایت کے مطابق وہیں ۷۷ سال کی عمر میں ۵ جمادی الاول ۹۲۷ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۵۲۱ء کو وفات پائی۔

## فضل اللہ کے آثار

۱۔ بدیع الزمان فی قصۂ حی ابن یقظان: فضل اللہ کی اولین تالیف ہے جسے انھوں نے ۸۹۲ھ/۱۴۸۷ء سے قبل مکمل کر کے سلطان یعقوب کے نام منسوب کیا۔ بدقسمتی سے اس کتاب کا سراغ دنیا کے کسی بھی کتب خانے میں نہیں ملتا۔

۲۔ مہمان نامہ بخارا کو فضل اللہ کی ذاتی ڈائری کہا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے بخارا، سمرقند، مشہد اور مرو میں منعقد ہونے والے "مباحث دینی"

---

[۴۹] فضل اللہ، شرح قصیدہ بردہ، مخطوطہ ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری نمبر ۱۰۵

[۵۰] حسن روملو، احسن التواریخ، مطبوعہ بڑودہ ۱۹۳۱ء ص ۱۷۴

کی تفصیلات دی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے شیبانی خاں کی قزاقوں کے خلاف مہم کا بھی بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مولانا اس کا نام سفرنامہ بخارا رکھنا چاہتے تھے لیکن شیبانی خان کے اصرار پر اسے مہمان نامہ بخارا کا نام دیا۔ یہ کتاب تہران سے سنہ ۱۹۶۲ء میں دکتر منوچہر ستودہ کی سعی و ترتیب سے شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ کتاب ابطال نہج الباطل و اہمال کشف العاطل مولانا کی عربی زبان میں ایک اہم تالیف ہے اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ کتاب انھوں نے مشہور شیعی عالم علامہ حسن مطہر الحلی کی منہج الحق کے رد میں لکھی تھی۔ جس دن یہ کتاب مکمل ہوئی تھی اسی دن شاہ اسمٰعیل صفوی کے عراقِ عجم پر قبضہ کی خبر فاضل مصنف کو ملی۔ اس کتاب کا بھی کوئی نسخہ تاحال دستیاب نہیں ہو سکا۔

۴۔ تاریخ عالم آرائے امینی مولانا فضل اللہ کی بہت ہی اہم تالیف ہے جس میں انھوں نے سلطان یعقوب کے عہد کے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب کے دو قلمی نسخے ہمارے علم میں ہیں۔

ا۔ مخطوطہ نمبر ۴۴۳۱۔ فاتح لائبریری استانبول (۲۲۵ اوراق)

اا۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۱۔ ببلیوتھیک نیشنل، پیرس، (۲۰۷ اوراق)

اس کتاب کے چیدہ چیدہ صفحات کا انگریزی ترجمہ لندن سے سنہ ۱۹۵۷ء میں پروفیسر منورسکی آنجہانی نے "پرشیا ان اے۔ ڈی ۱۴۷۸-۱۴۹۰" کے نام سے شائع کیا۔

۵۔ سلوک الملوک بلاشبہ مولانا فضل اللہ کی سب سے اہم تصنیف ہے جو انھوں نے عبید اللہ خاں کی استدعا پر لکھی تھی۔ اس کتاب کے پانچ نسخے میرے علم میں ہیں۔

ا۔ برٹش میوزیم لندن، مخطوطہ اورنٹیل نمبر ۲۵۳۔

اا۔ میوزے ایشیاٹیک لینن گراڈ کا نسخہ مولانا فضل اللہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

ااا۔ جامعہ نظامیہ حیدر آباد کا نسخہ

ا۷۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا نسخہ

۷۔ آصفیہ لائبریری حیدر آباد کا نسخہ۔

حال ہی میں ڈاکٹر نظام الدین صاحب مرحوم نے دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے یہ کتاب شائع کر دی ہے لیکن ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر آربری آنجہانی کے توسط سے صرف ایک صفحہ بطور نمونہ مجھے بھیجا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ٹائپ میں بڑی نفاست کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

۶۔ شرحِ قصیدۂ بُردہ یہ کتاب مولانا نے سنہ ۹۲۱/۱۵۱۵ء میں بخارا میں قلمبند کی تھی اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے مولانا اپنے دور میں قصیدۂ بردہ پر آخری سند سمجھے جاتے تھے اور دور دراز کے علاقوں سے سینکڑوں کی تعداد میں مشتاقین ان سے قصیدہ کا ورد کرنے کی اجازت لینے آیا کرتے تھے۔ اس کتاب کے تین مخطوطے ہمارے علم میں ہیں۔

ا۔ مخطوطہ نمبر ۳۴۳۱، نور عثمانیہ لائبریری، استانبول۔

اا۔ مخطوطہ نمبر ۹۸۹، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ،

ااا۔ مخطوطہ نمبر ۱۰۵، ایڈنبرا یونیورسٹی لائبریری، ایڈنبرا، سکاٹ لینڈ،

آخری نسخہ کے ۱۱۳ اوراق ہیں جس سے اس کی ضخامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۷۔ رسالۂ حارثیہ۔ یہ رسالہ مولانا فضل اللہ نے حدیثِ حارث

کی تشریح میں لکھا تھا۔ اس کا کوئی نسخہ ہمارے علم میں نہیں۔ مہمان نامۂ بخارا میں اس کا حوالہ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ۹۱۵ھ/۱۵۰۹ء سے قبل تحریر کیا تھا۔

۸۔ رسالہ در حقیقت والواع حدیث قدسی مولانا فضل اللہ کے ۴ ورق کے اس مختصر سے رسالہ کا واحد نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہے جس میں انھوں نے حدیث قدسی کی اقسام ایک عزیز کے استفسار پر ذرا تفصیل سے لکھی تھیں۔ یہ رسالہ ۲۴ ذی قعدہ ۹۲۲ کو "مقبہ کو میبنہ من سعد سمرقند" میں در طر تحریر میں آیا۔

۹۔ مولانا فضل اللہ نے شیخ علی بن عیسٰی الاربلی کی مشہور تالیف "کتاب کشف الغمہ" کا ایک خلاصہ تیار کیا اور پھر اس کی شرح لکھی بدقسمتی سے یہ کتاب بھی اب مفقود ہو چکی ہے۔

ان کتب ورسائل کے علاوہ ان کا ایک فارسی اور ایک ترکی قصیدہ منشآت السلاطین میں محفوظ ہے، ان قصائد میں اُنھوں نے سلطان سلیم عثمانی سے استدعا کی ہے کہ جس طرح سکندر نے ایران پر حملہ کر کے دارا کو شکست دی تھی اسی طرح آپ بھی ایران پر حملہ کر کے شاہ اسمٰعیل صفوی کو شکست دیں۔ مولانا کی یہ آرزو ان کی زندگی ہی میں پوری ہو گئی اور سلطان سلیم نے چالدران کی جنگ میں شاہ اسمٰعیل کو شکست فاش دے کر اس کے پایۂ تخت تبریز پر قبضہ کر لیا۔

مولانا کی کتابوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مندرجہ بالا کتب کے علاوہ اور کتابیں بھی تحریر کی تھیں۔ جو زمانہ کی دست برد سے ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

---

۱۔ مناقب پیر جمال اردستانیؒ
۲۔ شرح صحیح المسلم
۳۔ شرح وصایائے خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ
۴۔ حاشیہ بر حواشی شرح جدید
۵۔ حاشیہ بر تفسیر کشاف
۶۔ رسالہ مقاصد
۷۔ حاشیہ بر محالات
۸۔ حلِ تجرید
۹۔ حاشیہ بر کتاب شرح مواقف۔

## رسالہ در حقیقت والواع حدیث قدسی

زیر چار ورق کا مختصر سا رسالہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے مجموعہ سبحان اللہ (۲۹۷/۹۳) میں محفوظ ہے اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے یہ واحد نسخہ ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا کے حالات کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا جائے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے۔ رسالہ کا رسم الخط نستعلیق ہے حتی کہ عربی عبارات بھی نستعلیق میں ہی لکھی ہوئی ہیں رسالہ قدرے کرم خوردہ ہے اس لئے پڑھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے:

الحمد للہ الذی نزل احسن الحدیث کتابًا فمنتھی القدسی خطاباً

والصلوٰة علی سیدنا محمد الراوی عن ربهٖ حکمةً وصواباً وعلی آله واصحابه ما انشأ الریاح سحاباً، وبعد نموده می شود که یکی از اصحاب که در زمره سادات رتبه ارجمندان داشت واز ارباب سعادات نزد ما مرتبه فرزندان داشت[1]۔ التماس نموده که حقیقتِ حدیث قدسی جهتِ او بیان کرده شود وبعضی ازان با ترجمه در طی بیان حقیقتِ او آورده شود بر حسب التماس آن فرزندِ اعز ارجمند این ورقه مکتوب گشت۔ امید که فوائد آن مسلمانان را شامل گردد و ما را ثواب تبلیغ علم حاصل گردد ان شاء الله تعالی والتوفیق منه فی کل باب۔

بدان ایدک الله تعالی که حدیث قدسی حدیثی است که حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم آنرا روایت فرموده باشد از پروردگارِ خود بصیغه که دلالت کند بر آنکه آن فرموده حق تعالی است وحرف متعلق بلفظ آن نباشد و مراد از عدم تعلق حرف بلفظ آنست که لفظ آنرا جنب وحائض تواند خواند و بی طهارت مساسِ آن توان کرد وبدین قید ممتاز می گردد از قرآن وفرق میان او وقرآن از چند وجه است، اول آنکه حدیث قدسی مروی پیغامبر است از حضرت حق تعالی وقرآن منزل بوحی است۔ دوم آنکه قرآن لابد است که منزل بر آنحضرت صلی الله علیه وسلم بواسطه جبریل باشد ودر حدیثِ قدسی این لازم نیست۔ سیوم آنکه لفظ حدیث قدسی لازم نیست که بر حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم از جانب حق تعالی وارد شده باشد بلکه معنی آن ملقی به آنحضرت صلی الله علیه وسلم شده و لفظ می تواند بود که

از ان پیغامبر باشد صلی الله علیه وسلم، و چون این مقدمه معلوم شد باید دانست که حدیث قدسی هر چند نوع است۔ نوع اوّل آنکه در شب معراج بعد از قطع سموات وعبور از سدرة المنتهیٰ چون بشرف لقای حضرت جل وعلا مشرف گشت حق تعالی با آنحضرت صلی الله علیه وسلم مکالمه فرمود وآن کلام را آنحضرت صلی الله علیه وسلم با امت خود روایت کرد ودر عدد آن اختلاف کرده اند، بعضی گویند که او سه قسم بود، یک قسم آنکه حضرت حق تعالی امر فرمود که آنرا به بندگان برسانند، وقسم دوم آنکه امر فرمود که آنرا پوشیده دارد از بندگان زیرا که منفعت آن خاصه آنحضرت بود صلی الله علیه وسلم و دیگر امتان آنرا نمی فهمیدند پس از ایشان پوشیده بایست داشتن، قسم سیوم آنکه آنحضرت صلی الله علیه وسلم مرخص بود که اگر خواهد رساند واگر نخواهد نرساند، بعضی گویند سی هزار حدیث بود واز آنجمله کتابیست که آنرا احمدیات گویند ودر آنجا بسیاری از احادیث است یا احمد محبتی محبة الفقرأ اقرب مجلسهم منک ادنک یعنی ای احمد دوستی من دوستی فقرا است پس نزدیک گردان مجلس ایشان را که بخود که نزدیک کردم من بتو، اما علمای حدیث را در صحت احادیث احمدیات سخن است وتعیین عدد آن احادیث در صحیح وارد نشده واز جمله، احادیث قدسیه که در صحیح وارد نشده که در شب معراج در مکالمه حق با آنحضرت بوده این حدیث است، هی خمسٌ وهی خمسون لا یبدّل القول لدیّ یعنی این نمازها که بر بندگان فرض گردانیدم پنج نماز است وثواب پنجاه نماز دارد وتبدیل کرده نمی شود قول نزد من، یعنی سخن من وامر من تبدیل نمی باید۔ ونیز این حدیث دیگر است، امضیت فریضتی وخففت عن عبادی یعنی فریضه خود را

---

[1] مراد باین سیدی که رتبه ارجمندان دارد میر سلطان محمود مشهور به میرک سید غیاث است

امضاء کردم و از بندگان خود تخفیف نمودم، و این هر دو حدیث در شبِ معراج
وارد شده بعد از آنکه نماز پنجاه وقت مقرر شده بود باشارهٔ موسیٰ درخواست آن
حضرت علیها الصلوٰة والسلام از پنجاه به پنج مقرر شده، حق تعالیٰ این دو حدیث
به آنحضرت فرموده و نیز در احادیث قدسیه شب معراج وارد شده۔ یا محمد
انهن خمس صلوٰة کل یوم ولیلة لکل عشر فذلک خمسون
صلوٰة من هم بحسنة فلم یعملها کتبت له حسنة فان عملها
کتبت له عشرا ومن هم بسیئة فلم یعملها لم یکتب له شیئ
وان عملها کتبت له سیئة واحدة۔ یعنی ای محمد این نمازهای
فرض کرده شده بر تو پنج نماز است در شبانروزی مر هر نمازی را ثواب
ده نماز است پس پنجاه نماز باشد، هر که قصد نیکو کند و آنرا بعمل نیاورد از برای
او ثواب یک حسنه نویسند، پس اگر بعمل درآورد او را ثواب ده حسنه نویسند،
و هر که قصد کار بدی کند و بعمل نیاورد و هیچ چیز بر و ننویسند۔ و اگر بعمل آورد
از برای او یک گناه نویسند۔ نوع دوم از حدیث قدسی آنست که معنیٔ آن را حق
تعالیٰ در دل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم می افگند و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
بعبارتِ خود آنرا بیان می فرماید، و از صحاح آن احادیث حدیث است
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما یرویه عن ربه اعددت
لعبادی الصالحین[1] مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر
علی قلب بشر۔ یعنی مهیا گردانیده ام از برای بندگان صالح خود آن چیزی
که ندید چشمی و نه گوشی شنید و نگذشت بر دل آدمی مراد آنکه ثواب بندگان

---

[1] مراد از صالحان عارفان اسرار باطنی و مراد از مالاعین رأت رازهای درونی ایشان است که عنایت
الٰهی باعطایش خاص گردانده۔

صالحان بسیار عظیم است که مثلِ آن کس ندیده و نشنیده و بر دل کسی نگذشته
و دیگر این حدیث است که در صحیح مسلم از ابوذر روایت کرده قال اللہ تعالیٰ
یا عبادی کلکم ضال الا من هدیته فاستهدونی اهدکم یا عبادی
کلکم جائع الا من اطعمته فاستطعمونی اطعمکم یا عبادی
کلکم عار الا من کسوته فاستکسونی اکسکم یا عبادی انکم تخطئون
باللیل والنهار وانا اغفر الذنوب جمیعا فاستغفرونی اغفر لکم
یا عبادی انکم لن تبلغوا ضری فتضرونی ولن تبلغوا نفعی فتنفعونی
یا عبادی لو ان اولکم وآخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی اتقی قلب
رجل واحد منکم مازاد ذلک فی ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم
وآخرکم وانسکم وجنکم کانوا علی افجر قلب رجل واحد منکم
مانقص ذلک من ملکی شیئا یا عبادی لو ان اولکم وآخرکم وانسکم
وجنکم قاموا فی صعید واحد فسألونی فاعطیت کل انسان مسألته
مانقص ذلک مما عندی الا کما ینقص المخیط اذا ادخل البحر
یا عبادی انما هی اعمالکم احصیها لکم ثم اوفیکم ایاها فمن
وجد خیرا فلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذلک فلا یلومن
الا نفسه۔ صدق یا رسول اللہ۔

ترجمه حدیث قدسی۔ ای بندگان من، همه شما گم راهید مگر آن کسی که من
راهنمایم او را، پس طلب راه راست کنید از من که من راه راست نمایم
شما را، ای بندگان من، همه شما گرسنه اید مگر آنکسی که من اطعام کنم او را،
پس طلب طعام کنید از من که اطعام نمایم شما را، ای بندگان من، همه شما
خطا می کنید در شب و روز و من می آمرزم گناهان را، همه پس طلب آمرزش

کنید از من که بیامرزم شما را ، ای بندگان من شما نمی رسید به رسانیدن گزند
بمن پس تا گزند رسانید بمن و نمی رسید به رسانیدن نفع بمن تا نفع رسانید مرا ،
ای بندگان من اگر آنکه اوّل شما و انس شما و جنّ شما باشند بر دل متقی ترین
مردی از شما زیادت نمی گرداند در ملک من چیزی را ، اِی بندگان من اگر
آنکه اوّل شما و آخر شما و انس شما و جن شما باشند بر دل فاجر ترین مردی
از شما کم نمی گرداند در ملک من چیزی را ، ای بندگان من اگر اوّل شما و
آخر شما و انس شما و جن شما بایستند در یک زمین هموار پس بخواهند هر یکی
از من آنچه مطلوب او باشد پس من بدهم هر کس را آنچه خواسته کم نگرداند
از ملک من چیزی را الّا آن قدر که کم میگرداند سوزن هرگاه که در دریا
فرو برند ، ای بندگانِ من نیست این عملهای شما که من آن را شمارم وضبط
میکنم پس ازان جزای آنرا تمام بشما می رسانم ، پس آنکسی که می یابد خیری
را باید که ستایش کند پروردگار را و آنکسی نیابد غیر آن پس باید که ملامت
نکند مگر نفس خود را ، تمام شد" وامثالِ این نوع در احادیث قدسیه
بسیار است ، نوع سیوم آنست که حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم از
جبرئیل علیه السلام روایت می کند و او از حضرت حق تعالیٰ جل وعلاٗ روایت
میکند و از آنجمله است حدیث مسلسل بروایت اهلِ بیت که در آنجا امیر المومنین
علی رضی الله عنه فرمود که حضرت پیغامبر صلی الله علیه وسلم فرمود که حضرت
جبرئیل علیه السلام فرمود که حضرت حق تعالیٰ فرمود کلمة لا اله الا
الله حصنی فمن قالها دخل فی حصنی ومن دخل فی حصنی
امن من عذابی — یعنی کلمه لا اله الا الله حصار من است پس آنکسی
که گفت آن کلمه را در آمد در حصار من و هر کس که در آمد در حصار من ایمن

گشت از عذاب من ، وامثال او در احادیث قدسیه بسیار است ، نوع
چهارم از احادیث قدسیه آنست که آنحضرت صلی الله علیه وسلم از معنی قرآن
استنباط فرموده باشد و در آخر صورت آیت را باستشهاد آورده باشد وامثله
او در احادیث بسیار است ۔ نوع پنجم از احادیث قدسیه آنست که آنحضرت
صلی الله علیه وسلم از اوامر واحکام الٰهی که نسبت با امم سابقه یا از کتب استنباط
فرموده باشد یا از مجاری اقوال سابقان در اجرای حکم تقاضای الٰهی در شان
ایشان فرا گرفته باشد و این نوع را هم امثله بسیار است ۔ نوع ششم آنکه
آنحضرت صلی الله علیه وسلم حضرت حق تعالیٰ را در واقعه دیده باشد و در رویای
صالحه که یک جزو از اجزای نبوت است حضرت حق تعالیٰ با آنحضرت صلی الله
صلی الله علیه وسلّم خطاب فرموده باشد و آنحضرت صلی الله علیه وسلّم
حکایت آن خطاب بامّت فرموده باشد و از آنجمله است حدیثی که در
بابِ کفارت وارد شده و از کتب صحاح موجود است ، این شش نوع است
حدیث قدسی که امثله و شواهد آن در احادیث بسیار واقع شده و اگر درین
محل بسط نموده مجلدی کبیر تالیف باید کرد و علی حسب فیض الوقت این چند
ورق مکتوب شد و بعضی امثله آورده گشت تا اطلاع بر انواع آن میسّر
گردد ، والتوفیق من الله الاحد ، تمت الرسالة بیمن مؤلفها
العبد فضل الله بن روزبهان المشتهر بخواجه مولانا اصفهانی
بلغه الله اقصی الامانی فی الرابع والعشرین من شهر
ذی قعده سنه اثنین وعشرین وتسعمأیه وقد کتبت
فی بعض لیلة من اللیالی والحمد لله علی نعمته الکامل
ولطفه الشامل وفضله الحاصل بقصبته کرمینه من

اعمال سعد سمرقند والحمد للّٰہ الواحد الاحد و والختم بالصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا و نبینا محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

کاتب محمد باقر بن عبد اللّٰہ الیمنی، المشتہر بامیر غرب، صفر سنہ ثمان وستین وتسعمائہ۔

# مبلغ الرجال

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خواجہ عبید اللہ المعروف بخواجۂ کلاںؒ بن خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کی ایک نادر فارسی تصنیف مبلغ الرجال کا مخطوطہ موجود ہے، جس کا فہرست نگار نے یونیورسٹی کلکشن میں نمبر ۱۹۱ کے تحت اندراج کیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۳۷، اوراق پر مشتمل اور کافی حد تک کرم خوردہ ہے۔ اس رسالہ کا ایک اور نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ جس کا فہرست نگار نے دہلی کلکشن میں نمبر ۱۱۱۲ کے تحت اندراج کیا ہے[1]۔ اس وقت تک اس رسالے کے یہی دو نسخے منظر عام پر آئے ہیں۔

مبلغ الرجال کے سرورق پر یہ عبارت موجود ہے: "رسالہ مبلغ الرجال من مصنفات حضرت خواجۂ کلاںؒ بن حضرت خواجہ باقی باللہ۔ ۱۰ رجمادی الاولیٰ یوم الثلثا ۱۰۷۶ ہجری صلعم"[2] اسی طرح رسالہ کے اختتام پر یہ عبارت درج

---

[1] مائیکروفلم عندی

[2] مبلغ الرجال، نسخہ علی گڑھ، سرورق۔

ہے: "وقد فرغت من تسوید ھذہ العجالہ ست وستین والف ۱۰۶۶ھ[۳]" ان دونوں تحریروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں اس رسالہ کا سالِ تالیف اور سالِ کتابت ایک ہی ہے۔ اگر مصنف کے نام سے پہلے "حضرت" تحریر نہ ہوتا تو ہم یہ باور کر لیتے کہ یہ رسالہ فاضل مصنف ہی کا تحریر کردہ ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ کاتب نے اسے سالِ تالیف ہی میں اصل نسخے سے نقل کیا ہے۔

مولانا عبدالحیؒ نے نزھتہ الخواطر میں خواجہ کلاںؒ کی تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن ان میں مبلغ الرجال شامل نہیں[۴]۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس رسالہ کے مخطوطات نایاب ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی دوسری کتاب میں اس رسالہ کا نام دیکھنے میں نہیں آیا، اس لئے مولانا عبدالحیؒ اس رسالہ سے بے خبر تھے۔ اس رسالہ کا نام مبلغ الرجال عبارت کے درمیان میں بھی موجود ہے اس لئے اس میں شک نہیں کہ یہ رسالہ اسی نام سے موسوم ہے[۵]۔

فاضل مصنف اس رسالہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔ الحمد للہ علی ما منّ علینا بالارشاد إلی سواء السبیل والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ الامجاد۔ گوید بندہ سر افگندہ شرمندہ از کردار تباہ سراپا گناہ خانہ زاد خواجہ آفاق سبطِ آل نبی مؤید الملۃ والدین ابو الوقت خواجہ محمد الباقی قدس سرہ، احقر عبید اللہ سامحہ اللہ سبحانہ[۶]۔

---

[۳] ایضاً۔ ورق آخر۔ [۴] نزھتہ الخواطر، جلد پنجم، مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، ص ۲۶۹

[۵] "این رسالہ را مبلغ الرجال نام کردہ شد"۔ ورق ۳ الف [۶] مبلغ الرجال، ورق ۱ ب

اس رسالہ میں اکثر جگہ ایسی ہی مرصع عبارات موجود ہیں۔ مثلاً محمود اسپخوانی کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ کلاں رقمطراز ہیں:-

"از املاک ولایت خوزستان در عنفوان سن شعور طریق طلب معرفت و کسب سعادت برگزیدہ دل از وطن مالوف بریدہ، واز ناز و نعم دست افشاندہ در ویرانہای آن سرزمین گوشہ انزوا گزیدہ بود و آنجا بطاعت و عبادت و ذکر و مراقبہ مشغول بودہ[۷]"

اس کتاب کی تالیف کے دوران فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے۔

مرأۃ الجنان، کتاب الانساب، مصباح الھدایہ، اصطلاحات، مفتاح الانوار، احیاء العلوم، کتاب التنزیل، مشکوٰۃ الانوار، تنویۃ العقائد اور شرح تعرف۔

ان کتابوں سے استفادہ کے علاوہ فاضل مصنف نے مندرجہ ذیل بزرگوں کے اقوال بھی اس رسالہ میں نقل کئے ہیں۔

ابو علی دقاقؒ، شہاب الدین تورپشتی، مولانا رومیؒ، احمد غزالیؒ، محمد غزالیؒ، عین القضاۃ ہمدانیؒ، شیخ عبداللہ یافعیؒ، ابن جوزیؒ، ابن الاثیر الجزریؒ، ابو سعید ابو الخیرؒ، میر سید شریف، شیخ عبدالرزاق کاشی، فرید الدین عطارؒ، حسین بن منصور حلاج، شیخ شہاب الدین مقتول، شیخ ابراہیم کانپوریؒ، شیخ ابو محمد حریری، عزیز الدین محمد نسفیؒ، ملا حسین کاشفیؒ، خواجہ غیاث الدین مقصود کازرونی،

---

[۷] ایضاً - ورق ۳۱ ب

حضرت علیؓ، ابوالحسن نوریؒ، اوحدالدین کرمانیؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، شبلیؒ، خواجہ باقی باللہؒ، ابوبکر وراقؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، فخرالدین عراقیؒ، شیخ عبدالحق محدثؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ، ابوبکر کلاباذیؒ، ابوالعباس ابن عطا آرمی اور محمود پسیخوانی۔

اس رسالہ میں مندرجہ ذیل اشخاص کا ذکر کسی نہ کسی سلسلہ میں آیا ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، محمود غزنوی، شریف آملی، امیر تیمور، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، اسمٰعیل صفوی، شیخ مبارک، لاڈو فیضی، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالبرکات، ابوالمکارم، ابراہیم لودھی، اسمٰعیل بن جعفر صادق، اویس قرنیؓ، حسن بصریؒ، عبداللہ بن المقنع، ہارون الرشید، داؤدؑ، جلال الدین تھانیسری شاہ قاسم انوار، میاں شیخ میر، شیخ عبدالجلیل، نوشیرواں، مزدک، ابوالعباس السفاح، ابوجعفر منصور، خلیفہ ہادی، مولانا زاہد بلخی، شیخ حسین خوارزمی، خلیفہ المتوکل، المعتصم، بابک رومی، یعقوب بن العقیل، عبداللہ بن سباء، شیخ محمد بن حسن ملتانی، سیف الدین بن شیخ سعداللہ بخاری، شیخ حمید افغان، سید رفیع الدین صفوی، سلطان سنجر، ابراہیم زردشتی اور گشتاسپ بن لہراسپ۔

فاضل مصنف نے چونکہ طریقت کے اعلیٰ مقامات حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خدمت میں رہ کر طے کئے تھے، اس لئے جہاں کہیں بھی حضرت کا ذکر آیا ہے مصنف نے ان کا ذکر بڑے عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک جگہ آپ ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

یکے از کبار صوفیائے اعنی بدر الملت والدین ابوالبرکات شیخ احمد بن شیخ عبدالاحد السہرندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہ۔[8]

---

[8] ایضاً۔ ورق، ۴ الف

ایک دوسرے موقع پر ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

شیخ الشیوخ العصر شیخ بدرالدین ابوالبرکات احمد السہرندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہ[9]

اس رسالہ میں ایک جگہ حضرت کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

شیخ الشیوخ العظام الراسخین وقدوۃ المتمکنین بدر الملت والدین ابوالبرکات شیخ احمد السرہندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہ۔[10]

آمدم برسر مطلب، اس رسالہ میں چار وصل اور ایک فصل موجود ہے جیسا کہ فاضل مصنف فرماتے ہیں: "مطلب این رسالہ در چہار وصل (بواؤ) و یک فصل (بفاء) بتحریر می یابد" ان وصول کے مطالب درج ذیل ہیں۔

**وصل اول۔** دربیان مذہب حکماء

**وصل دوم۔** دربیان مذہب متکلمین وجمہور قدماء صوفیہ

**وصل سوم۔** دربیان مذہب اتباع شیخ محی الدین ابن العربی قدس سرہ، حکماء اشراقیین ولقرف کہ شیخ العصر بدر الدین ابوالبرکات احمد السرہندی الفاروقی النقشبندی قدس سرہ درین مسئلہ نمودہ اند۔

**وصل چہارم:-** دربیان فضل ورجحان مقام انبیاء علیہم السلام وبرکہ برمسلک ایشان علیہم السلام رسوخ ورزد۔

**فصل بفاء۔** درمذہب ملاحدہ حفظہما اللہ سبحانہٗ۔

اب ہم ان میں سے ہر موضوع پہ الگ الگ بحث کریں گے۔

---

[9] ایضاً، ورق، ۴ الف

[10] ایضاً، ورق ۲۲ ب

**وصل اوّل :-** فلاسفہ کا کہنا ہے :-

واجب الوجود موجب بذاتست عالم از ذات او صادر شد چنانچہ شعاع از قرص، و وجود معلول از علت، ہمیں تا قرص آفتاب بود شعاع آفتاب، وکذا الحکم فی العلۃ والمعلول، ومی گویند کہ اوّل چیزے از باری تعالیٰ صادر شد جوہری بود، نام آن جوہر عقل است اوّل، واین بر اصل اہلِ حکمت است کہ انہ لا یصدر من الواحد الا الواحد، پس از باری تعالیٰ کہ احد حقیقی است، احد حقیقی صادر شد وآن عقل اوّل است[11]

فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ اسی عقل سے روح و نور، جبرئیلؑ، میکائیلؑ عزرائیلؑ اور اسرافیلؑ پیدا ہوئے، اور اسی سے لوح و قلم، بیت اللہ، بیت العتیق، و بیت الاوّل اور مسجد اقصیٰ وجود میں آئے۔ پھر اسی عقل سے آدمؑ، ملک مقرب اور عرشِ عظیم ظہور میں آئے، اور جو کچھ بھی معرضِ وجود میں آیا ہے، یہ "جملہ اسامی این عقل اند"[12]

اس کے علاوہ فلاسفہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ یا تو جوہر ہے یا عرض۔[13] فلاسفہ کے ان اقوال کی تائید میں آپ نے احمد غزالیؒ، ابودقاق، شہاب الدین تورپشتی، مولانا رومیؒ، محمد غزالیؒ، عبدالرحمن الجرمیؒ، عبداللہ یافعیؒ، ابن الاثیر الجزریؒ اور عین القضاۃ ہمدانیؒ کے اقوال نقل

---

[11] ایضاً، ورق ۴ب [12] ایضاً، ورق ۵ الف

[13] ایضاً، ورق ۵ب

کئے ہیں۔

**وصل دوم :-** خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ علماءِ متکلمین کہتے ہیں: اوّل چیزے کہ از دریائے عدم بساحل وجود آمد جوہرے بود، آں جوہرے بشگافت و دو شاخ شد، شاخے از ان بر مبداء عالم ارواح است و شاخے مبداء عالم اجسام۔ مبداء عالم ارواح در زبانِ شرع ماء خوانده شده۔ وجعلنا من الماء کل شئ حیّ افلا یومنون۔[14]

متکلمین میں ایک گروہ ایسا بھی موجود ہے جس کا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے خدا نے جوہر خاک پیدا کیا اور اس کے واسطے سے دوسری چیزیں پیدا کیں۔[15] اس نظریہ کی تائید میں بھی خواجہ کلاںؒ کو عین القضاۃ ہمدانیؒ اور احمد غزالیؒ کے اقوال مل گئے ہیں۔

**وصل سوم :-** اہلِ وحدت کا یہ خیال ہے کہ وجود ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا، اور اس وجود سے ان کی مراد وجود باری تعالیٰ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ باری تعالیٰ کا وجود کوئی جُز یا خُرد رکھتا ہو۔ اہلِ وحدت کہتے ہیں کہ اس کا ایک وجود ظاہری ہے اور دوسرا باطنی، اور یہ باطنی وجود نور ہے اور یہی نور جانِ عالم ہے اور اسی نور سے یہ عالم مالا مال ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ظاہر این وجود مظاہر صفات این نور اند۔ ہر اسمے و فعلے و صفتے کہ در عالم است جملہ آسامی و افعال از پرتوِ نور وجود است۔[16]

---

[14] ایضاً، ورق ۶ الف [15] ایضاً، ورق ۶ب

[16] ایضاً، ورق ۱۳ الف۔

اہل وحدت یہ بھی کہتے ہیں کہ "حقیقت امواج متکثرہ بحر جز بحر نیست"۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کلمات وحروف کی حقیقت اسی ذات کی تجلیات ہیں۔ اہل وحدت کہتے ہیں کہ "ہمہ صورت ہای علمی حق اند کہ حق تعالیٰ خود را بااین صورتہا ظاہر گردانیدہ است"[17] اس نظریہ کی تائید میں خواجہ کلاںؒ نے صوفیۂ موحدہ میں سے میر سید شریف، امام غزالیؒ، شیخ شہاب الدین مقتول، ملا حسین کاشفی، خواجہ غیاث الدین منصور کازرونی، حسین بن منصور حلاج، شیخ عبدالرزاق کاشی، فریدالدین عطارؒ، ابوالحسن نوریؒ، اوحدالدین کرمانیؒ، شیخ ابراہیم کانپوریؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، شیخ ابو محمد حریریؒ اور عزیزالدین محمد نسفیؒ کے حوالے دئے ہیں۔ مزید برآں آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی ایک قول نقل کیا ہے۔

یہ سب لکھنے کے بعد خواجہ صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ "علماء شرع شریف را بر بعضی از کلمات این طائفہ اعنی صوفیہ موحدہ اعتراضے است"[18] اس کے بعد آپ نے خود ہی صوفیہ موحدہ پر اعتراضات کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا کلام خلافِ شریعت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اس بکھیڑے میں نہ پڑتا لیکن حضورؐ کی ایک حدیث یاد آگئی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:۔

الساکت عن الحق شیطان اخرس

لہٰذا میں ان کے اقوال کے جوابات دینے پر مجبور ہوں۔[19]

---

[17] ایضاً

[18] ایضاً، ورق ۲۰ الف

[19] ایضاً۔

خواجہ کلاںؒ شیخ محی الدین اکبر ابن عربیؒ کا نظریۂ وحدت الوجود بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ اس نظریہ پر حضرت مجدد الف ثانیؒ نے تصرف کیا ہے۔ حضرت کا یہ فرمان ہے کہ:

> عبودیت مقام عدم ذاتی و احتیاج است کہ عین حقیقت امکانیہ است، پس ہر کہ خود را بر مقام مذکور نگاہ دارد از معارف حضرت الٰہی نصیبہ بہتر یابد۔ و این مقام مطابق قدم نبوت است۔ پس اہتمام در اکثار عبادت باوجود حصول کمالِ حقیقی سبب ازدیاد مشخصات کمال وجودی شخصی آید پس التزام بدان لازم باشد۔ بالجملہ احکام وجود شخصی را با کمال توحید جمع داشتن قدم انبیاء است۔[20]

اسی وجہ سے حضرت یہ فرمایا کرتے تھے کہ منتہیوں کا قول و فعل شریعت سے اقرب ہوگا۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت مجددؒ الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ جس قدر عارف کا پایۂ عبودیت بڑھے گا، اسی قدر کنگرۂ عرفان رفیع تر ہوگا۔ آپ کا یہ بھی قول ہے کہ جنھیں مقامِ عبودیت پر استقامت ہوگی انھیں کو معبود کی تجلیوں سے بہرہ ملے گا۔ اور یاد رہے کہ یہی مقام انبیاء علیہم السلام کا تھا اور حضور سرورِ کائناتؐ مقام عبودیت میں ان سب سے آگے تھے۔[21]

**فصل چہارم:** ۔خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد توحید کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی اور توحیدِ نقلی

---

[20] ایضاً، ورق ۲۳ الف

[21] ایضاً۔

اور توحید صفاتی پر لوگوں کی زبانیں کھلنے لگیں۔ اسی طرح جب توکل اور تفویض کے موضوع زیر بحث آئے تو حضرت اویس قرنیؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے لے کر سید الطائفہ جنید بغدادیؒ تک رائے زنی کرنے لگے۔ پھر کچھ اور زمانہ گزرا تو توحید حالی اور توحید حق پر مناظرے ہونے لگے اور محبت و انس اور ہیبت و وصلت پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ انہی ایام میں ابن العربیؒ بھی میدان میں نکل آئے اور وحدۃ الوجود کے موضوع پر وعظ کہنے لگے۔ اس کے بعد صحو و تمکین صوفیہ کا تکیہ بنے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ صحو و تمکین کمالِ تنزل درجات ہے اور منتہی اسے "قصور استعداد لشرف تجلیات ذاتیہ" کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں[22]۔

خواجہ کلاںؒ فرماتے ہیں کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کا قول ہے کہ "نہایات الصدیقین اول احوال الانبیاء"۔ اور اس کی تشریح وہ یوں کیا کرتے تھے کہ اگر احوال الانبیاء کو ایک پانی سے بھری ہوئی مشک سے تشبیہ دی جائے تو "نہایات الصدیقین" کی مثال اس طراوت جیسی ہوگی جو مشک کی سطح پر آجاتی ہے[23] (یعنی قطرۂ آب بھی نہیں) غالباً حضرت بایزیدؒ کے اسی قول کو پیش نظر رکھ کر ابو العباس ابن عطا ادمیؒ نے یہ کہا تھا۔

ادنیٰ منازل المرسلین اعلیٰ مراتب الانبیاء
ادنیٰ مراتب الانبیاء اعلیٰ مراتب الصدیقین۔

---

[22] ایضاً، ورق ۲۳ ب

[23] ایضاً، ورق ۲۴ ب

ادنیٰ مراتب الصدیقین اعلیٰ مراتب الشہداء۔
ادنیٰ مراتب الشہداء اعلیٰ مراتب الصالحین۔
ادنیٰ مراتب الصالحین اعلیٰ مراتب المومنین[24]۔

خواجہ کلاںؒ جناب ابوبکر کلاباذیؒ کی شرح تعرف کے حوالے سے یہ نقل فرماتے ہیں کہ اس پر اولیاء اللہ کا اجماع ہے کہ خواہ کوئی کتنا ہی بلند پایہ اور قوی مایہ کیوں نہ ہو وہ انبیاء کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ ایک دوسرے موقع پر شیخ شہاب الدین مسعود بک خواہر زادۂ سلطان فیروز تغلق کے رسالہ تنزیہ العقائد کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ "نبوۃ صفتے است مخصوص کہ یافتہ نشود مگر در انبیاء ہمثل نطق در لسان۔ و ولایت صفتے است کہ یافتہ می شود در انبیاء و غیر انبیاء مثل حیوۃ کہ شامل ست مر انسان و حیوان را[25]۔"

خواجہ صاحبؒ اسی جگہ مفتاح الاسرار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ سماء الدین ابراہیم کانپوریؒ کا بھی یہی قول ہے[26]۔

### فصل در بیان مذہب ملاحدہ:-

ملاحدہ وہ لوگ ہیں جو "عالم را موجود یا اعتبار میدانند و ترتیب ثواب و عقاب بر عمل و کردار اعتقاد نکنند"[27]۔ اس گروہ خبیثہ میں عنصریہ، کوکبیہ، سوفسطائیہ اور موحدہ شامل ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ زمین میں بوؤگے وہ اُگ آئے گا۔ اور اس کے اُگنے میں قدرت کو کوئی دخل نہیں

---

[24] ایضاً

[25] ایضاً، ورق ۲۵ الف

[26] ایضاً

[27] ایضاً،

بلکہ یہ عمل تاثیرِ کواکب و عناصر کے تحت ہوگا۔ یہ لوگ مبداؑ و معاد کے مسائل کو دل لگی سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص مرتا ہے وہ گھاس کی طرح ضائع ہو جاتا ہے[٢٨]

یہ لوگ قرآنِ پاک کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف سمجھتے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ احکامِ شرع اہلِ رائے کے بنائے ہیں۔ ملاحدہ نماز کا مذاق اُڑاتے ہیں اور جب کسی کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدا کو آسمان پہ ماننا اور سر زمین پر رکھنا بھی بھلا کوئی دانائی کا کام ہے۔ جب یہ لوگ حجاج کو صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اُنہوں نے کیا گم کر دیا ہے جس کی تلاش میں یہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر یہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان بے گناہوں کو کیوں مارتے ہو۔ ماہِ رمضان کا نام اُنہوں نے ماہ گرسنگی و تشنگی رکھا ہوا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ جو قطرہ آبِ انسان کی خلقت کا سبب ہے۔ اِس کے باہر نکلنے سے غسل کیونکر واجب ہوتا ہے؟ حالانکہ اسی راہ سے پیشاب، جو کہیں زیادہ گندہ ہے، نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ لوگ ماں بہن کی حرمت کے قائل نہیں ہیں، یہ گروہ نقلیات کا منکر اور عقلیات کا داعی ہے اور ہر اسلامی شعار کا مذاق اُڑانا اس کا بہترین شغل ہے[٢٩]

ملاحدہ کا طریقہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک ندیم ابراہیم

---

[٢٨] ایضاً۔ [٢٩] ایضاً، ورق، ب ٢٥،

زردشتی سے شروع ہوا۔ اس طائفہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ابراہیم زردشتی کے بدن پر برص نمودار ہوئی تو بنی اسرائیل نے اُسے جلاوطن کر دیا اور وہ ایران چلا آیا، جہاں گشتاسپ بن لہراسپ نے اُسے اپنے ہاں پناہ دی[٣٠]۔ ایران میں قیام نے دوران اس نے عوام کو "آئینِ زندقہ و اباحت" سے روشناس کرایا۔ اکاسرۂ ایران کی سرپرستی میں اس طریقہ کی ایران میں خوب ترویج ہوئی۔ جب یہودیوں کی ایران میں آمد و رفت شروع ہوئی تو وہ بھی "آئینِ اباحت" سے روشناس ہوئے رومیوں نے بھی اس سرزمین سے یہ فیض پایا اور حکمائے اشراق اور حکمائے مشائین بھی ایران میں رہتے ہوئے "آئینِ زندقہ و اباحت" سے اثر پذیر ہوئے۔

جب نوشیرواں تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق زنادقہ اور اباحتیہ کا قلع قمع کیا۔ اسی کے عہدِ معدلت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایران پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانۂ خلافت میں:

> "عبداللہ ابنِ سبا در لباسِ تشیع مجدد آن مذہب نارواگشت
> و گروہا گروہ مردم از اہلِ کوفہ و بصرہ و مصر و یمن بنا دانستگی
> گفتار او را پذیرفتند و بظاہر خویشتن را شیعہ آلِ محمد گویانند۔
> بباطن در فساد دینِ متین اسلام کوشیدند و فتنہ ہا زائید ولے

---

[٣٠] ایضاً۔

از نفوسِ طیبہ در بادِ خزاں فتنہ و فساد نابود شدند۔[۳۱]

حضرت علیؓ نے ان میں سے بہتوں کو جہنم رسید کیا۔

ابوالعباس السفاح اور ابوجعفر منصور کے عہد میں مزدک نامی ایک شخص نے دوبارہ یہی فتنہ کھڑا کیا اور مہدی و ہادی کے زمانے میں کثرت کے ساتھ لوگ گمراہ ہوئے۔ ان پر نماز ادا کرنا اور غسلِ جنابت کرنا گراں گزرنے لگا۔ اسی طرح موسمِ گرما میں روزے رکھنا دوبھر ہوا۔ ادائیگی زکوٰۃ بھی ان کو مشکل نظر آنے لگی۔ اس دور میں ان ملاحدہ کے زیرِ اثر اتباعِ خواہش، زنا اور شراب کو فروغ ہوا۔[۳۲]

عہدِ مہدی میں سمرقند میں عبداللہ ابن المقنع نے دعوئے الوہیت کیا اور مسلمانوں کے خلاف فوج آرا ہوا۔ دار الخلافہ سے اس کے خلاف ایک لشکرِ جرار بھیجا گیا جس نے اس کے متبعین کی اکثریت کو جہنم واصل کیا۔

مہدی اور ہادی کو خدا نے توفیق عطا فرمائی اور انھوں نے حتی الوسع زندقہ و الحاد کو دبایا۔[۳۳] ہارون الرشید کے آخری ایامِ حکومت اس فتنہ نے دوبارہ سر اٹھایا اور اس بار رؤسائے عرب اور ملوکِ عجم بھی گروہ ملاحدہ میں شامل ہو گئے۔ عباسیوں کے اکثر وزیر اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانے میں زندقہ و الحاد کی ہوا کچھ ایسی چلی کہ اکثر ہاشمی بھی گمراہ ہو گئے، ان میں سے یعقوب بن العقیل بن عبدالرحمٰن بن عباس بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نے

---

[۳۱] ایضاً، ورق ۲۶ ب [۳۲] ایضاً۔

[۳۳] ایضاً، ورق ۲۷ الف۔

اپنی بیٹی کو حامل کر دیا اور اسی وجہ سے وہ عوام میں زندیق کے لقب سے مشہور ہوا۔[۳۴]

المعتصم کے عہدِ خلافت میں بابک نامی ایک رومی نے مذہبِ الحاد کا پرچار شروع کیا۔ خلیفہ نے اس کے مقابلے پر پے در پے لشکر روانہ کیے تب کہیں اس کا زور ٹوٹا۔ خلیفہ المتوکل کے عہد میں قرامطہ نے سر اٹھایا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ حجاز، عراق اور سندھ پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے حجاز کے قافلوں کو لوٹنا اپنا شعار بنایا اور ان کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ وہ بیت اللہ سے حجرِ اسود بھی اکھاڑ کر لے گئے۔[۳۵]

اسی زمانے میں باطنی فرقے کا ظہور ہوا، یہ لوگ خود کو شیعہ اسمٰعیل بن جعفر صادق کہلاتے تھے۔ انھوں نے کچھ باتیں تو مجوس سے اخذ کیں اور باقی احکام فلاسفہ سے مستعار لیے۔ انھوں نے باطنی تعلیم کے بہانے احکامِ شریعت ساقط کر دیے۔ ان کے طریقے کا کسی نے ان الفاظ میں کیا خوب تجزیہ کیا ہے "ظاہر مذہب شیعہ باطن مذہب الحاد و کفر"۔[۳۶]

ملتان میں خدا نے شیخ حمید افغانی کو توفیق دی اور اس نے قرامطہ کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح سلطان محمود غزنوی نے بھی تائیدِ ایزدی سے ان پر ضربِ کاری لگائی۔ ایران میں دیالمہ نے بھی لباسِ تشیع میں سر اٹھایا اور اپنی قلمرو میں الحاد کو فروغ دیا۔ وہ بھی سلطان محمود کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوئے۔[۳۷]

---

[۳۴] ایضاً [۳۵] ایضاً، ورق ۲۸ الف

[۳۶] ایضاً، ورق ۲۹ ب [۳۷] ایضاً ورق ۳۰ ب

اقصائے مغرب میں اسماعیلیہ نے، جو اس دیار میں عبیدیہ کے نام سے معروف ہیں، "سر از لحاف گمنامی برداشت" وہ کچھ تو خیر السلاطین صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں برباد ہوئے اور بقیہ کو سلطان سنجر نے تہ تیغ کیا۔ اس کے بعد محمود بسیخوان اٹھا اور اس نے زندقہ والحاد کا پرچار شروع کیا۔ اس کی موت کے بعد اٹھائی سو سال تک الحاد کا نام سننے میں نہ آیا۔ اسمٰعیل صفوی کے تخت نشین ہوتے ہی زندقہ والحاد میں از سر نو جان پڑ گئی ہے[۳۸]

ہندوستان میں زندقہ والحاد کا آغاز اس طرح ہوا۔

> "در بادشاہی سلطان عظیم الشان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ حافظا اللہ عنہ شیخ ابوالفضل ناگوری بساط آئین خسارت قرین را در مملکت ہندوستان گسترد و سرگزشت محمود بسیخوان و شیخ ابوالفضل ناگوری چون بواقعی گوش آشنائے مردم نیست و نیز در تاریخ کما ینبغی نگاشتہ نشدہ این کمترین درین محل ثبت می نماید۔"[۳۹]

محمود بسیخوان خوزستان کے ایک موضع بسیخوان کا رہنے والا تھا۔ وہ نوجوانی میں طلب حق میں گھر سے نکلا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ وہ آبادی سے باہر عبادت و مراقبہ میں مشغول رہتا اور درختوں کے پتے اور گھاس کھا کر گزر بسر کرتا۔ ایک دن وہ ایک ندی کے کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اُسے پانی میں کوئی چیز بہتی نظر آئی۔ جب وہ چیز اس کے قریب آئی تو اس نے

---

[۳۸] ایضاً۔ ورق ۱۳۱ الف

[۳۹] ایضاً۔

اُسے بغور دیکھا تو وہ ایک تر و تازہ گاجر تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس گاجر کو پکڑ لیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اُسے کھا گیا۔ اس کے بعد وہ ہر روز وقتِ مقررہ پر وضو کے لیے ندی پر پہنچتا اور ایک بہتی ہوئی گاجر اس کی طرف آتی اور وہ اُسے پکڑ کر کھا لیتا۔ وہ اس پر خوش تھا کہ خدا نے اس کے رزق کا اس طرح انتظام کر دیا ہے۔

محمود بسیخوانی کو گاجریں کھاتے ہوئے دو ماہ گزر گئے تو اس کے دل میں یونہی ایک خیال آیا کہ دیکھنا تو چاہیئے کہ یہ گاجریں کہاں سے آتی ہیں۔ اگلے دن وہ وقتِ مقررہ سے پہلے ندی پر پہنچا اور پانی کے بہاؤ کے خلاف چل پڑا۔ ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک برہنہ عورت ندی کے کنارے بیٹھی:

> زردکے را در محل مخصوص خود میفرستد و می بر آرد و ساعتے نیک بدان عمل قیام نمود، چون از کار پرداخت و آتش توقان او فرو نشست آں زردک را در آب از دست فروہشت[۴۰]

محمود نے دور سے یہ ماجرا دیکھا تو خدا کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "اے خدا تو اپنے مخلص بندوں کو ایسی چیزیں کھانے کو دیتا ہے؟" اس واقعہ کے بعد وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ وہ اسلام سے پھر گیا اور اس نے الحاد کا پرچار شروع کیا۔ اس نے اپنے عقائد پر تیرہ رسالے لکھے جن میں سے "بحر و کوزہ" سب سے گیا گذرا ہے۔ "فضلاتی کہ دی در آنجا خوردہ گوش از شنیدن آن قی میکند" اس "ملعون" کے مذہب کے

---

[۴۰] ایضاً۔ ورق ۱۳۱ ب

رؤسا میں سے شریف آملی اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا اور ابوالفضل کا دستِ راست بنا۔[۴۱]

شریف آملی کا شمار ملاحدہ میں ہوتا ہے۔ وہ کسی زمانے میں بلخ میں مولانا محمد زاہد نبیرۂ مخدومی شیخ حسین خوارزمیؒ کی خانقاہ میں قیام کے ارادہ سے آیا لیکن جب انھیں اس کے عقاید معلوم ہوئے، تو انھوں نے اُسے اپنی خانقاہ سے نکال دیا۔ بلخ سے نکل کر وہ دکن چلا آیا اور وہاں اپنے عقائد کا پرچار کرنے لگا۔ دکن میں لوگ اس کے قتل کے درپے ہوئے تو وہ شمالی ہندوستان چلا آیا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اکبر کے حضور میں باریاب ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں اس نے "حرفہائے ناہموار" کہے جو بادشاہ نے پسند کیے۔ اکبر نے اُسے ہزاری منصب دے کر اپنے مقربین کے زمرہ میں داخل کر لیا۔ وہ محمود بسیخوانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بنگال میں لوگوں کو مراتب چہارگانہ کی، جو ابوالفضل کے اجتہاد کا نتیجہ تھے، تلقین کیا کرتا تھا۔ اس نے بھی بحر و کوزہ کی طرز پر "مہملات" پر مشتمل ایک کتاب لکھی تھی۔[۴۲]

شیخ مبارک ناگوری کا شمار "دانشمند ملاؤں" میں ہوتا تھا اور وہ سید رفیع الدین شیرازی کا شاگرد تھا۔ شیخ مبارک کی شادی لاڈو سے ہوئی جس کے بطن سے فیضی، ابوالفضل، ابوالخیر، ابوالمکارم اور ابوالبرکات پیدا ہوئے۔ شیخ کے مذہب کے متعلق خواجۂ کلاںؒ رقمطراز ہیں

---

[۴۱] ایضاً، ورق ۳۲ الف

[۴۲] ایضاً، ورق ۳۲ ب

"وہ بر عصر ہمان مشرب و مذہب شعار وقت خود می ساخت کہ ملوک و امرای عصر بدان مذہب رغبت بیدا افتند"[۴۳] شاید ایسے ہی شخص کے لیے کسی نے کہا ہے۔ ع

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

شیخ مبارک کو سلطان ابراہیم لودھی کے عہد میں کٹر سنی سمجھا جاتا تھا اور سوریوں کے عہد حکومت میں لوگ اُسے مہدویوں کے زمرہ میں شمار کرتے تھے، ہمایوں کے زمانہ حکومت میں وہ خود کو نقشبندی صوفی ظاہر کرتا تھا۔ اکبر کے عہد میں وہ مشربِ اباحت پر کاربند اور صلح کل ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ شیخ مبارک کی طرح اس کے فرزند ابوالفضل میں بھی استقلال نام کو نہ تھا۔ خواجۂ کلاںؒ رقمطراز ہیں۔ "دل بالکل وی ہیچ دین و ملت قرار نمی گرفت"۔ اس نے مجوس و نصاریٰ و یہود سے مذہب کے متعلق معلومات حاصل کیں اور انھیں لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ اکبر کی صحبت کو اپنے لیے تائید غیبی سمجھتا تھا۔

ابوالفضل نے شاہی فرامین بھیج کر دنیا بھر سے دوسرے مذاہب کی کتابیں حاصل کیں اور اسی شوق میں متھرا، بنارس، جگن ناتھ اور سومناتھ سے

---

[۴۳] ایضاً، ورق ۳۳ الف (خواجہ باقی باللہؒ کے انتقال کے وقت خواجۂ کلاںؒ ابھی بچے ہی تھے، اس لیے ان کی تربیت خواجہ بزرگ کے خلیفہ خواجہ حسام الدینؒ نے کی۔ خواجہ حسام الدینؒ کی اہلیہ شیخ مبارک کی بیٹی اور فیضی اور ابوالفضل کی ہمشیرہ تھیں، اس لیے خواجۂ کلاںؒ کی اس خاندان کے متعلق روایات بڑی وزنی ہیں۔)

بھی کتابیں منگوائیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کی حیرت میں اضافہ ہوا اور وہ نہ صرف یہ کہ دہریہ ہوا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اباحت میں بھی قدم رکھا۔ اخلاق کے معاملے میں وہ کتبِ حکماء کو مقدم رکھتا تھا۔ ابوالفضل نے ایک کام اور کیا وہ یہ کہ "در رنگ ابنِ مقنع خبیثِ مذکور کلیلہ و دمنہ را بہ طرزِ خاص تحریر نمود و در مقامِ تمثیل و استشہاد حکایت واہیہ از نزد خود افزود ـ"[44] (کفر و زندقہ کی یہ تمام منازل اس نے خود طے کیں اور) اس کے بعد شریف آملی سے ملا اور خوب ملحد ہوا اور بالآخرہ باشارۂ بادشاہ زادہ عالمیان ولی عہد نورالدین محمد جہاں گیر" قتل ہوا۔

خواجہ کلاںؒ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ عوام کی گمراہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ "ہوسناک اور اوباش" لوگوں کا ایک گروہ فقراء کی خانقاہوں میں "آش و نان" مہیا کر رہا ہے جس کے کھانے سے فقراء کی قوت فہم و ادراک میں نقص پیدا ہوتا ہے اور وہ وادی الحاد میں جا نکلتے ہیں۔[45]

بسا اوقات لوگ صوفیوں کی تحریروں کو پڑھ کر یا ان کے وعظ سن کر جادۂ شریعت سے دور نکل جاتے ہیں۔ خواجہ کلاںؒ فرماتے ہیں کہ میرے والدِ بزرگوار خواجہ آفاق محمد الباقیؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی بعض رباعیات میں وحدت الوجود کے مسائل پیش کئے ہیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ "از ما این تصنیف خوب واقع نشدہ است"[46] اسی ضمن میں آپ نے

---

[44] ایضاً، ورق ۳۳ ب [45] ایضاً، ورق ۳۴ ب

[46] ایضاً۔

یہ بھی فرمایا کہ مجھے بہت بعد جا کر معلوم ہوا ہے کہ "دائرۂ طریقہ وحدۃ الوجود ما بے است وسیع و راہِ توحید نسبت بآں شاہراہ کوچہ تنگی بیش نیست"[47] اس خیال سے کہ طریقت کے بعض مقامات اور ان کے احوال عوام کے فہم سے بالاتر ہیں، آپ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو یہ نصیحت فرمائی تھی۔

"اگر سخن گرا باید بطورِ علماء گرا باید نہ بطور صوفیہ و اگر احیاناً بطور صوفیہ گفتہ شود بہ اغلاق گرا باید کہ جز مخاطبت دقیقہ شناس دیگرے نفہمد و از آنجا چیزی فرانگیرد کہ موجب ذلّت و ہفوات وی شود"[48]

(اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے اور اپنے مکتوب یازدہم کی اشاعت نہ فرماتے تو انھیں گوالیار میں سنّتِ یوسفی کی پیروی نہ کرنا پڑتی۔)

خواجہ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں وہ دہریوں، طبیعیوں، اسماعیلیوں اور مباحیوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔[49] اب حضرت بادشاہ دین پناہ، امام السلطنۃ والسلاطین، و قطب الخواقین زینہار زمان و زمین، و بادشاہ عالم و عالمین، مؤسس قواعد العقل والداد، دافع احکام الظلم، و قامع بنیان الحاد، نزہۃ الدہر و بہجۃ العصر الاسلام، عضد قوی والحق برہان جلی، نجم ثاقب للمردۃ والشیاطین، و شمس بازغ لاہل معرفت والیقین، محی الخلفاء الراشدین، و منقبۃ امیر سید المرسلین، ظل اللہ الظلیل، امیر المومنین، صاحبقران ثانی، شہاب الدین محمد شاہجہان بادشاہ اطال اللہ عمرہٗ کو حکمائے یونان

---

[47] ایضاً۔ [48] ایضاً۔ [49] ایضاً، ورق ۳۷ الف۔

اور فلاسفہ ناپسند ہیں اور اسی وجہ سے زندیق بھی اس سے خائف وترساں رہتے ہیں[50]

آخر میں خواجہؒ کلاںؒ رقمطراز ہیں کہ ان دنوں آئمہ متقی کم رہ گئے ہیں جو دین کی غم خواری کریں اس لئے بادشاہ سے کہو کہ وہ یہ کام کرے[51]

---

[50] ایضاً، ورق ۳۵ الف

[51] ایضاً، ورق ۳۶ ب، ۳۷ الف

# احسن الاقوال کی تاریخی اور سماجی اہمیت

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حضرت برہان الدین غریب کے ملفوظات پر مشتمل احسن الاقوال کے عنوان سے ایک نادر مخطوطہ ہے[1] اس مخطوطہ کے ۷۹ ورق ہیں اسے ۷۳۸ھ ۱۳۳۷ء میں حضرت برہان الدین غریب کے ایک مرید حماد بن عماد کاشانی نے مرتب کیا تھا۔ موجودہ دور کے تاریخ دانوں کو قدیم مورخین سے یہ گلہ رہا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی تاریخیں صرف سلاطین اور بادشاہوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان میں سے بعض تاریخیں تو شاہی دربار کا روزنامچہ بن کر رہ گئی ہیں۔ ان مورخین نے عوام کی مذہبی اور سماجی حالت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کمی کو صوفیاء کرام کی خانقاہوں میں مرتب ہونیوالے ملفوظات نے کافی حد تک پورا کیا ہے احسن الاقوال میں قرون وسطیٰ کے خانقاہی نظام اور صوفیہ اور عوام کی معاشرتی اور سماجی زندگی پر جس انداز سے قلم اٹھایا گیا ہے، اس کی نظیر اور کسی بزرگ کے ملفوظات میں نہیں ملتی۔

---

[1] یونیورسٹی کلکشن فارسیہ، مذہب، تصوف نمبر ۳۱۸

## صاحبِ ملفوظات

حضرت برہان الدین غریب، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے انہیں "صاحب شوق و ذوق" لکھا ہے۔[1] اس عہد کے اہل علم اور مشائخ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ امیر خسرو اور امیر حسن علاء سجزی جیسے باکمال حضرات ان کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔[2] حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات تھے۔

حضرت برہان الدین کو حضرت سلطان المشائخ کے ساتھ اسقدر عقیدت تھی کہ انہوں نے مدت العمر کبھی غیاث پور دلستی حضرت نظام الدین، کی طرف پشت نہیں کی۔[3]

ایک بار موصوف حضرت نظام الدین اولیا کے جماعت خانہ میں بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے کمبل تہ کرکے اس پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے اعزاء میں سے ملک نصرت اور علی زنبیلی نے حضرت سلطان المشائخ سے اس کا ذکر کیا تو حضرت بے حد ناراض ہوئے انہوں نے فوراً اپنے خادم خاص اقبال سے کہا کہ برہان الدین سے کہو کہ وہ فوراً یہاں سے چلا جائے۔ حضرت برہان الدین

---

[1] عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ ھ، ص ۹۳

[2] ایضاً ص ۹۳-۹۴ "فضلائے زمانہ مثل امیر خسرو و امیر حسن و خوش طبعان دیگر اسیر محبت او بودند

[3] ایضاً، ص ۹۴

پریشان ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔ جب ان کے احباب کو اس واقعہ کا پتہ چلا تو وہ ان کے پاس اظہار افسوس کے لئے جانے لگے۔ کئی روز بعد امیر خسرو اپنے گلے میں دستار ڈال کر سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں معافی دلوائی۔[1]

حضرت برہان الدین غریب سات صد درویشوں کے ہمراہ دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ درویش انہیں پالکی میں بٹھا کر دکن لے گئے۔ دکن کی تاریخ میں "پالکی کی آمد" بڑی اہمیت کی حامل ہے۔[2] حضرت برہان الدین کے نام نامی کی مناسبت سے برہان پور کی بنیاد رکھی گئی اور یہ شہر مدتوں تک خاندیش کے فاروقی سلاطین کا پایہ تخت رہا۔

حضرت برہان الدین اور ان کے ساتھیوں نے دکن کی سرزمین میں اسلام کی تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ ان کا انتقال ۷۳۸ ھ ۱۳۳۷ء میں ہوا۔[3] "نور عشق بود" اور "اولیاء خاص" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ حضرت کا مزار اورنگ آباد سے سترہ اٹھارہ میل کے فاصلہ پر خلد آباد میں واقع ہے۔ سڑک کے بائیں جانب ایک چار دیواری کے اندر حضرت برہان الدین محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اسی احاطہ قبور میں ریاست حیدر آباد کا بانی نظام الملک آصف جاہ اول اور ناصر جنگ شہید مدفون ہیں۔ حضرت برہان الدین کی درگاہ کے بالمقابل ایک ایسی ہی چار دیواری

---

[1] عبدالحق محدث، ص ۹۴

[2] شیخ محمد اکرام، آب کوثر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ ص ۴۱۳

[3] ایضاً ص ۴۱۲

کے اندر شیخ زین الدین کا مزار ہے اور وہیں اورنگ زیب عالمگیر، شہزادہ اعظم اور امیر حسن علا سجزی کی قبریں ہیں۔

## جامع ملفوظات

جامع ملفوظات نے متن میں دو جگہ اپنا نام حماد بن عماد کاشانی تحریر کیا ہے ایک جگہ اس نے اپنے بھائی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے

برادرم مجمع الادب قدوۃ الاکتساب خواجہ رکن الدین کاشانی[1]

ایک موقع پر اس نے اپنے دوسرے بھائی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

برادرم صدر الافاضل خواجہ برہان الدین کاشانی[2]

اس کا ایک تیسرا بھائی بھی تھا جس کا نام خواجہ مجد الدین کاشانی تھا۔ جامع ملفوظات نے اس کے نام سے پہلے "قدوۃ البلغاء" لکھا ہے[3]۔ موخر الذکر دونوں بھائی حضرت برہان الدین غریب سے بیعت تھے[4]۔

## احسن الاقوال کی اہمیت

حماد کاشانی نے جس محنت اور کاوش کے ساتھ احسن الاقوال کو

---

۱۔ احسن الاقوال، ورق ۱۰ الف

۲۔ ایضاً، ورق ۷ الف

۳۔ ایضاً، ورق ۷ ب

۴۔ ایضاً

مرتب کیا ہے، اس کی مثال ملفوظات نویسی کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس عہد میں مرتب ہونے والے ملفوظات میں قصے کہانیوں کی بھرمار ہے لیکن حماد کاشانی نے اس پرانی ڈگر سے ہٹ کر قلم اٹھایا ہے اور اسے خانقاہی نظام کا دستور العمل بنا دیا ہے۔

حضرت برہان الدین غریب کی عمر کا بیشتر حصہ حضرت سلطان المشائخ کی صحبت میں گزرا تھا۔ اس لئے احسن الاقوال میں سلطان المشائخ کے بارے میں اہم معلومات ملتی ہیں۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان المشائخ کے سوانح نگاروں میں سے کسی نے بھی اس تصنیف سے استفادہ نہیں کیا حالانکہ حضرت برہان الدین غریب بہت سے واقعات کے عینی شاہد ہیں اس طرح انہوں نے سلطان المشائخ سے بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے بارے میں کتنی باتیں سنی تھیں انہیں بھی سند کا درجہ حاصل ہے اس لئے بابا صاحب کا کوئی سوانح نگار احسن الاقوال سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔

اگر کسی شخص نے اس عہد کی چشتی خانقاہ میں رہنے والے درویشوں کے شب و روز کے آداب و مشاغل کا مطالعہ کرنا ہو، تو اسے احسن الاقوال سے بہتر کتاب نہیں مل سکتی۔

حماد کاشانی نے احسن الاقوال میں حضرت برہان الدین غریب کے ۲۹ اقوال مختلف عنوانات کے تحت نقل کئے ہیں۔ جہاں کہیں حضرت کا ذکر آتا ہے فاضل مرتب ان کے نام کے بعد "طیب اللہ قبرہ باحسن الطیب" کے دعائیہ کلمات ضرور لکھتا ہے۔

**قول اول:۔** حماد کاشانی نے قول اول پر "روشہائے اصحاب

طریقت وسنن ارباب طریقت" کا عنوان لگایا ہے۔ اس کے تحت موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین فرمایا کرتے تھے کہ جب مرید پیر کے پاس موجود ہو تو اس کے لئے پیر کے مشاہدہ سے بڑھ کر اور کوئی مشغولیت نہیں ہونی چاہیے۔ اُسے، اسے ہی سب سے بڑا شغل سمجھنا چاہیئے۔ اگر مرید کہیں دور رہتا ہو اور اسے پیر کی صحبت میسر نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ تصوف کی کسی کتاب کے چند صفحات روز پڑھ لیا کرے۔[1]

حضرت برہان الدین فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص دن میں ۷۵ بار سورہ الم نشرح پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دے گا۔

قرون وسطیٰ میں مسافر عموماً سراؤں یا خانقاہوں میں قیام کیا کرتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مسافر کا حق لنگر خانے میں تین دن تک ہے۔ اس کے بعد اسے کوئی کام کرنا چاہیئے۔ وہ یا تو ہمہ تن عبادت میں مشغول ہو جائے یا لنگر میں ہاتھ بٹائے یا وہاں سے رخصت ہو جائے۔[2]

حضرت اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی درویش کی ملاقات کو جائے تو جیسا وہ درویش کرے ویسا ہی ملاقاتی بھی کرے۔ اگر درویش قیلولہ کر رہا ہو تو ملاقاتی بھی وہاں جا

---

[1] احسن الاقوال، ورق ۷ الف

[2] ایضاً

کر لیٹ جائے۔ اگر وہ عبادت میں مشغول ہو تو یہ بھی وہاں جاتے ہی عبادت میں مشغول ہو جائے۔ اسی طرح اگر درویش عمارت تعمیر کر رہا ہو تو زائر بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے۔[1]

اگر کوئی درویش کسی کو گھڑا، کوزہ یا لوٹا دینا چاہے تو اسے چاہیئے کہ وہ خالی نہ دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی درویش کے لئے طشت یا چھاگل لے جائے تو اس میں کوئی چیز ضرور ڈال لے اگر کوئی چیز میسر نہ ہو تو تازہ پھل، خربوزہ یا کھیرہ ہی رکھ لے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر اس میں ایک سکہ ہی رکھ کر لے جائے۔[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش کو کسی سے دستانے اور سونے یا چاندی کی انگوٹھی قبول نہیں کرنی چاہیئے۔ جب حماد کاشانی کے دو بھائی حضرت سے بیعت ہوئے تو انہوں نے اپنی طلائی انگوٹھیاں حضرت کی خدمت میں پیش کیں۔ حضرت نے فرمایا کہ انہیں بیچ کر جو رقم ملے اسے حضرت سلطان المشائخ کے ایصال ثواب کے لئے خرچ کر دیں۔[3]

درویش کو چاہیئے کہ وہ کسی کی امانت نہ رکھے اور نہ کسی کا ضامن ہی بنے۔ اسی طرح وہ کسی دستاویز پر بھی اپنی گواہی نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ نیکی کرے تو احسان مند جاب میں

---

[1] احسن الاقوال ورق ۶ ب

[2] ایضاً ورق ۱۱ ب

[3] ایضاً ورق ۷، ب

جزاک اللہ ضرور کہے۔ ایک روز خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مجاور حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا کہ لوگ اسے چیزیں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں کیا کیا کرے؟ سلطان جی نے فرمایا کہ اگر وہ جزاک اللہ کہہ دیا کرے تو حق ادا ہو جائے گا۔[1]

حضرت برہان الدین غریب فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جی استراحت فرما رہے تھے کہ ایک مسافر آیا اور خدام سے کہنے لگا کہ اس نے گھوڑا خریدا ہے اور وہ اس خوشی میں کچھ رقم سلطان جی کی نذر کرنا چاہتا ہے۔ خدام نے کہا کہ وہ تو اس وقت آرام فرما رہے ہیں لہذا وہ رقم انہیں دے دے۔ اس نے وہ رقم حاضرین میں بانٹ دی۔ اتفاق سے چند روز بعد اس کا گھوڑا کھو گیا۔ وہ پریشان حال سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام قصہ انہیں سنایا۔ حضرت نے فرمایا جن لوگوں نے اس سے روپے لئے تھے ان سے کہے گھوڑا لا کر دیں۔ حاضرین نے کہا انہیں کیا خبر کہ گھوڑا کہاں ہے؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ درویش کسی کی چیز ضائع نہیں کرتے اگر انہیں کوئی ایک جیتل دے تو وہ اس کا دس جیتل کا کام کرتے ہیں۔ تب کہیں اس جیتل پر ان کا حق بنتا ہے۔[2]

ایک روز ایک شخص نے سلطان جی کی خدمت میں ایک تنکہ

---

۱۔ احسن الاقوال، ورق ۸ ب

۲۔ ایضاً، ورق ۶ الف

پیش کیا۔ اتفاق سے چند ہی روز بعد وہ شخص بیمار ہو گیا۔ حضرت کو جونہی اس کی علالت کی اطلاع ملی تو انہوں نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اس کا دیا ہوا تنکہ اب تک ان کے دل میں اٹکا ہوا ہے لہذا اس کے لئے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اسے صحت عطا فرمائے۔[1]

حضرت برہان الدین غریب فرماتے ہیں کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پیر اپنے مرید کے اور استاد اپنے شاگرد کے سامنے کھڑا نہ ہو۔

دہلی میں عماد الدین تیرگر نام کا ایک شخص رہتا تھا اور اسے حضرت بہاوالدین زکریا کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ ایک روز ایک شخص دہلی سے ملتان جا رہا تھا۔ عماد الدین نے اس کے ہاتھ حضرت زکریا کے لئے نقدی روانہ کی جب وہ شخص اجودھن پہنچا تو بابا فرید الدین سے بھی ملا۔ اس نے بابا صاحب سے کہا کہ عماد الدین نے جو نقدی اسے دی ہے وہ بابا صاحب لے لیں۔ وہ حضرت زکریا کی خدمت میں کوئی اور چیز پیش کر دے گا۔ اس پر بابا صاحب نے فرمایا کہ وہ راستے میں رہزن بن کر نہیں بیٹھے۔ جب وہ کسی دوسرے کو نقدی دینے کی نیت کر کے چلا ہے تو وہ اسے کیوں کر قبول کر لیں۔[2]

حضرت برہان الدین کے زمانے میں درویش کے لئے سب سے معتبر قسم یہ تھی کہ وہ اپنے شیخ کے مصلے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے۔[3]

---

۱۔ احسن الاقوال، ورق ۶ الف

۲۔ ایضاً ورق ۸ ب

۳۔ ایضاً ورق ۹ الف

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک مرید جب سفر سے واپس آئے تو پہلے اپنے شیخ سے ملے جائے۔ پھر اپنے گھر جائے۔ اسی طرح جب سفر پر روانہ ہو تو اپنے اہل خانہ سے وداع ہو کر شیخ کی خدمت میں حاضری دے اور وہیں سے سفر پر روانہ ہو جائے[۱]

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت نظام الدین نے شیخ نصیر الدین محمود اودھی کو اودھ جانے کے لئے وداع کیا تو انہوں نے کسی سے کہا کہ ان کی قیام گاہ پر جو گھوڑا بندھا ہوا ہے اسے فلاں جگہ پہنچا دے کیونکہ شیخ سے وداع ہونے کے بعد اپنی قیام گاہ پر جانا ادب کے منافی ہے[۲]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر دو آدمی مل کر ایک ہی برتن میں کھانا تناول کر رہے ہوں اور ان میں سے کوئی کسی کام کے لئے اٹھ جائے تو دوسرے کو چاہیے کہ وہ بھی اتنی دیر کے لئے کھانے سے ہاتھ کھینچ لے[۳]

حضرت فرماتے ہیں کہ شیخ کو مرید کی تربیت صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر کرنی چاہیے۔ شیخ میں لالچ اور بخل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر خدا اسے القا کرے کہ فلاں نعمت فلاں مرید کو دے دے تو اس میں بخل سے کام نہ لے[۴]

---

۱۔ احسن الاقوال، ورق ۹ الف ۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً ورق ۱۰ ب
۴۔ ایضاً

اگر شیخ کی خانقاہ میں مسافر آکر ٹھہرے تو خادم کو چاہیئے کہ اسے پانی کی جگہ اور قدمچا (بیت الخلا) دکھا دے۔ ادب کا یہ تقاضا ہے کہ مسافر خانقاہ سے بازار جائے تو واپسی پر خالی ہاتھ نہ آئے اگر اور کچھ میسر نہ ہو تو ایک کھیرا یا ککڑی ہی لیتا آئے[۱] حضرت فرماتے ہیں کہ ملک قبیر جب بھی سلطان جی کی خدمت میں آتا تو ایک کدو خانقاہ کے لئے ضرور لاتا اور سلطان جی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور لاتا۔ حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ یہ روش لازم نہیں ہے لیکن مستحب ہے[۲]

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی شہر سے غیاث پور کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ ایک خالی خوانچہ سر پر رکھے سلطان جی کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ درویشوں کے پاس خالی ہاتھ نہیں جاتے اگر اور کچھ نہیں تو دو جیتل کے نان خرید کر خوانچہ میں رکھ لے، اسی طرح خالی پیالے میں شربت یا مصری ڈال لینی چاہیے۔ اگر کوئی شخص پاندان شیخ کی خدمت میں پیش کرنا چاہے تو اس میں پان رکھ لے[۳]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویشوں کے لئے چھری یا استرا نہیں لے جانا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص یہ دونوں چیزیں درویش کے لئے

---

۱۔ کھیرا اور ککڑی ان دنوں بڑے گراں ہیں۔ اس زمانے میں یہ کوڑیوں کے بھاؤ فروخت ہوا کرتے تھے۔

۲۔ احسن الاقوال، ورق ۱۱ الف ۳۔ ایضاً ورق ۱۱ ب

لائے تو اسے چاہیئے کہ ایک سوئی بھی ساتھ لائے۔ اس لئے کہ چھری اور استرا کاٹنے کے اوزار ہیں اور سوئی جوڑنے کے کام آتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی درویش کی خدمت میں صرف چھری پیش کرنا چاہے تو وہ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی ساتھ لائے۔ اسی طرح سوئی کے ساتھ دھاگا بھی ہونا چاہیئے[1]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ایک مسافر شیخ جمال الدین ہانسوی سے ملنے آیا۔ شیخ اس وقت مسجد میں تھے وہ انہیں تلاش کرتے کرتے وہاں پہنچا۔ شیخ نے نماز سے فارغ ہوتے ہی نفلوں کی نیت باندھ لی۔ مسافر نے اپنا مصلا لپیٹا اور چلنے لگا۔ شیخ نے جلدی سے سلام پھیرا اور معذرت چاہی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مسافر کو زیادہ دیر تک انتظار میں نہیں رکھنا چاہیئے۔ مقیم پر واجب ہے کہ مسافر کو انتظار کی زحمت نہ دے[2]

اگر کوئی شیخ کسی شخص کو کسی کے ہاں بھیجے اور صاحب خانہ اس کے ہاتھ شیخ کے لئے کپڑے، نقدی یا شیرینی وغیرہ بھیجے تو شیخ انہیں قبول نہ کرے۔ اسے چاہیے کہ ان پر فاتحہ پڑھ کر واپس لوٹا دے[3]

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش کو باریک کپڑے نہیں پہننے

---

۱۔ احسن الاقوال، ورق ۱۳ الف

۲۔ ایضاً ورق ۱۱ الف

۳۔ ایضاً

چاہییں۔ درویش کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کبھی خلوتی ہوتا ہے اور کبھی جلوتی۔ اس زمانے میں نیلا لباس زیب تن کرنا یا کسی مجلس میں بلند آواز میں قرآن پڑھنا لوگوں سے سوال کرنے کے مترادف تھا۔ اس لئے ان دونوں کاموں سے احتراز کرنا چاہیئے[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے ہاں مسافر آئے تو صاحب خانہ اسے دو گرم چیزیں فوراً فراہم کرے۔

۱۔ ہاتھ منہ دھونے کے لئے گرم پانی

۲۔ گرم شوربا

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ درویشوں کے پاس تین اوقات میں نہیں آنا چاہیئے۔

۱۔ نماز اشراق سے قبل

۲۔ دوپہر کو قیلولہ کے وقت

۳۔ نماز عصر کے بعد[2]

جامع ملفوظات تحریر فرماتے ہیں کہ ایک روز شیخ داؤد حسن شیرازی حضرت برہان الدین غریب سے کہنے لگے کہ ان کے پاس لوگ آتے ہیں تو ان کے اوراد و وظائف فوت ہو جاتے ہیں۔ ان کی بات سن کر حضرت نے فرمایا:

اذا جاء الاخوان سقطت النوافل

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۱۴ الف

۲۔ ایضاً ورق ۱۲ الف

شیرازی نے دوبارہ وہی جملہ دہرایا تو حضرت نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص ملنے آئے تو اس کے سامنے کلمہ حق کہنا چاہیے اور کلمہ حق کہنے سے اگر اوراد فوت ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کے کام کے لئے آئے تو اسے کام میں لگا دے اور اوراد و وظائف فوت نہ کرے[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسافر نماز عصر کے بعد شہر میں داخل ہو تو وہ سیدھا لنگر میں نہ جائے وہ رات کو کسی دوسری جگہ قیام کرے اور اگلی صبح اشراق کے بعد لنگر میں داخل ہو[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص نئے کپڑے پہنے تو اسے مبارکباد دینی چاہیے۔ درویش کا مہمان اگر بیمار ہو جائے تو جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائے اسے اپنے ہاں سے جانے نہ دے۔ ایک بار خواجہ مبارک معروف جنہیں حضرت شیخ کامل کہا کرتے تھے، حضرت کے ہاں آکر ٹھہرے۔ چند دن بعد ان کی آنکھ میں تکلیف ہو گئی۔ انہوں نے حضرت سے اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک صحت یاب نہ ہو جائے اس وقت تک اجازت نہیں ملے گی۔ تکلیف چونکہ ان کے گھر میں شروع ہوئی ہے اس لئے صحت بھی یہیں ہونی چاہیے[3]

---

[1] احسن الاقوال ورق ۱۲ الف

[2] ایضاً ورق ۱۳ ب

[3] ایضاً ورق ۱۵ الف

حضرت فرماتے ہیں کہ قبرستان سے سیدھا کسی مریض کی عیادت کو نہ جائے راستے میں اگر کوئی مسجد نظر آئے تو تھوڑی دیر کے لئے وہاں رک جائے یا تھوڑی دیر کے لئے کسی جگہ بیٹھ جائے، پانی پئے اور پھر جائے[1]

قول اول، جس میں آداب مجلس منقول ہیں بڑا طویل ہے اور یہ دس ورقوں پر پھیلا ہوا ہے اسے اس عہد کی مجلسی زندگی کا مرقع سمجھنا چاہیے۔

## قول دوم:

”دررعایت آداب مجلس مشائخ بر جادہ و اولیای صاحب سجادہ“

اس عنوان کے تحت حضرت برہان الدین غریب فرماتے ہیں کہ جب کسی شیخ کی مجلس میں دستر خوان بچھایا جائے تو خادم کو چاہیے کہ وہ پہلے حاضرین کے ہاتھ دھلائے اور پھر اپنے ہاتھ دھوئے دستر خوان پر شیخ کے سامنے نمکدان رکھنا چاہیے اور دستر خوان کے کونوں پر زیادہ روٹیاں رکھنی چاہئیں۔ جب خادم ’بسم اللہ‘ کہے تب حاضرین کھانا شروع کریں۔ سب سے پہلے ایک چٹکی نمک کی اپنے منہ میں رکھیں، پھر شوربہ استعمال کریں۔ اگر کوئی شخص چمچے سے کھانا تناول کرے تو آداب مجلس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنا چمچہ مشترکہ پیالے میں نہ ڈالے تاکہ لوگ کراہت محسوس نہ کریں۔ لقمہ ہمیشہ دائیں جبڑے سے چبانا چاہیے اور بائیں جبڑے سے لقمہ چبانے سے احتراز کرنا

---

[1] احسن الاقوال ورق ۱۵ الف

چاہیئے۔[1]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ درویش کی مجلس میں کوئی شخص بائیں طرف کے دانتوں سے لقمہ چبا رہا تھا۔ درویش نے اس سے پوچھا کہ وہ کس بزرگ کا مرید ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے دائیں طرف کے دانتوں میں تکلیف ہے اس لئے وہ مجبوراً بائیں جبڑے سے لقمہ چبا رہا ہے۔[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ کسی شخص سے یہ نہیں پوچھنا چاہیئے کہ وہ کس کا مرید ہے، کیونکہ اس سے اس کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ ایک بار امیر خسروؒ سے کسی نے پوچھا کہ وہ کن کے مرید ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ان سے کون سی بے ادبی ہوئی ہے جو وہ ایسا سوال کر رہا ہے۔[3]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ہر لقمہ منہ میں رکھتے وقت بسم اللہ کہنی چاہیئے۔ جب کھانا ختم ہو جائے تو الحمد للہ کہے۔ کھانے کے دوران میں پانی نہ پیا جائے کیونکہ داہنا ہاتھ آلودہ ہوتا ہے اور اس سے گلاس بھی خراب ہو جائے گا اور اس میں کھانے کے ریزے بھی گر جائیں گے۔ بائیں ہاتھ سے پانی پینا منع ہے۔ درویشوں کے ہاں یہ رواج ہے کہ وہ دستر خوان پر شوربا پیش کرتے ہیں تاکہ حلق خشک نہ ہو اور پانی پینے کی نوبت نہ آئے۔ اگر کسی

---

[1] احسن الاقوال، ورق ۱۶ الف

[2] ایضاً

[3] ایضاً

شخص کو ضرورت پڑے تو وہ شوربا ہی پی لے پانی نہ پیئے۔ کھانے کے دوران میں سلام کا جواب نہ دے، کیونکہ درویشوں کے ہاں کھانا بھی عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت میں مخل ہونا مناسب نہیں۔[1]

ایک بار ایک شخص حضرت برہان الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت موصوف کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اس نے سلام کیا۔ حاضرین خاموش رہے۔ وہ شخص بھی کھانے میں شریک ہو گیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد حضرت نے اس کی تعظیم کی اور فرمایا کہ درویشوں کا یہی طریقہ ہے جو اس شخص نے اختیار کیا تھا۔[2]

درویش کے لئے لازم ہے کہ وہ دستر خوان پر ہی روٹی توڑے اور جب تک ایک روٹی ختم نہ ہو جاتی دوسری روٹی نہ اٹھائے۔ دستر خوان پر روٹیوں کے ٹکڑے کرنے مناسب نہیں ہیں اور نہ کوئی ٹکڑا باقی چھوڑنا مناسب ہے دستر خوان سے ٹکڑے اٹھا کر کھانے میں بڑی فضیلت ہے۔[3]

ایک بار خواجہ شمس الملک حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اتنے میں ایک بلی کے بولنے کی آواز آئی۔ شمس الملک نے بلی کی آواز سن کر روٹی کا ایک ٹکڑا

---

[1] احسن الاقوال، ورق ۱۷ الف

[2] ایضاً

[3] ایضاً

اس کے آگے ڈال دیا۔ شیخ نے کہا کہ تمہیں اس کی اجازت ہے لیکن یہ کام خادم کو کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے علاوہ کسی کے لئے یہ روا نہیں ہے کہ میزبان کی اجازت کے بغیر کسی کو لقمہ دے۔[1]

اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ خادم اور شیخ کو پھل اور کھانے کا دوگنا حصہ دیا جاتا تھا۔ تاکہ اگر کوئی شخص بعد میں آئے تو اسے بھی دے سکیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ درویش بے وضو کھانا نہ کھائیں کیونکہ ان کے نزدیک اس سے زیادہ بری اور کوئی بات نہیں ہے۔ اگر کسی کے حصے میں کھانے میں کوئی کڑوی چیز آ جائے تو اسے چاہیئے کہ اسے بلا کراہت کھالے، کیونکہ وہ اس کے حصے میں آئی ہے۔ مولانا یوسف چندیری مجلس میں کڑوا کھیرا اس طرح مزے سے کھایا کرتے تھے جیسے حلوہ کھا رہے ہوں۔[2]

درویشوں کی مجلس میں کوئی شخص کلی کرتے وقت آواز نہ نکالے ورنہ پانی دستر خوان پر گرے گا اور اس سے کراہیت پیدا ہوگی کھانے کے بعد حاضرین کو خلال مہیا کئے جائیں، جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین کے ہاں خلال دینے کی خدمت لطیف الدین کے ذمے تھی۔[3]

---

۱۔ ایضاً، ورق ۱۷ب

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ورق ۱۹ب

کھانے کے بعد ہاتھ دھلانے کا یہ طریقہ ہے کہ پہلے خادم اپنے ہاتھ دھوتے اور پھر دوسروں کے ہاتھ دھلاتے۔ حضرت برہان الدین ہاتھ دھوتے وقت دو بار سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت نصیر الدین محمود کے استفسار پر انہوں نے فرمایا کہ موصوف ایک بار فاتحہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور دوسری بار سلطان جی کی روح کو ایصال ثواب کے لئے پڑھتے ہیں۔[1]

ہاتھ دھونے کے بعد پان پیش کیا جاتا تھا۔ پان کھانے کے آداب یہ تھے کہ خالی پان منہ میں رکھے اور پان منہ میں ڈالتے وقت منہ زیادہ نہ کھولے تاکہ دوسروں کی نظر نہ پڑے۔ پان منہ میں رکھنے کے بعد چھالیہ منہ میں ڈالے اور اس بات کا خیال رکھے کہ ساری چھالیہ منہ میں ایک دم نہ ڈال دے بلکہ ایک ایک ٹکڑا کر کے ڈالے۔[2]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ اگر کسی مجلس میں محلوق اور مجعد دو طرح کے لوگ جمع ہوں تو مجعد کو محلوق پر فضیلت دی جائے۔[3] جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ حضرت برہان الدین کے ہاں نمکدان کو "ابوالفتح" اور دستر خوان کو "بساط الرحمت" کہا کرتے تھے۔ اسی طرح روٹی کو بقیہ بساط الرحمت اور کسرۃ یا فضلہ کا نام دیا گیا تھا۔[4]

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۲۰ الف

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً ورق ۱۸ الف

۴۔ ایضاً ورق ۱۹ الف

حماد کاشانی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حضرت کے سامنے سلطان جی کی مریدی کا دعویٰ کرتا تو حضرت فرماتے اس پر گواہ لاؤ یعنی سلطان جی کے اخلاق میں سے کوئی چیز پیش کرو۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان لوگوں کو خلال دیا جائے تو انہیں خلال کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے اور دعویٰ کرتے ہیں سلطان جی کی مریدی کا[1] (اس سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ شیخ اپنے مریدوں کی کس انداز سے تربیت کیا کرتے تھے)۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو چاہیئے کہ جب وہ پیر کی خدمت میں آئے تو بائیں طرف سے نہ آئے۔ سامنے سے آئے اور سلام عرض کرے۔ وہ جتنی دیر وہاں رہے اپنی نظریں نیچی رکھے اور زیادہ باتیں نہ کرے، شیخ جو بات پوچھے صرف اسی کا جواب دے اور واپسی پر شیخ کی طرف پشت نہ کرے[2]

### قول سوم :

در حسن عقیدۂ اصحاب اعتقاد

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جی نے آئینہ دیکھا تو ریش میں ایک سفید بال نظر آیا۔ اسے دیکھ کر سلطان جی نے فرمایا "الحمد للہ میں نے ایک سیاہ بال بابا صاحب کی خدمت میں بھیج دیا ہے"[3]

---

[1] احسن الاقوال ورق ۱۹ ب

[2] ایضاً ورق ۲۰ ب

[3] ایضاً ورق ۲۲ الف

ایک روز مولانا فریدالدین، حضرت کے دسترخوان پر موجود تھے انہوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور کھانے سے فراغت کے بعد کہنے لگے، آپ کا کھانا "محی دل" ہے اور جنت کا کھانا "محی نفس" ہوگا۔ اس لئے یہ اس سے افضل ہے[1]

جامع ملفوظات حماد بن عماد کاشانی کے بھائی رکن الدین کو سلطان نے دہلی سے دولت آباد جانے کا حکم دیا۔ وہ ڈاک کے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ حماد لکھتے ہیں کہ دوران سفر وہ ہر صبح نماز فجر کے بعد دہلی کی طرف رخ کر کے اپنا چہرہ زمین پر ملا کرتے تھے۔ حماد کاشانی اس پر شاہد ہے کہ جب کبھی خواجہ قطب الدین دبیر، سلطان جی کے مزار کی زیارت کے لئے جاتا تو گنبد پر نظر پڑتے ہی اپنا چہرہ زمین پر ملتا اس نے کبھی غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین)، کی طرف منہ کر کے نہیں تھوکا تھا[2]

### قول چہارم :

در آداب آمدن مرید در خدمت پیر و رعایت آداب در وقت تقریر۔

ایک بار حضرت برہان الدین غریبؒ سلطان جی کی زیارت کے لئے دہلی سے غیاث پور کی طرف روانہ ہوئے راستے میں ان کا ایک واقف کار انہیں زبردستی اپنے گھر لے گیا اور ناشتہ کرایا۔ حضرت ناشتے

---

[1] احسن الاقوال ورق ۲۲ ب

[2] ایضاً ورق ۲۳ ب

سے فارغ ہوکر غیاث پور کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ بھول گئے۔ ان دونوں دلّی اور غیاث پور کے درمیان رہزن مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ حضرت کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ان کے کپڑے ہی نہ اتروالیں۔ حضرت اس طرف سے کئی بار گزرے تھے۔ اس کے باوجود راہ گم کر بیٹھے اور باوجود کوشش کے انہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ معاً ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ اپنے گھر سے سلطان جی سے ملنے کی نیت کر کے نکلے تھے لیکن راستے میں کسی واقف کار کے ہاں چلے گئے یہ اس کی بد نیتی کا ثمر ہے۔ انہوں نے فوراً توبہ کی تو انہیں راستہ مل گیا[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ جب کبھی خواجہ شمس الدین، سلطان جی کی زیارت کو جاتے تو دونوں ہاتھ آگے باندھ کر چلتے۔

**قول پنجم: در آداب بیعت**

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ بیعت کے دن عقیدت مند روزہ رکھے، صدقہ دے اور نماز ادا کرے شیخ عقیدت مند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے:

عہد کردی با این شکستہ و خواجۂ
این شکستہ و خواجۂ خواجہ این
شکستہ و خواجگان چشت و
تابعین و تبع تابعین و بارسول
رب العلمین و با حاملان عرش و

---

[1] احسن الاقوال ورق ۲۵ الف

با حضرت پاک جل وعلا چشم نگاہداری
و زبان نگاہداری، بد کسے را نگوئی
و بد کسی را نہ اندیشی و کسی را مضرتی
نرسانی و گرد مناہی نگردی و بر
جادہ شرع باشی، ہمیں جملہ
عہد کردی و ہمیں شرط باشی[1]

ترجمہ: کیا تو اس شکستہ، اس شکستہ کے مرشد اور اس شکستہ کے مرشد کے شیخ، خواجگان چشت، تابعین، تبع تابعین رسول رب العالمین، حاملان عرش اور اللہ جل شانہ سے یہ عہد کرتا ہے کہ اپنی نگاہ اور زبان پر قابو رکھے گا۔ کسی کی بدگوئی نہیں کرے گا، کسی کا برا نہیں سوچے گا، کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا، برے کاموں سے اجتناب کریگا اور جادہ شرع پر قائم رہے گا۔ تو ان سب باتوں کا عہد کرتا ہے اور ان شرائط پر قائم رہے گا۔

مرید کہے کہ وہ ان سب باتوں پر عمل کرنے کا عہد کرتا ہے۔

اس کے بعد شیخ قینچی لے کر اس کے سر کے دائیں جانب سے اور پھر بائیں جانب سے تھوڑے سے بال کاٹے اور سر پر ٹوپی پہنا دے۔ ٹوپی پہناتے وقت شیخ کہے:

بسم اللہ الرَّحمٰنِ الرَّحیم، ھذا اللباس

---

[1] احسن الاقوال، ورق ۲۶ الف ۲۶ ب

التقویٰ و لباس العافیۃ

مرید اپنا سر شیخ کے قدموں پر رکھ دے اور اس کے بعد دوگانہ ادا کرے۔ دوگانہ ادا کرنے کے بعد مرید حاضرین مجلس کے ساتھ مصافحہ کرے۔ بعد ازاں شیخ اسے اس کی قابلیت کے مطابق تلقین کرے[1]

حضرت برھان الدین فرماتے ہیں کہ بیعت کے لئے تین چیزیں شرط ہیں:

۱۔ حلق یا قصر

۲۔ کلاہ

۳۔ اقرار بیعت

اگر ان میں ایک بھی رہ جائے تو بیعت نہ ہوگی[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ جس روز سلطان جی نے انہیں بیعت کیا تھا اس روز انہیں حفظ ایمان اور ادابین کی تلقین کی۔ حضرت نے بیعت ہوتے وقت سلطان جی سے پوچھا کہ وہ حلق کرائیں یا قصر؟ سلطان جی نے فرمایا کہ ہر بال کی جڑ میں شیطان کا محل ہے اس لئے وہ حلق کروائیں۔ بابا فرید الدین مسعودؒ نے سلطان جی کو بھی حلق کا حکم دیا تھا اور اس وقت یہ حدیث پڑھی تھی:

ان الشیطان تحت کل شعرة[3]

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۲۶ ب

۲۔ ایضاً ورق ۲۶ الف

۳ ایضاً ورق ۲۷ الف

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جس شخص کے سر پر مقراض چل جائے اس کے لئے بال رکھنے حرام ہیں۔ ایک مجلس میں خواجہ غوری نے حضرت سے پوچھا کہ کتنے عرصے بعد حلق کروانا چاہیئے؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہفتے میں دوبار[1]

حماد بن عماد کاشانی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت برہان الدین سے بیعت ہونا چاہتے تھے لیکن وہ شرفِ بیعت حاصل کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔ ایک روز حماد نے حضرت سے اس کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی نیت چونکہ نیک تھی اس لئے وہ مرید کو اپنی فرزندی میں قبول کرتے ہیں[2]

## قول ششم: در بیان لباس

قول ششم کے تحت جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ایک بار لکھنوتی سے کسی عقیدت مند نے سلطان جی کے لئے لباس تیار کروا کے بھیجا تو انہوں نے اسے دیکھتے ہی فرمایا کہ انہوں نے بابا صاحب کو کبھی ایسے لباس میں نہیں دیکھا اس لئے وہ کیوں کر اسے پہن سکتے ہیں۔ اتفاق سے اس مجلس میں بابا صاحب کا ایک مرید بھی موجود تھا اس نے کہا کہ اس نے بابا صاحب کو اس لباس میں دیکھا ہے۔ سلطان جی نے فرمایا "پھر

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۲۷ ب۔ مخدوم جہانیاںؒ الدر المنظوم میں فرماتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بیوی کی رضا مندی کے بغیر حلق نہ کروائے۔ (الدر المنظوم مطبوعہ ملتان ۱۳۷۷ھ ص ۲۲۱

۲۔ احسن الاقوال ورق ۲۸ الف

میں یہ لباس پہن لیتا ہوں۔ اب تم ذمہ دار ہو[1]

**قول ہفتم : دربیان محافظت خلعت و نفائس پیر**

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جب وہ دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے ساتھیوں نے چارپائی کو ڈولی میں تبدیل کر کے انہیں اس میں بٹھا لیا۔ ان کے پاس سلطان جی کا ایک عصا تھا۔ انہوں نے اس کو ڈولی کے ایک طرف باندھ لیا اور اسے ہی بدرقہ سمجھتے رہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ موصوف دوران سفر اسی کی پناہ میں رہے[2]

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر مرید کے پاس اپنے پیر کے جوتے ہوں تو دوران سفر انہیں اپنے سر پر دھر لے اور رات کو سوتے وقت انہیں سینے پر رکھ لے۔ حضرت نظام الدین نے خواجہ قطب الدین دبیر کو اپنا شب خوابی کا لباس عطا فرمایا تھا، خواجہ نے اسے سقف میں لٹکا لیا اور رات کو اسی کے نیچے سونے لگا[3]

**قول ہشتم : دربیان معاملہ نفس امارہ و فضائل ناہموارہ**

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت بایزید بسطامی قبرستان سے گزرے وہاں ایک عورت ایک قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، موصوف بھی اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگے۔ کسی راہ گیر نے ان سے کہا کہ وہ عورت تو اپنے کسی عزیز کو یاد کر کے رو رہی ہے حضرت کس کو رو

---

۱. احسن الاقوال ورق ۲۹ ب۔ اس کپڑے کا نام جمہر تلی لکھا ہے۔

۲۔ ایضاً ورق ۳۲ الف

۳۔ ایضاً

رہے ہیں ؟ حضرت نے فرمایا کہ وہ اپنے مردہ دل کو رو رہے ہیں[1]

حضرت برہان الدین نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مولانا وجیہ الدین یوسف فرمایا کرتے تھے کہ وہ جب بھی نفس کے کسی عیب کو ختم کرتے ہیں تو دوسرے عیب سر اٹھاتے ہیں۔

**قول نہم : دربیان حسن معاملہ**

حضرت برہان الدین کے زمانے میں ایک چادر دس گیارہ جیتل میں آجاتی تھی اور بیچنے والا ایک جیتل نفع کماتا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ اس سے زیادہ نفع کمانا جائز نہیں سمجھتے تھے[2]

**قول دہم : دربیان فضیلت محاسن**

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ایک بچے نے بایزید کو بلایا۔ موصوف اس کی طرف بڑھے اتفاق سے دروازے پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ اس نے انہیں واپس کر دیا۔ بچے نے کئی بار انہیں بلایا اور موصوف ہر بار اس کے بلانے پر اس کی طرف متوجہ ہوتے لیکن دروازے تک جا کر واپس لوٹ جاتے۔ ایک شخص نے، جو یہ منظر دیکھ رہا تھا، ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ کیا تماشہ لگا رکھا ہے ؟ حضرت بایزید نے فرمایا کہ وہ بچے کے بلانے پر اسے خوش کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور معمر بزرگ کے فرمان کا خیال کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں[3]

---

۱. احسن الاقوال، ورق ۳۴ الف

۲۔ ایضاً ورق ۳۵ الف

۳۔ ایضاً ورق ۳۶ الف

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک روز سلطان جی نماز ادا کر رہے تھے کہ شیطان نے ان کا کان کھجایا۔ حضرت نے انہیں مخاطب کر کے کہا "اے جوانمرد لیس کر" حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ یہ سلطان جی کا اخلاق تھا کہ موصوف شیطان کو بھی جوانمرد کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے[1]

## قول یازدہم: دربیان اظہار عقیدت اصفیا و اخبار کرامت اولیاً

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی نے امیر خسرو کو کیلوکھڑی کے کوتوال کے نام ایک سفارشی خط دیا۔ امیر وہ خط لے کر کوتوال کے پاس گئے۔ اتفاق سے اس وقت وہ دریا کے کنارے بیٹھا تھا اس نے وہ خط پڑھ کر دریا میں پھینک دیا۔ امیر خسرو نے واپس آکر سارا واقعہ سلطان جی کے گوش گزار کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ "او خود را در آبِ روان کرد" اگلے روز شیطان نے کوتوال کو قلعے کی دیوار سے اٹھا کر دریا میں پھینک دیا[2]

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ سلطان علاؤ الدین کا فرزند خضر خاں سلطان جی کا مرید ہو گیا۔ ایک روز اس کے ساتھیوں نے مجلس طرب آراستہ کی اور شراب کا ایک جام اس کی طرف بڑھایا۔ خضر خاں اس جام کو لبوں سے لگایا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دیکھا کہ سلطان جی انگشت بدنداں وہاں کھڑے ہیں۔ خضر خاں نے جام صراحی پر دے مارا اور مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت فرمانے لگے،

---

[1] احسن الاقوال ورق ٣٦ ب

[2] ایضاً ورق ٣٧ ب

"خواجگان ما فرزندان خود را در معصیت افتادن نگزارند۔ اگر در معصیت باشند از جہان زوند تا طاب نشوند"[1]

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک بار کسی شخص نے سلطان جی کی محفل میں بایزید بسطامی کی بزرگی کا ذکر کیا۔ اس پر سلطان جی نے فرمایا "ہمارے ہاں بھی بایزید ہے" حاضرین نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ سلطان جی نے فرمایا "اس وقت وہ جماعت خانہ میں ہے" ان کا خادم خاص اقبال فوراً جماعت خانہ پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا اتنے میں حضرت برہان الدین وہاں پہنچ گئے۔ اقبال نے ان سے کہا کہ سلطان جی نے ابھی ابھی ان کے بارے میں اس بڑے کا اظہار کیا ہے[2]

## قول دوازدہم: درفضیلت صائم و صوم

حماد کاشانی کی روایت ہے کہ حضرت برہان الدین غریبؒ داؤدی روزہ رکھا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت نے فرمایا کہ روزے سے چار چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ روزے سے خاموشی حاصل ہوتی ہے اور خاموشی سے فکر پیدا ہوتا ہے اسی فکر سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور معرفت کے ذریعے ہی یار تک پہنچتے ہیں[3]

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ روزہ دار سحری ضرور کھائے خواہ وہ

---

[1] احسن الاقوال ورق ٣٩ ب

[2] ایضاً ورق ۴٠ الف

[3] ایضاً

پانی کا ایک گھونٹ ہی کیوں نہ ہو۔

## قول سیزدہم : دربیان صدق وصفا

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ جو شخص جھوٹ سے احتراز کرے گا، وہ جو بات زبان پر لائے گا ویسا ہی ہوگا۔ اس ضمن میں انہوں نے بابا فریدالدین گنج شکرؒ اور والیٔ ملتان کی خط وکتابت کا بھی ذکر کیا ہے۔[1]

## قول چہاردہم : دربیان تاثیر اصحاب نعمت

جامع ملفوظات، حضرت برہان الدین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک معلم حضرت صدرالدین ملتانیؒ کو پڑھانے پر مامور ہوا۔ ایک دن استاد و شاگرد کے درمیان کسی مسئلہ پر بحث ہوگئی۔ دوران بحث حضرت صدرالدین نے فرمایا "این سخن از بابا (حضرت بہاءالدین زکریاؒ) شنیدہ ام" استاد نے کہا اسے اس میں کلام ہے۔ صدرالدین نے فرمایا "بابا از شیخ الشیوخ (شہاب الدین عمر سہروردی) شنیدہ است"، استاد نے پھر کہا "الکلام فیہ"۔ صدرالدین نے اپنے والد بزرگوار سے استاد کی شکایت کی۔ حضرت زکریاؒ نے فرمایا کہ استاد نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اس سے درگزر کرتے ہیں لیکن شیخ الشیوخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے معاف نہیں کر سکتے۔ حضرت زکریاؒ نے ایک خادم کو بلا کر کہا کہ استاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے جماعت خانہ میں لے جائے اور حاضرین کو بتا دے کہ وہ تھپڑ کھانے کے لائق ہے حضرت زکریا کے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ اس واقعہ کے بعد وہ معلم جس مجلس میں جاتا وہاں

---

[1] ۱۔ احسن الاقوال ورق ۴۱ الف

سے تھپڑ کھا کر ہی اٹھتا۔[1]

## قول پانزدہم : دربیان احوال باطن اصحاب محبت

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ ایک بار سلطان جی نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک نوجوان انہیں ملا اس نے کہا کہ اس کے حق میں خدا سے دعا کریں کہ وہ اپنی محبت کا ایک قطرہ اس کے حلق میں ٹپکا دے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ وہ اس کی تاب نہ لا سکے گا۔ نوجوان کے بار بار اصرار پر حضرت عیسیٰؑ نے اس کے حق میں دعا کی اور اپنی راہ لی جب حضرت کا اس طرف سے گزر ہوا تو انہوں نے اس نوجوان کو دیکھا کہ وہ حیرت کے عالم میں کھڑا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ اس کی یہ حالت دیکھ کر بڑے حیران ہوئے، اتنے میں جبریلؑ آئے اور کہنے لگے "اے روح اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ہماری محبت کے دریا میں غرق ہے لہٰذا اسے معذور سمجھنا چاہیئے" یہ واقعہ سن کر برہان الدین نے عرض کی، "حضرت آپ بھی عیسیٰؑ دوراں ہیں، میرے لیے بھی ایسی دعا کیجیے"۔ سلطان جی نے فرمایا:

نیکو چیز خواستی و نیکو وقت خواستی[2]

## قول ہژدہم : دربیان آداب توکل و صبر و تحمل و فاقہ و فقر

حضرت فرماتے ہیں کہ سلطان جی کی خانقاہ میں ایک مسافر آیا اور

---

[1] ۱۔ احسن الاقوال، ورق ۴۴ ب

[2] ۲۔ ایضاً، ورق ۴۵ الف

چند روز وہاں رہ کر شہر چلا گیا۔ شہر میں اس کے کئی رشتے دار رہتے تھے لیکن وہ ان میں سے کسی کے ہاں نہ ٹھہرا اور مسجد میں جا کر توکل کی نیت کر کے بیٹھ گیا۔ کئی روز گزر گئے لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی آخر کار وہ بھوک سے نڈھال ہو کر سلطان جی کی خدمت میں آیا اور ان سے سوال کرنے لگا کہ اگر متوکل کو پہلے دن کچھ نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ سلطان جی نے فرمایا "صبر" اس نے پوچھا اگر دوسرے روز بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا "صبر" مسافر نے کہا کہ اگر تیسرے روز بھی کچھ نہ ملے تو؟ سلطان جی نے فرمایا اس کا توکل نہیں تھا کیونکہ جو شخص خدا پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتا ہے خدا اسے فراموش نہیں کرتا۔[1]

### قول بیست ویکم : دربیان فضیلت انفاق واحسان

حضرت فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے سلطان جی سے سوال کیا کہ فقیر صابر اچھا ہے یا غنی شاکر؟ انہوں نے جواب دیا کہ دونوں ہی اچھے ہیں۔[2]

حضرت برہان الدین نے اس ضمن میں بایزید بسطامی کی کئی ایک مثالیں دی ہیں اس کے علاوہ ورد و وظائف پڑھنے اور نفلی نمازیں ادا کرنے کے کئی طریقے بیان گئے ہیں۔

### قول بیست وپنجم : دربیان وضو ونماز ونوافل واوراد

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۴۹ ب

۲۔ ایضاً ورق ۵۳ الف

اس قول کے تحت حضرت برہان الدین نے حفظ ایمان کے لئے دوگانہ پڑھنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ نماز مغرب کی سنتوں کے بعد یہ دوگانہ پڑھنا چاہیئے۔ اس کی ترکیب یوں ہے کہ پہلی رکعت میں سات بار سورہ فاتحہ اور ایک بار قل اعوذ برب الناس پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد تین یا سات بار "یاحیی یاقیوم ثبتنی علی الایمان" کہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ سلطان جی کہا کرتے تھے کہ اس پر عمل کرنے والے کا ایمان سلامت رہے گا۔[1]

اس قول کے تحت حضرت برہان الدین نے نماز کوثر، نماز روشنائی قبر، نماز برائے روشنی چشم، صلوٰۃ السعادت، صلوٰۃ برائے کفایت مہمات، صلوٰۃ برائے افزودن عقل، صلوٰۃ الخضر، صلوٰۃ اشراق صلوٰۃ چاشت، صلوٰۃ زوال، صلوٰۃ برائے حصول سعادت دارین، صلوٰۃ برائے ادائیگی حقوق والدین، صلوٰۃ برائے حصول ثواب شب قدر اور قبر میں پہلی رات کو مونس بننے کی نماز پڑھنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ اس طرح انہوں نے مختلف قمری مہینوں میں پڑھنے کے لئے ورد و وظائف بتائے ہیں۔[2]

### قول بیست وششم : درآداب محفل سماع

حضرت برہان الدین سماع بڑے ذوق وشوق کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ اس قول کے تحت انہوں نے سماع سننے کے آداب بتائے ہیں۔

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۵۹ ب

۲۔ ایضاً، ورق ۶۰ الف تا ۶۳ ب

موصوف فرماتے ہیں کہ سماع میں فکر اور گریہ ہونا چاہیئے، ورنہ یہ فتنہ ہے۔ سماع کے دوران میں سامع با وضو رہے۔ وہ محفل سماع میں گوش و ہوش کے ساتھ بیٹھے اور پانی پینے یا پان کھانے سے احتراز کرے[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ بے نیت ہاتھ اٹھانے والا درویش سماع نہ سنے۔

حضرت نے ایک دن اپنی مجلس میں فرمایا کہ ایک بار سلطان جی کے ہاں سماع جاری تھی اور ان کے مریدوں پر وجد طاری ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں حضرت، مطبخ میں تشریف لے گئے۔ انہیں اس وقت بڑی سخت پیاس لگی ہوئی تھی، مطبخ میں موجود کسی شخص نے شربت کا گلاس پیش کیا تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرید تو محفل سماع میں اپنا خون پئیں اور وہ شربت نوش کریں[2]۔

حماد کاشانی اس پر شاہد ہے کہ ایک بار سخت گرمی کے موسم میں حضرت برہان الدین کے ہاں محفل سماع جاری تھی اور لوگوں کو وجد آ رہا تھا۔ حضرت نے دیکھا کہ محمود ترک ایک حوض کے کنارے کھڑا ہوا کھا رہا ہے۔ حضرت نے اسے مخاطب کر کے فرمایا "اے بے ذوق درویشان در خونناب اند تو بادہ میخوری[3]"

---

۱۔ احسن الاقوال، ورق ۷۰ ب

۲۔ ایضاً ورق ۷۱ الف

۳۔ ایضاً،

حضرت برہان الدین فرماتے ہیں کہ سماع میں شیخ پہلے کھڑا نہ ہوا سے چاہیئے کہ جب تک حاضرین میں سے کسی کو وجد نہ آئے، وہ خود پر وجد طاری نہ کرے۔ ایک روز محفل سماع میں حضرت برہان الدین کی حالت غیر ہو گئی اس کے باوجود انہوں نے آداب محفل کا خیال رکھا اور اپنے ایک ساتھی خواجہ مبارک معروف سے کہا کہ وہ پہلے اٹھے جب وہ اٹھا تو حضرت بھی اٹھ کر وجد کرنے لگے[1]

حضرت فرماتے ہیں کہ جب بابا فرید الدین گنج شکرؒ کو حال آتا تو موصوف اپنے ایک مرید محمود سے کہتے ہیں "کیا تو زندہ ہے؟" محمود کھڑا ہو جاتا تو پھر بابا صاحب بھی کھڑے ہو جاتے[2] حضرت فرماتے ہیں کہ دوران وجد شیخ کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی دستار نہ کھلنے پائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ فوراً اسے درست کر لے ورنہ شہر پر آفت آ جائیگی۔ ایک بار دوران وجد سلطان جی کی دستار کھل گئی تو انہوں نے فوراً اسے درست کر لیا۔ ان کے کسی مخالف نے کہا کہ اگر ان پر حالت طاری تھی تو پھر انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ان کی دستار کھل گئی ہے اور اگر انہیں معلوم ہو گیا تھا تو پھر حالت کیسی تھی؟ سلطان جی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ انہیں شہر کی پریشانی پسند نہ تھی، اس لیے انہوں نے حال چھوڑ کر اپنی دستار سنبھال لی[3]

---

۱۔ احسن الاقوال

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً ورق ۷۲ الف

حضرت فرماتے ہیں کہ سماع کے دوران میں علیک سلیک نہ کی جائے اور شور و شغب سے بھی اجتناب کیا جائے اس لئے سماع کے لئے کوئی دن مقرر کرنا چاہیئے، ورنہ وہ جگہ تباہ ہو جائے گی[1]

حضرت برہان الدین کے ملفوظات میں کل ۲۹ اقوال ہیں۔ میں نے ان سب کا ذکر نہیں کیا اور بعض اقوال کو غیر اہم سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ جو اقوال میں نے چھوڑے ہیں ان میں فضیلت تجرید از خلائق فضیلت اصحاب قناعت مذمت طمع، علو ہمت، لقمہ حرام، مذلت حرص و شہوت، فضیلت صدقہ، وضو و نماز، قبول فتوحات از مردمان اور کرامات مخدوم شامل ہیں۔

## اُردو کی ابتدا!

حضرت برہان الدین کے ملفوظات میں کھٹ، ڈولہ، کھچڑی اور چھجہ جیسے ہندوی الفاظ ملتے ہیں جو روزمرہ کی گفتگو میں شامل تھے ایک جگہ انہوں نے ایک شعر بھی نقل فرمایا ہے۔

## ایک علمی انکشاف

حضرت برہان الدین کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ جامع ملفوظات کے بھائی خواجہ مجد الدین کاشانی نے حضرت برہان الدین کے حالات میں، غرائب الکرامات و عجائبات المکاشفات کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی[2]

---

۱۔ احسن الاقوال ورق ۷۲ ب

۲۔ ایضاً ورق ۷۶ الف

---

## پنجاب اور دہلی میں امن وامان کی غیر تسلی بخش صورتحال

حضرت کے ملفوظات میں جانور یا سامان گم ہونے کے کئی واقعات ملتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ پنجاب میں امن و امان کی صورت تسلی بخش نہ تھی۔ پنجاب تو خیر ایک دورافتادہ علاقہ تھا، خود دارالحکومت دہلی کی یہ حالت تھی کہ شہر اور غیاث پور کے درمیان مسافر لٹ جاتے تھے۔ حضرت گیسو دراز کے ملفوظات اس کے بعد قلمبند ہوتے ہیں۔ ان میں یہ مرقوم ہے کہ میواتی لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی کی فصیل تک آ جاتے تھے اور ان کے خوف سے لوگ نماز عصر کے فوراً بعد شہر میں آ جاتے تھے[1]۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے میواتیوں کی روک تھام کے لئے جو اقدامات کئے تھے، اس کے جانشین انہیں برقرار نہ رکھ سکے۔

---

۱۔ محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ ص ۲۴۹ "دران ایام میواں می آیند میزنند میبروند، نماز دیگر بالائی حوض سلطان کسی نمی باشد ہمہ دردن شہر می آیند۔"

# شاہانِ مغلیہ کا ذوق موسیقی

برصغیر پاک وہند کے اکثر حکمران فن موسیقی میں بڑی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ معزالدین کیقباد[1]۔ سلطان جلال الدین خلجی[2] اور قطب الدین مبارک[3] کا اکثر وقت اسی شغل کی نذر ہوتا تھا۔ سلطان محمد بن تغلق کی ایسی تصاویر موجود ہیں جن میں وہ تخت پر بیٹھا کنیزوں کے گانے سے محظوظ ہو رہا ہے[4]۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اس فن لطیف کی بڑی ترقی ہوئی[5] اور جہاں علم فقہ پر فوائد فیروز شاہی، فتاوٰی تتارخانیہ اور فقہ فیروز شاہی

---

[1] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۸۹ - ۱۸۸

[2] ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۸ء، ص ۲۷،

[3] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۱۶، "مدت سلطنت چہار سال وچہار ماہ کار نبود مگر شراب خوردن وسماع شنیدن"۔

[4] آغا مہدی حسن، رائز اینڈ فال آف محمد بن تغلق، مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء، تصویر بالمقابل ص ۳۰۔

[5] شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۳۶۸۔ سلطان فیروز تغلق کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے عفیف لکھتا ہے "کاروبار مطربان دہلی بجائے رسید کہ فرزندان خرد سال برابر خرد کردہ از شہر دہلی تا فیروز آبادی آرند"۔

جیسی بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں وہاں علم موسیقی پر بھی فرید الزمان فی معرفت الالحان اور غنیۃ المنیہ[6] جیسی قابلِ قدر کتابیں درطۂ تحریر میں آئیں۔ جونپور کی شرقی حکومت کے تاجدار سلطان ابراہیم کا اکثر وبیشتر وقت اسی شوق کی نذر ہوتا تھا۔ اس نے فنِ موسیقی پر سنسکرت زبان میں شرومنی سنگیت کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی جس میں اس فنِ لطیف کے رموز واسرار پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے پوتے سلطان حسین کو اس فن میں مجتہد کا درجہ حاصل تھا اور اس نے خیال، جونپوری، حسین کانہڑا اور حسینی ٹوڈی جیسے راگ ایجاد کیے[7]۔ اکثر مؤرخین نے اپنی کتابوں میں سلطان حسین شرقی کا ذکر THE MUSICIAN KING OF JAUNPUR کے عنوان کے تحت کیا ہے[8]۔ کشمیر کا سلطان زین العابدین بھی موسیقی کا بڑا سرپرست تھا۔ مؤرخ کشمیر منشی محمد دین فوق تاریخ بڈشاہی میں رقمطراز ہیں کہ سلطان زین العابدین کو ساز و سرود سے بڑی رغبت تھی اور وہ اس فن کو خوب جانتا اور راگ کی ماہیت کو خوب سمجھتا تھا۔ اس نے ملا عود اور جمیل جیسے مغنیوں کو، جو صاحبِ تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے موجد تھے، خراسان سے کشمیر بلایا اور ان کی خوب آؤ بھگت کی[9]۔ اس کے ایک درباری پنڈت

---

[6] ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ، انڈیا آفس لائبریری لندن، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۰۳ء، مخطوطہ نمبر ۲۰۰۸

[7] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۷

[8] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۶۵

[9] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۲

[10] محمد دین فوق، تاریخ بڈشاہی۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۴ء، ص ۳۳۸۔

بودی بٹ نے علم موسیقی پر زین نام کی ایک کتاب لکھ کر سلطان کی خدمت میں پیش کی۔[11] سلطان کے ذوق و شوق کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گاہ گاہے کتب موسیقی اور گویوں کا تبادلہ گوالیار کے راجہ کے ساتھ کیا کرتا تھا۔[12] گوالیار کے راجہ مان سنگھ تنوار کو تمام گویوں نے استاد تسلیم کیا ہے، اس نے دھرپد راگ ایجاد کیا[13] اور فن موسیقی پر مانکتوہل نام کی ایک کتاب لکھی،[14] جس پر شمالی ہندوستان کے گویوں کا مدتوں تک مدار رہا۔ اس نے گوالیار میں ایک میوزک اکیڈمی بھی قائم کی جہاں سے بڑے نامی گرامی گوئیے تربیت پاکر نکلے۔ بخشو نائک، جس کی بیٹی سے تان سین نے راگ سیکھا تھا، راجہ مان سنگھ تنوار کا تربیت یافتہ تھا۔ مالوہ کا فرمانروا باز بہادر بھی فن موسیقی میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں مالوہ میں اس فن کو بہت عروج ہوا۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر شراب و نغمہ کا بڑا دلدادہ تھا، ویسے بھی شراب و نغمہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے عمر خیام نے کہا ہے۔

| | |
|---|---|
| مے برکفِ من نہ و برآور غلغل | لا جام شراب دے لبالب بالکل |

---

[11] ایضاً، ص ۳۴۰

[12] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

[13] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

[11] پروفیسر ستری پدا ابند و پادھیائے، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ بمبئی طبع اول، ص ۵۶

[14] سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۵ب

| | |
|---|---|
| با نالۂ عندلیب و صوتِ بلبل | کس وقت مگر جب بول چہکے بلبل |
| بے نغمہ اگر سعادتے مے خوردن | بے نغمہ اگر شراب ہوتی جائز |
| مے در سرِ شیشہ ہا نکردے قلقل[15] | سنتے نہ کبھی شیشے کے منہ سے قلقل[16] |

فتح ہندوستان سے قبل اس کی عمر جس علاقے میں گزری اس کی فضا میں چاروں طرف میر علی شیر نوائی اور مولانا بنائی کے نغمے گونج رہے تھے۔ میر علی شیر خود ماہر ارغنون نواز، ہونے کے علاوہ موسیقاروں کا بڑا خیال رکھتا تھا۔[17] اس کے متعلق عباس پرویز رقمطراز ہیں۔

| | |
|---|---|
| چون خود موسیقی می دانست تربیت | وہ چونکہ خود موسیقی دان تھا اس لیے |
| طبقۂ آہنگسازان و موسیقیدانان | وہ سازندوں اور گویوں کی تربیت |
| می پرداخت[18] | کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ |

مولانا بنائی، شیبانی خان کے دربار میں ملک الشعراء کے منصب پر فائز تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ موسیقی کے بھی ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے متعلق میر خواند لکھتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| از علم تصوف و موسیقی وقوف | وہ علم تصوف اور موسیقی میں |
| کامل داشت[19] | پوری دسترس رکھتے تھے۔ |

---

[15] عمر خیام، رباعیات، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۹ء، ص ۶۶

[16] آغا شاعر قزلباش، خمکدۂ خیام، مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور۔ ص ۱۹

[17] دولت شاہ سمرقندی، تذکرہ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۷ ش۔ ص ۵۶۹

[18] عباس پرویز، مقدمہ، روضۃ الصفا مؤلفہ میر خواند، جلد اول، مطبوعہ تہران ۱۳۳۸ ش، ص ط

[19] میر خواند، روضۃ الصفا، جلد ہفتم، مطبوعہ تہران ۱۳۳۹ ش، ص ۲۸۱

بابر نے بھی اپنی تزک میں مولانا بنائی کے ماہر موسیقی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[20] بابر کے عہد میں ہرات میں غلام شادی، حافظ حاجی، جلال الدین محمود، قل محمد عودی، شیخ نائی اور علی شیر بیگ جیسے باکمال موسیقار موجود تھے۔ بابر نے ان سب کے کمالِ فن کا اعتراف اپنی تزک میں کیا ہے۔[21] ماوراء النہر میں بابر کے حریف عبید اللہ خان ازبک کو فن موسیقی میں بڑا کمال حاصل تھا اور اس کی مرتب کردہ دھنیں عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ حیدر دو غلات کا کہنا ہے کہ وسطِ ایشیاء کے شہروں اور قصبوں میں عوام اسی کے ترتیب دیئے ہوئے نغمے الاپتے پھرتے تھے۔[22] اس ماحول میں رہتے ہوئے بابر کو بھی موسیقی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور تزکِ بابری کے بعض اندراجات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے زیر و بم سے کما حقہٗ واقف تھا۔

تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں موروثی خصوصیتوں سے کافی بہرہ اندوز تھا اور اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ اس نے ہفتہ میں دو دن موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ خوندامیر ہفتہ کے مختلف دنوں میں ہمایوں کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے دوشنبہ اور چہار شنبہ کے ضمن میں لکھتا ہے:۔

---

[20] تزک بابری، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۸ھ، ص ۱۱۴

[21] ایضاً، ص ۱۱۵ ، ۱۱۲ ، ۱۲۰

[22] حیدر دوغلات، تاریخ رشیدی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، آذر کلکشن نمبر ۴۹، ورق ۲۴۰ الف
"این نغمات در افواہ اہلِ طرب از تصنیفات اوست۔"

درین دو روز با جوانان قمر پیکر صحبت
داشتہ بامتزاجِ نغمات والحانِ ساز
و آواز از دیار زیب و زینت
بخشد۔[23]

یہ دو دن بادشاہ قمر پیکر جوانوں کی
صحبت میں بسر کرتا اور ملک ملک کے
ساز و نغمہ سے محفل کی رونق
دو بالا کرتا تھا۔

شاہی دربار کے علاوہ کبھی کبھی شاہی حرم میں بیگمات کی موجودگی میں مجلس طرب منعقد ہوا کرتی تھی جس میں ۔ سازندھا و گویندھا۔ اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا کرتے تھے۔[24]

مرأتِ سکندری کی روایت ہے کہ فتح مانڈو کے بعد ہمایوں تین صد جنگی قیدیوں کو قتل کروانا چاہتا تھا، اتفاق سے ان میں سلطان بہادر شاہ گجراتی کا درباری گویا منجھو بھی تھا۔ حسنِ اتفاق سے ایک ہندو راجہ کا اُدھر سے گزر ہوا اور اس نے منجھو کو پہچان لیا۔ راجہ نے ہمایوں سے اس کی جاں بخشی کی سفارش کی، ہمایوں کا ایک درباری خوشحال بیگ قورچی جو ایک بار سلطان بہادر شاہ کے دربار میں ہمایوں کا ایلچی بن کر گیا تھا، وہ منجھو کے مقام سے واقف تھا۔ اس نے بھی موقع محل دیکھ کر ہمایوں سے کہا "این منجھو کلاونت پادشاہ لولیان است"[25] بادشاہ نے منجھو کو کچھ سنانے کا حکم دیا۔ منجھو نے بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی یہ غزل چھیڑی:۔

---

[23] خواندامیر، قانونِ ہمایونی، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۰ء، ص ۳۸

[24] گلبدن بیگم، ہمایوں نامہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۲

[25] سکندر بن محمد، مرآۃ سکندری۔ مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۰ء ص ۲۵۰

کسے نماند کہ اوُرا بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی[۲۶]

منجھو کا گانا ختم ہونے سے قبل ہی ہمایوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے سُرخ لباس اُتار کر سبز لباس زیب تن کیا۔ بعد ازاں منجھو کی سفارش قبول کرتے ہوئے ہمایوں نے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔

ہمایوں نے منجھو کو اپنا مقرب بنا کر انعام و اکرام سے نوازنا شروع کیا لیکن اس کے باوجود وہ موقع پا کر بھاگ نکلا اور بہادر شاہ کے پاس جا پہنچا۔ ہمایوں کو اس کے فرار کی خبر ملی تو اس نے بے ساختہ کہا۔

کم بختی او براین داشت و الّا ما
این قدر نوازش می فرمودیم کہ
ہرگز سلطان بہادر را یاد نمی
آورد[۲۷]

یہ اس کی بدبختی تھی جو اس نے
ایسا کیا ورنہ ہم اسے اتنا انعام و
اکرام دیتے کہ وہ سلطان بہادر شاہ
کا نام زبان پہ نہ لاتا۔

سکندر بن محمد کی روائت ہے کہ جب منجھو ہمایوں کے دربار سے بھاگ کر سلطان بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مسرت کے ساتھ کہا۔

دیگر مرا آرزوئی نماندہ آنچہ از — اب میری اور کوئی خواہش نہیں رہی۔

---

[۲۶] شاہنواز خان، مرأت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر فارسی ۲۴، ورق ۲۹۴ب

[۲۷] مرآۃ سکندری، ص ۲۵۰

خدا می طلبیدم بمن رساند[۲۸] — میں نے جو کچھ خدا سے مانگا وہ پا لیا۔

موسیقی کی سرپرستی میں صوفیائے کرام بھی بادشاہوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ شاہی درباروں کے باہر صوفیائے کرام کی خانقاہیں موسیقی کا سب سے بڑا گہوارہ سمجھی جاتی تھیں۔ ہمایوں کے عہد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ چشتیہ سلسلہ کے سربراہ تھے اور آپ کثرت کے ساتھ سماع سنتے تھے۔ لطائفِ قدوسی کے اندراجات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر ہر وقت جذب و مستی کا عالم طاری رہتا تھا۔ آپؒ کے صاحبزادے

---

[۲۸] ایضاً۔ **نوٹ**:۔ ا۔ سکندر بن محمد نے اس گویے کا نام منجھو لکھا ہے۔
(مرآۃ سکندری، ص ۲۵۰)

ب۔ ہمایوں کے سوانح نگار بنرجی نے بھی اس کا نام منجھو ہی لکھا ہے۔
(ہمایوں بادشاہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۸ء، ص ۱۳۴)

ج۔ شاہ نواز خان نے اس کا نام بیجو لکھا ہے۔
(مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۴ب)

د۔ عطیہ بیگم فیضی نے بھی اس کا نام بیجو ہی لکھا ہے۔ ان کے خیال میں اس نے ایک ٹوڈی بھی ایجاد کی تھی جو سلطان بہادر شاہ کے نام کی رعائت سے "بہادری ٹوڈی" مشہور رہی ہے۔
(دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۶۵)

ہ۔ ایشوری پرشاد نے اس گویے کا نام "بیجو" لکھا ہے۔
(اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول اِن انڈیا، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۲۶۴)

و۔ منشی محمد اکرم امام خان کے خیال میں اس کا صحیح نام بیجو ہے کیونکہ راجہ مان سنگھ تنوار نے مانکتوہل میں ایسے ہی لکھا ہے۔ (معدن الموسیقی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۲۵ء، ص ۲۷)

رقمطراز ہیں کہ ہمارے والد ماجد کی شادی کی تقریب میں جونہی ڈومنیوں نے یہ دوہڑا گایا۔

کبھو کبہ کھول دینا شہہ دیکھا لوری
اس گھونگھٹ کی کارن شہہ ہاتھ مروی

| | |
|---|---|
| حضرت قطبی را حال وجد غالب آمد | حضرت قطب صاحب میں سوزِ عشق |
| وسوزِ عشق پیدا شدہ، از تختِ | پیدا ہوا اور آپ وجد میں آگئے اور اسی |
| عروسی افتادند و در تواجد رقص | عالم میں مسندِ عروسی سے نیچے گر پڑے۔ آپ |
| فرمودند و جامہا عروسی ہمان ساعت | نے فی الفور اپنا عروسی جوڑا چاک کر ڈالا |
| پارہ پارہ کردند[29] | اور وجد کے عالم میں رقص کرنے لگے۔ |

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے صاحبزادوں نے ان کی نشست و برخاست کے لیے جماعت خانہ کے صحن میں ایک چھپر ڈال دیا تھا اور اسی کے نیچے اکثر مجلسِ سماع منعقد ہوا کرتی تھی اور آپ سماع سنتے سنتے وجد میں آ کر رقص کرنے لگتے۔ شیخ رکن الدینؒ نے لطائف قدوسی میں ایک محفل سماع کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| محمود قوال از گجرات آمدہ بود ہمان | محمود قوال گجرات سے (گنگوہ) آیا اور |
| ساعت حاضر شدہ و سرود گفت | اسی لمحے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ |
| حضرت قطبی را حالتِ بسیار وجد | محمود نے قوالی شروع کی جسے سن کر |
| بہ کمالِ پیدا شد آن چھپر را از صحن | حضرت قطب صاحب کی حالت |
| جماعت خانہ شکستہ کردہ برون | غیر ہوئی اور ان پر وجد طاری ہوا۔ ایسی |

---

[29] شیخ رکن الدین، لطائف قدوسی، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۱۲

| | |
|---|---|
| انداختند و در صحن رقص و تواجد | عالم میں آپ نے وہ چھپر جماعت خانہ کے صحن |
| شدند[30] | سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیا اور صحن میں |
| | رقص کرنے لگے۔ |

چشتی اس کا اعتراف بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں کہ سماع کو عام کرنے میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس طرح سہروردی حضرات کا یہ کہنا ہے کہ برِصغیر پاک و ہند میں موسیقی کی ترویج میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی کوششوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ موصوفؒ راگ کے زیر و بم سے کماحقہٗ واقف ہونے کے علاوہ اس فن کے بڑے سرپرست تھے[31]۔ شاہنواز خان حضرت کے کمال فن کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ایشان در تودی مالسری را و دھناسری | حضرت بہاؤالدین زکریا نے ٹوڈی مالسری |
| را ضم نمودہ ملتانی دھناسری نامیدہ اند | اور دھناسری کو ملا کر ملتانی دھناسری بنائی |
| وایں مرغوب طبع حضرت خواجہ | اور یہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بہت |
| قطب الدین قدس سرہ بود[32] | مرغوب تھی[33]۔ |

ملتانی دہناسری کے علاوہ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے نٹ ہمیر اور ہمیر کو ملا کر گور راگ بنایا، یہ راگ گجرات میں بہت مقبول ہے۔ اسی طرح آپ نے

---

[30] ایضاً، ص ۳۲۔

[31] سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ علیگڑھ یونیورسٹی لائبریری، ورق ۱۴ الف

[32] شاہنواز خان، مرآت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری فارسی نمبر ۲/۷، ورق ۱۴۹ الف

[33] عنایت خلی راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۴۰

رام کلی، سیام اور گندھار کو ملا کر گوجری راگ بنایا۔[34] محمد اشفاق علی خان نے ملتانی راگ کی ایجاد بھی آپ ہی کی طرف منسوب کی ہے۔[35] ان راگوں کے علاوہ آپ نے پوربا اور دھناسری کو ملا کر پوربا دھناسری راگ ایجاد کیا۔[36] ماہرینِ موسیقی کے ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت بہاء الدین زکریاؒ اس فنِ لطیف میں مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔

ہمارے خیال میں موسیقی ایک لطیف فن تھا اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں موسیقی کو غذائے روح سمجھ کر سنا جاتا تھا۔ ایک ماہر موسیقار جناب شمس کنول اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"موسیقی فنونِ لطیفہ میں سے ایک بڑا لطیف فن ہے جس سے قلبِ انسانی پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، کبھی دل حسرت و الم میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی اس میں جوش و سرور پیدا ہوتا ہے اور اس طرح انسان کے مختلف جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، صوفیائے کرام اور سنت سادھوں کا طبقہ موسیقی کو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کا ذریعہ سمجھتا ہے۔"[37] بڑے بڑے صوفیائے کرام نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے بامِ عروج تک پہنچانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کے علاوہ امیر خسروؒ، صوفی بہاء الدین برناویؒ، صوفی شیر محمد، محمد غوث گوالیاریؒ، شیخ پیر بڈھیؒ، نظام الدین مدھ نائک،

---

[34] محمد اشفاق علی خان، نغماتُ الہند، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۷۷

[35] ایضاً۔ [36] شاہنواز خان، مراۃ آفتاب نما، ورق ۲۹۶ الف

[37] شمس کنول، "علم موسیقی"، ماہنامہ آج کل دہلی، موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء، ص ۱۷

میراں سید شاہ حسینؒ اور حضرت سید شاہ جمالیؒ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ہماری یہ رائے ہے کہ موسیقی جب تک رنڈی کے کوٹھے تک نہیں پہنچی تھی اُس وقت تک اسے ایک پاکیزہ فن تصور کیا جاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے خدا رسیدہ درویشوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور اسے اپنے لئے بالکل عار نہ سمجھا۔

عہدِ ہمایوں میں حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کی خانقاہ موسیقاروں کا ملجا و ماویٰ تھی۔ تان سین کے والد مکرند پانڈے کو حضرت کے ساتھ بڑی عقیدت تھی،[38] اسی بنا پر اس نے تان سین کو بچپن ہی میں حضرت کے پاس چھوڑ دیا تھا۔[39] حضرت نے کمالِ شفقت سے اس کی پرورش کی اور ماہر اساتذہ کی نگرانی میں اُسے موسیقی کی تعلیم دلوائی، اور یہ حضرت ہی کا فیضانِ نظر تھا کہ تان سین ہندوستان کا موسیقارِ اعظم کہلایا اور ابوالفضل یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ گذشتہ ہزار سالوں میں اس کی نظیر ہندوستان میں نہیں ملتی۔[40] تان سین کے علاوہ بیجو باورے کی تربیت میں بھی حضرت محمد غوث گوالیاریؒ کا بڑا ہاتھ ہے۔

راجہ مان سنگھ تنوار والئے گوالیار کے درباری گویّے نائک بخشو کا انتقال ہو چکا تھا، البتہ اس کی بیٹی عہدِ ہمایوں میں بقیدِ حیات تھی۔ وہ فنِ موسیقی

---

[38] ایضاً، ص ۸۷

[39] پروفیسر محمد مسعود احمد نے تان سین کا شمار حضرت محمد غوثؒ کے مریدوں میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی تالیف، شاہ محمد غوث گوالیاریؒ مطبوعہ میرپور خاص ۱۹۶۴ء، ص ۱۳۰

[40] ابوالفضل، آئینِ اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۲۶۳

میں اپنے باپ کی صحیح جانشین سمجھی جاتی تھی۔ اس کے ماہر فن ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کا موسیقارِ اعظم تان سین اس کا شاگرد تھا۔[۴۱]

ہمایوں کے عہدِ حکومت میں بندرابن میں دریائے جمنا کے کنارے ایک خدارسیدہ ہندو بابا ہری داس رہتا تھا جسے موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور بڑے بڑے موسیقار اُسے اُستادِ فن تسلیم کرتے تھے۔ اس کے ماہر موسیقی ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو گا کہ اس کے تلامذہ میں تان سین کا نام بھی نظر آتا ہے۔[۴۲]

موسیقی کی تاریخ میں ہمایوں کا دورِ حکومت اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے عہد میں ایران سے کئی نامور موسیقار ہندوستان آئے اور وہ اپنا طرزِ اسلوب بھی ساتھ لائے۔ شمالی ہندوستان کے موسیقاروں نے ان کے ساتھ مل کر ہندوستانی موسیقی کو ایرانی سانچے میں ڈھال کر جدید ہندوستانی موسیقی کی بنیاد رکھی۔ اور اسی بنیاد کو بعض ہندو موسیقاروں نے "ایک تاریخی اتفاق" کا نام دیا ہے۔[۴۳]

ہمایوں کی ہندوستان سے جلاوطنی کے دوران اسلام شاہ سوری کے جانشین محمد عادل شاہ نے موسیقی کی شمع کو بجھنے سے بچا لیا۔ وہ موسیقی کا سرپرست ہونے کے علاوہ خود بھی بڑا اچھا گویا تھا اس نے اپنے پایۂ تخت

گوالیار میں راجہ مان سنگھ تنوار کی روایت کو زندہ رکھا اور گویوں کی تربیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے ماہر موسیقی ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سلطان باز بہادر[۴۴] اور تان سین جیسے موسیقاروں نے اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔

اکبر کا دربار تو موسیقی کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ قبلہ عالم اس فن پر خاص توجہ فرماتے اور ہر موسیقی دان کے سرپرست و مربی ہیں۔ بیشمار ہندی، ایرانی، تورانی اور کشمیری نغمہ پرداز بارگاہ عالی میں جمع ہیں جن میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں۔ جہاں پناہ نے درباری گویوں کو سات گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے اور ہر گروہ ہفتے میں ایک روز حاضر ہو کر اپنے کمالات دکھاتا۔ اور سامعین کے قلوب کو کالونی کے ذریعے سے بادۂ معرفت کا متوالا بنا کر کسی کو مست اور کسی کو ہوشیار کرتا۔[۴۵] ابوالفضل کے بیان کے مطابق چھتیس گوئیے اور سازندے شاہی دربار میں ملازم تھے، ان میں سے گانے والوں میں میاں تان سین اور اس کا بیٹا تان ترنگ خان، سبحان خان اور اس کا بھائی بچتر خان، ملّا اسحٰق اور اس کا بھائی رحمت اللہ، بابا رام داس اور اس کا بیٹا سور داس، سرود خان، داؤد، سرگیان خان، میاں چاند، محمد خان، میاں لال، چاند خان، نانک جارجو اور رنگ سین خاص طور پر مشہور ہیں، اسی طرح طنبورہ بجانے میں استاد محمد حسین، استاد یوسف،

---

[۴۱] محمد اسلم، شاہجہان کا ذوقِ موسیقی، مطبوعہ روزنامہ امروز، ۹ مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۷

[۴۲] عطیہ بیگم فیضی، دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۵ء، ص ۲۳

[۴۳] بی سبھا مورتی، آج کل دہلی موسیقی نمبر، ص ۷۸

[۴۴] نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء، ص ۲۵۲ — "باز بہادر اپنے وقت میں ہندی موسیقی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور اس کا زیادہ تر وقت رقاصوں اور گنجنیوں کی صحبت میں ہی گذرتا تھا۔"

[۴۵] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۲۶۳

سلطان ہاشم اور اُستاد محمد امین، قانون بجانے میں میر عبداللہ، سارنگی بجانے میں میر سید علی اور بہرام قلی، سرمندل بجانے میں میر مندل خان، بنسری بجانے میں استادہ ست، بجاؤ بجانے میں پیرزادہ، حافظ خواجہ علی اور سلطان بیگ، بین بجانے میں صاحب خان اور پر بین خان، سرنا بجانے میں اُستاد شاہ محمد، تنبور نوازی میں تاشش بیگ اور کرنا پھونکنے میں شیخ دادن اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ قاسم نامی ایک موسیقار نے تنبور اور رباب کے درمیان ایک ساز ایجاد کیا تھا جسے وہ شاہی دربار میں بجایا جاتا تھا۔

"آئین اکھاڑہ" کے تحت ابوالفضل رقمطراز ہے کہ اس آباد مملکت کے ذی عزت و ثروت افراد کے گھروں میں مجالسِ عیش منعقد کی جاتی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اندرونی کنیزوں کو ساز و نغمہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور چار خوش رنگ عورتیں ناچتی ہیں اور عجیب اصول ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسری چار عورتیں نغمہ سرائی کرتی ہیں، ان میں سے دو پکھاوج بجاتی ہیں اور باقی دو اپنگ، اسی طرح ایک عورت رباب، دوسری ڈھولک، تیسری بین اور چوتھی چتر بجاتی ہے۔ اسی طرح دو عورتیں ہاتھوں میں چراغوں کے تھال لیکر ان کے ارد گرد گھومتی رہتی ہیں۔[46] اسی ضمن میں ابوالفضل رقمطراز ہے کہ قبلہ عالم کو سنگیت اور اس کے علاوہ دیگر امور میں بیشمار واقفیت حاصل ہے اور جو امور تمام عالم کے لئے کمالِ غفلت کا موجب ہو سکتے ہیں وہ گیتی خداوند کے لئے بیداری کا باعث ہیں۔[47]

---

[46] ایضاً، جلد ۲، ص ۲۲۶ [47] ایضاً۔

شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پر راگ و رنگ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ابوالفضل رقمطراز ہے کہ ان موقعوں پر ہر پہر کے آغاز پر نقارے بجائے جاتے تھے اور اربابِ نشاط اپنی نغمہ سرائی اور ساز نوازی سے ہنگامۂ عیش برپا کر دیتے تھے۔[48] عہدِ اکبر کا شہرۂ آفاق مؤرخ ملاّ نظام الدین احمد جشنِ نوروز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہ روز و شب میں دو بار اس جشن میں شرکت کرتا اور اس کے ساتھ ایرانی اور ہندوستانی گویے ہوتے تھے۔[49] طبقاتِ اکبری کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جشن کے موقع پر موسیقار پیش پیش ہوتے تھے۔ جشنِ نوروز پر اکبر کا فرنگیوں سے "موسیقیٔ فرنگ" سن کر محظوظ ہونا بھی ثابت ہے۔[50]

ہندوستانی، ایرانی اور کشمیری موسیقی کے علاوہ فرنگیوں کی آمد و رفت کے بعد اکبر نے "موسیقیٔ فرنگ" سننے کا ذوق بھی پیدا کر لیا تھا۔ عبدالقادر بدایونی رقمطراز ہے کہ حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے ارغنون[51] نامی ایک باجہ لایا جو عجائب مخلوقات میں شمار ہوتا ہے۔ بادشاہ نے یہ باجا اہلِ دربار کو دکھایا اور اسے سن کر بے حد محظوظ ہوا۔ یہ باجا ایک قدِ آدم صندوق

---

[48] ایضاً، جلد اوّل، حصہ اوّل، ص ۱۴۱۔

[49] ملاّ نظام الدین احمد، طبقات اکبری، جلد ۲، ص ۲۵۵

[50] محمد حسین آزاد، دربار اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۵۲

[51] مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کے خیال میں جس ساز کو بدایونی ارغنون لکھتا ہے وہ پیانو ہے۔ تذکرہ مجدد الف ثانیؒ، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ص ۵۵

تھا جس پر مور کے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک فرنگی اس کے اندر بیٹھ کر اس کے تار ہلاتا اور دو فرنگی باہر بیٹھ کر موروں کے پروں کی جڑوں پر انگلیاں مارتے تھے۔ اللہ اللہ، اس میں سے کیسی کیسی روح پرور آوازیں نکلتی تھیں۔[52]

موسیقی سن کر اکبر پر کیا گزرتی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۹۶۸ھ میں اکبر دارالحکومت سے شکار کے ارادہ سے نکلا۔ فتح پور سیکری کے قریب منڈاکر نام کے ایک گاؤں میں قوالی ہورہی تھی اور قوال خواجہ غریب نوازؒ کی منقبت گا رہے تھے۔ قوالوں کی زبان سے خواجہؒ کی منقبت سُن کر اکبر پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہیں سے اجمیر کی طرف باگ موڑ لی۔

اکبر کے ذوقِ موسیقی کے ضمن میں اس بات کا ذکر بیجانہ ہوگا کہ تان سین کی صحبت میں رہ کر اکبر نے کلاسیکی موسیقی کا بڑا اعلیٰ ذوق پیدا کر لیا تھا۔ اکبر کے ذوق کے پیشِ نظر تان سین نے درباری کانہڑہ، دربار کلیان، درباری اساوری اور شہانہ جیسے راگ مُرتب کئے۔[53] ڈاکٹر عبدالحلیم کی تحقیق کے مطابق میاں کی ملہار، میاں کی ٹوڈی اور میاں کی سارنگ بھی تان سین کے ہی مُرتب کردہ راگ ہیں۔[54] خوش قسمتی سے تان سین کے مرتب کردہ راگوں کے مسودات رضا لائبریری رام پور میں

---

[52] بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۴ھ، ص ۲۳۴

[53] محمد اشفاق علی خان، نغمات الہند، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ص ۷۸۔

[54] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز آن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۔

محفوظ ہیں اور ایتھل روز نتھال نے اپنی تصانیف میں ان سے پوری طرح فائدہ اُٹھایا۔[55]

تان سین کے متعلق سید عابد علی عابدؔ تحریر فرماتے ہیں کہ اس نے کلاسیکی سنگیت کو ایک نیا رس، نئی حلاوت اور نیا بانکپن بخشا۔ اس نے راگوں میں نہایت دلکش تصرفات کئے اور یہ راگ ان تصرفات کے ساتھ اب اُسی کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً میاں کی ٹوڈی، میاں کی ملہار، لیکن جس راگ کی بدولت تان سین کا نام کلاسیکی سنگیت میں ہمیشہ زندہ رہے گا، وہ درباری ہے، جسے سن کر لعتوبے اکبر کہا کرتا تھا کہ دل کی سوئی ہوئی تمنائیں جاگ اُٹھتی تھیں اور بڑے بڑے کام کرنے کے ولولے بیدار ہوتے تھے۔[56]

درباری کے متعلق پروفیسر خادم محی الدین لکھتے ہیں کہ یہ اوّل شب گزر جانے اور آدھی رات شروع ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر گایا جاتا ہے جونہی اس کے دھیمے ابتدائی سر۔ نی سا رے سا دھا، نی پا گانے شروع کئے جائیں، سن کر طبیعت میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ اس راگ کے سروں کے پیشتر حِصّے کا زور نیچے کے سپتک پر رہتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کا یہ مرغوب راگ تھا، امورِ سلطنت کے نوخشوں اور جھمیلوں میں دن بھر مصروف رہنے کے بعد شاہ کو امن اور سکون مطلوب تھا، اسی لئے تان سین یہ راگ پیش کرتا تھا۔[57]

---

[55] ایتھل روز نتھال، دی سٹوری آف انڈین میوزک اینڈ اِٹس انسٹرومنٹس، مطبوعہ لندن ۱۹۲۸ء، ص ۸۰

[56] سید عابد علی عابد، ماہنامہ قندِ مرداں، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۸۲۔

[57] خادم محی الدین، بحوالہ ایضاً، ص ۱۰

ہندوستانی موسیقی کو پروان چڑھانے میں تان سین نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی وجہ سے اس کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ ابوالفضل نے، جو خود بھی موسیقی کا بڑا ماہر تھا، یونہی نہیں لکھ دیا تھا کہ گذشتہ ہزار سال میں اس جیسا گویا اس سرزمین میں پیدا نہیں ہوا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں تان سین کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

تان سین کلاونت کہ در خدمت
پدرم بے نظیر زمان خود بودہ بلکہ
در ہیچ عہد و قرن مغنی مثل او
نگذشتہ[88]

تان سین کلاونت جو میرے والد کا ملازم
تھا اپنے زمانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔
داپنے زمانے کی توبات ہی کیا ہے کسی زمانے میں
بھی اس جیسا گویا پیدا نہیں ہوا۔

تان سین چونکہ مسلمان تھا اور اس نے ہندوستانی موسیقی میں کچھ تصرفات بھی کئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ اس نے موسیقی کو ذریعہ معاش بنا لیا تھا، اس لئے ہندو اس سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ تان سین ہندوؤں کی موسیقی کے زوال کا سبب بنا ہے[89]۔

الناس علیٰ دین ملوکھم کے مصداق اکبر کے مصاحب اور حواری بھی موسیقی میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ عہدِ اکبر کے مشہور مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کے پیش امام تھے[90] اس کے باوجود وہ موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ محمد حسین آزاد بدایونی کے متعلق لکھتا ہے: "ملا صاحب

---

[88] تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۰۴

[89] فاکس سٹرینج ویز، دی میوزک آف ہندوستان۔ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۴ء، ص ۴۸۔

[90] منتخب التواریخ، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۲۲۷

خود روکھے سوکھے عالم تھے مگر طبیعت ایسی شگفتہ و شاداب لائے تھے جو انشاپردازی کی جان تھی، باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گاتے بجاتے تھے۔ بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے[91]۔ بدایونی خود اپنے متعلق منتخب التواریخ میں رقمطراز ہے۔

وقوف در نغمہ ولایت و ہندی
وخبری از شطرنج صغیر و کبیر دارد
ومشق بین بقدری کردہ[92]

میں ہندوستانی اور غیر ملکی نغموں سے
بخوبی واقف ہوں، اس کے علاوہ
شطرنج کی چھوٹی بڑی بازی بھی لگا لیتا
ہوں اور بین بجانا بھی جانتا ہوں۔

اس زمانے میں فنِ موسیقی کو بڑا پاکیزہ فن تصور کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ گانے بجانے کا شوق بدایونی کی امامت کے راستے میں حائل نہ تھا۔ بدایونی تو خیر پھر بھی پیش امام تھے، اکبر کے صدر الصدور شیخ گدائی کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی طبیعت موزوں تھی، ہندی گیت اور دُھرول کی لَے آپ رکھتے تھے۔ قوالوں سے گواتے تھے اور آپ بھی گاتے تھے اور اس کے ذوق و شوق میں لٹو تھے اور دیوانے تھے[93]۔

شیخ گدائی کے والد شیخ جمالی سلطان سکندر لودھی کے اُستاد اور بڑے نغز گو شاعر تھے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انہیں موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ شیخ موصوف کی ایک غزل جس کے ابتدائی شعر درجِ ذیل

---

[91] محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۴۲۲

[92] منتخب التواریخ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۳۰۴۔

[93] محمد حسین آزاد، دربار اکبری، ص ۷۷۳

ہیں، عہدِ اکبر میں بڑے ذوق وشوق سے گائی جاتی تھی اور کہتے ہیں کہ انہوں نے خود ہندوستانی راگ میں اس کی لے رکھی تھی۔

طال شوقی الیٰ لقائکم   ایھا الغالبون من نظری
تروز وشب بوالنسم خیال شہا   فاسئلوا عن خیالکم خبری[64]

شیخ مبارک ناگوری علومِ شریعت کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی میں بھی کامل دسترس رکھتا تھا، بدایونی شیخ موصوف کی علمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے: "ملائی باین جامعیت بنظر نیامده[65]" شیخ کا ذوق موسیقی اس حد کو پہنچا ہوا تھا کہ:-

یکدم بی استماع صوتی ونغمتی وبرقصی وسازی آرام نمی گرفت[66]

وہ آواز گانے، راگ اور ساز کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا تھا۔

پروفیسر علم الدین سالک شیخ مبارک کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اسے موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، ایک دفعہ اکبر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی، بادشاہ نے کہا کہ اس فنِ لطیف کے سلسلے میں ہم نے جو سامان بہم پہنچایا ہے وہ کسی اور جگہ نہیں ہے، کسی دن ہم دکھائیں گے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد شیخ منجھو، میاں تان سین اور دیگر کلاونتوں کو بلا بھیجا اور انہیں کہا کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کریں۔ شیخ نے سب سے سنا، آخر میں میاں تان سین سے مخاطب

---

[64] ایضاً، ص ۷۷۱
[65] بدایونی، منتخب التواریخ، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۷۴
[66] ایضاً، ص ۷۳

ہوئے اور کہا: "شنیدم تو ہم چیزے میتوانی گفت" اس پر میاں تان سین نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا جسے سن کر آپ نے کہا "ہاں کچھ جانوروں کی طرح بولیاں بول لیتے ہو"[67] اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مبارک کا ذوقِ موسیقی اتنا بلند تھا کہ وہ بڑے سے بڑے گویے کو خاطر میں نہ لاتے تھے، وہی تان سین جس کے متعلق ابوالفضل لکھتا ہے کہ گزشتہ ہزار برس میں اس سرزمین میں اس جیسا کوئی گویا پیدا نہیں ہوا، اس کے متعلق ابوالفضل کے والد کہتے تھے کہ وہ جانوروں کی طرح[68] کچھ بھائیں بھائیں کر لیتا ہے۔

شیخ مبارک کے ذوقِ موسیقی سے اس کے بیٹوں کو بھی وافر حصہ ملا تھا، چنانچہ فیضی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا ماہر تھا۔[69] شیخ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں جس طرح موسیقی کے زیروبم پر بحث کی ہے وہ خود اس کے ماہرِ فن ہونے کی دلیل ہے۔

اکبر کے اتالیق بیرم خان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ موسیقی کا بڑا دلدادہ اور موسیقاروں کا سرپرست تھا۔ اس کا ایک واقعہ محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں نقل کیا ہے۔ آزاد لکھتا ہے کہ "رام داس لکھنوی، سلیم شاہی زمانہ کا گویا تھا کہ موسیقی میں دوسرا تان سین کہلاتا تھا۔ وہ اس کے دربار میں آیا اور گایا۔ خزانہ میں اس وقت کچھ نہ تھا، اس پر لاکھ

---

[67] پروفیسر علم الدین سالک، نقوش لاہور نمبر ۱۹۶۲ء، ص ۴۶۸، ۴۶۷۔ بدایونی نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ، جلد ۲، ص ۲۶۵
[68] شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد ۳، مطبوعہ ظفر بک ڈپو، لاہور، ص ۱۴۱۔

روپیہ دیا۔ اس کا گانا بہت پسند تھا۔ چنانچہ خلوت و جلوت میں محرم اور ہمدم تھا۔ جب وہ گاتا تھا خانخاناں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک جلسہ میں نقد جنس جو اسباب موجود تھا سب دے دیا اور آپ الگ اٹھ گیا[۹۹] بیرم خان کے فرزند عبدالرحیم خانخاناں کو اس فنِ لطیف کے ساتھ جو مناسبت تھی اس کے ذکر کے لئے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ جس کی اس مضمون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

عہدِ اکبر کے موسیقاروں میں سورداس اور تلسی داس کا بھی بہت اونچا مقام ہے۔ ان کا چونکہ دربار سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے فارسی تذکروں اور تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ یہ دونوں تارک الدنیا سادھو سنت تھے اس لئے ہندوؤں کی روایات میں ان کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، بلکہ ہندو تو ان کے سامنے تان سین کو بھی طفلِ مکتب ہی سمجھتے ہیں۔ اسی ضمن میں چتوڑ کی شہزادی میرابائی کا ذکر بیجا نہ ہوگا۔ میرابائی رانا سانگا کے ولی عہد کی دھرم پتنی تھی، لیکن عین نوجوانی کے عالم میں بیوہ ہوگئی۔ میرابائی نے دُنیاوی لذات سے مُنہ موڑ کر ایشور کے ساتھ لو لگا لی اور فقیرانہ بھیس میں راجستھان کے قریہ قریہ میں گھومنے لگی۔ وہ بڑی اچھی شاعرہ تھی اور اس پر طرہ یہ کہ موسیقی کا ذوق بھی کما حقہٗ پایا تھا۔ اس پہ خاوند کی موت کا صدمہ مستزاد تھا۔ ان سب عوامل نے مل کر اُسے بڑی اچھی گلوکارہ بنا دیا۔ میرابائی کے بھجن آج تک گائے جاتے ہیں اور وہ ہندی لٹریچر کا بہترین سرمایہ ہونے کے علاوہ فنِ موسیقی

---

[۹۹] محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء، ص ۱۹۴

کا بھی بیش بہا سرمایہ ہیں۔ عطیہ بیگم فیضی نے میرابائی کی بحیثیت موسیقار بڑی تعریف کی ہے[۱۰۰]

اکبر کے عہد میں گوالیار اور بلگرام موسیقی کے مرکز مانے جاتے تھے۔ اکبر کے دربار کے اٹھارہ گوّیوں میں سے گیارہ گوالیار کے رہنے والے تھے[۱۰۱] ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ مان سنگھ تنوار نے گوالیار میں ایک میوزک اکیڈمی قائم کی تھی، جہاں سے بڑے بڑے گوّیے تربیت پا کر نکلے۔ مان سنگھ کے بعد محمد عادل شاہ اور پھر حضرت محمد غوث گوالیاری نے اس کی روایات کو برقرار رکھا، وہ دن اور آج کا دن، گوالیار دنیائے موسیقی کی راجدھانی سمجھا جاتا ہے۔ بلگرام کے متعلق ابوالفضل رقمطراز ہے کہ وہاں کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں۔[۱۰۲]

جہانگیر بھی اپنے باپ کی طرح موسیقی کی سرپرستی کرتا رہا۔ اس کے دربار میں اُستاد محمد نائی، شوقی طنبورہ نواز، باتیا، جہانگیر داد، چتر خان، حافظ عبداللہ، حافظ نادعلی، نصیرا، حافظ چیلہ، حافظ کیب فتحا، رحیم داد خان، پرویز داد، خرم داد، ماکھو اور حمزہ جیسے نادر روزگار ماہرین موسیقی موجود تھے۔ ان میں سے اکثر کے کمالِ فن کا اعتراف اس نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ جہانگیر اُستاد محمد نائی کا بڑا قدردان تھا۔ ایک موقع پر

---

[۱۰۰] دی میوزک آف انڈیا، مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء، ص ۲۳

[۱۰۱] ٹی۔ ڈبلیو۔ ہیگ، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مطبوعہ لیڈن، آرٹیکل "تان سین"

[۱۰۲] آئینِ اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۴۳۲

وہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

استاد محمد نائی را که در فنِ خود از بے نظیران بود، فرزند خرم بموجب طلب فرستادہ بود، چند مجلس سازِ او شنیدہ شد و نقشی که در غزل بنامِ من بستہ بود گذرانیدہ در دوازدہم ماہ مذکور فرمودم که او را بروپیہ وزن نمودند، شش ہزار و سیصد روپیہ و فیلِ حوضہ داری نیز باو عنایت نمودہ، مقرر فرمودم که بر آن فیل سوار شدہ و زرہا بر اطراف و جوانب خود چیدہ و پاشیدہ بمنزلِ خود برد[43]

اُستاد محمد نے نواز کو، جو اپنے فن میں یکتا تھا، میرے کہنے پر خرم نے میرے پاس بھیج دیا۔ چند مجلسوں میں میں نے اُس سے ساز سنا اور اس نے جس غزل کی لے میرے نام سے تیار کی تھی، اس کا بھی مظاہرہ کیا۔ ماہ مذکور کی بارہ تاریخ کو میں نے حکم دیا کہ اسے روپوں کے برابر تولا جائے۔ چھ ہزار تین سو روپے اور ایک ہاتھی مع ہودج اُسے عنایت کیا میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے گھر جائے اور راستے میں دونوں طرف روپے پیسے برساتا جائے۔

اکبر نے بھی بڑی دریا دلی کے ساتھ موسیقاروں کی سرپرستی کی تھی، لیکن جس انداز سے جہانگیر نے ایک نے نواز کو نوازا تھا اس کی مثال عہدِ اکبر میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ جہانگیر شوقی طنبورہ نواز کے کمالِ فن کا بھی بڑا معترف تھا، اس نے اپنی تزک میں اُسے ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

شوقی طنبورہ نواز را که از نادرہائے

شوقی طنبورہ نواز کو، جو زمانے بھر میں

---

[43] تزکِ جہانگیری، سر سید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶

روزگار است و نغمات ہندی و پارسی را بروشی میگوید که زنگ از دلہا زداید، بخطاب آنند خانی دلخوش و مسرور ساختم، آنند بزبان ہندی خوشی و راحت را می گویند[44]

اپنے فن میں یکتا ہونے کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی نغمات اس انداز سے گاتا ہے کہ انہیں سن کر دلوں کا زنگ اتر جاتا ہے، میں نے آنند خان کا خطاب دے کر خوش اور مسرور کیا۔ ہندی زبان میں آنند خوشی اور راحت کو کہتے ہیں۔

معتمد خان نے اقبال نامہ جہانگیری میں دربارِ جہانگیر کے تیرہ سو موسیقاروں کا ذکر کیا ہے جو اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے[45]۔ جہانگیر کے درباری موسیقاروں میں رحیم داد خان کا بڑا اونچا مقام تھا، وہ طنبوڑی کا رہنے والا اور اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا جہانگیر کے حکم سے اس نے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کروایا تھا[46]

اکبر کے عہد میں یعقوب نام کا ایک عیسائی تاجر حلب سے بسلسلۂ تجارت آگرہ آیا۔ وہ کئی زبانوں کا ماہر تھا، پرتگیزوں کے ساتھ مذہبی مذاکرات کے سلسلہ میں اکبر کو فارسی اور پرتگیزی زبانیں جاننے والے مترجم کی ضرورت تھی، چنانچہ اکبر نے یعقوب کو ملازم رکھ لیا، روائت ہے کہ یعقوب نے دینِ الٰہی قبول کر لیا تھا۔ یعقوب کی وفات کے بعد اکبر نے اس کے نو عمر بیٹوں ذوالقرنین اور سکندر کی تربیت اپنی نگرانی میں کی اور اول الذکر کو

---

[44] ایضاً، ص ۱۶۲

[45] اقبال نامہ جہانگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۳۰۸

[46] آغا صادق، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۰ء، ص ۶۱

موسیقی کی تعلیم دلائی۔ ذوالقرنین کو موسیقی پر مکمل دسترس حاصل تھی اور وہ جہانگیر اور بعد ازاں شاہجہان کے دربار میں اساتذۂ فن کی موجودگی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا[77]۔ شاہنواز خان نے بھی ذوالقرنین کو بحیثیت موسیقار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

عہدِ جہانگیر میں ٹھٹھہ کا گورنر عیسٰی خان ترخان بھی موسیقی کا بڑا اونچا ذوق رکھتا تھا۔ شاہنواز خان اس کے متعلق لکھتا ہے۔

| | |
|---|---|
| دِل دادہ راگ و رنگ بود، و در نغمہ | وہ راگ رنگ کا دلدادہ تھا، راگ |
| خوانی و ساز نوازی خالی از کمال | گانے اور ساز بجانے میں بھی بڑا کمال |
| بنود[79] | رکھتا تھا۔ |

عہدِ اکبر کی طرح عہدِ جہانگیر میں بھی شاہی تقریبات اور جشنوں کے موقع پر گویّے اور سازندے پیش ہوتے تھے۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد جب پہلا نوروز منایا تو نوروز کی تقریبات میں اہلِ ساز و نغمہ نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا[80]۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں گیارھویں سالِ جلوس میں نوروز کے موقعہ پہ حافظ ناد علی کو انعام دینے کا ذکر کیا ہے[81]۔

---

[77] ڈاکٹر عبدالحلیم، ایسیز اِن ہسٹری آف انڈو پاک میوزک، مطبوعہ ڈھاکہ ۱۹۶۲ء، ص ۲۱، ۲۲

[78] مرآت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب۔

[79] شاہنواز خان، مآثر الامراء، جلد ۳، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۲۹۲

[80] تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۲۲

[81] ایضاً، ص ۱۵۵

سولھویں سالِ جلوس میں جب جہانگیر طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوا تو نورجہاں نے اس خوشی میں ایک جشن آراستہ کیا جس میں اہلِ نشاط موجود تھے[82]۔

جہانگیر قوالی کا بھی دلدادہ تھا اور اس کی مجلسِ سماع میں صوفیانِ باصفا کو وجد آجاتا تھا۔ ایک بار دہلی کے قوال اس کے حضور میں قوالی پیش کر رہے تھے اور جب اُنھوں نے امیر خسرو کا یہ شعر پڑھا۔

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

تو ملّا علی احمد مُہرکن کو وجد آگیا۔ اُنھوں نے بھی اپنی ٹوپی ذرا ترچھی کر لی اور تڑپ کر زمین پر گر پڑے، جہانگیر نے لپک کر ان کا سر اُٹھایا تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی[83]۔

بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے مرنے کے ساتھ ہی موسیقی کو زوال آگیا تھا اور شاہجہان کی زر پاشیوں کی بدولت اسے دوبارہ عروج ہوا، لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ جن گویّوں نے شاہجہان کے عہد میں نام پایا ان کی تربیت جہانگیر کے عہد میں ہوئی تھی، اس لیے جہانگیر کے دور کو فنِ موسیقی کے زوال کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ اب رہا یہ اعتراض کہ جہانگیر کا دَور اگر موسیقی کے زوال کا دور نہیں تھا تو پھر اس عہد کے تذکروں میں موسیقاروں کا ذکر زیادہ کیوں نہیں ملتا۔

---

[82] ایضاً۔ ص ۳۳۵۔

[83] ایضاً۔ ص ۸۲۔

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اکبر کے ساتھ اس کے درباری گویّے تو نہیں مر گئے تھے، اس لیے جن گویّوں کا ذکر اکبر کے عہد کی تاریخوں اور تذکروں میں آ چکا تھا، اُسے عہدِ جہانگیری میں دہرانا مناسب نہیں سمجھا گیا، اسی طرح جو گویّے عہدِ جہانگیر میں ابھی مبتدی تھے اور انھوں نے عہدِ شاہجہان میں شہرت پائی، ان کا ذکر عہدِ شاہجہان میں لکھی جانے والی تاریخوں میں آیا ہے۔

شاہجہان اپنے آباؤ اجداد کے تمام اوصافِ حمیدہ سے متصف تھا اور اس کے دل میں علمی ذوق ہر وقت موجزن رہتا تھا، لیکن اس کا حسنِ ذوق علم و ادب یا تزک نویسی کی بجائے جامع مسجد دہلی کی ندرت اور نفاست میں ظاہر ہوا۔ ایک ماہرِ فن کے بقول اس نے محبت کا فلسفہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج محل میں منظوم کیا۔ اس کے تمام ہم عصر مؤرخ اس بات پہ متفق ہیں کہ اس نے زندگی بھر نماز باجماعت اور تہجد قضا نہیں کی، لیکن اس علم و فضل اور نیکی و تقویٰ کے باوجود وہ فنِ موسیقی کی سرپرستی میں اپنے باپ اور دادا سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔

سرجدوناتھ سرکار اپنی تصنیف "سٹڈیز ان مغل انڈیا" میں رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی اپنی آواز بڑی سریلی تھی اور خدا تعالیٰ نے اُسے لحنِ داؤدی عطا کیا تھا، جب وہ بات کرتا تو سننے والے بت بن جاتے تھے۔[۸۴] اسی ضمن میں مؤرخ شہیر ایشوری پرشاد لکھتا ہے کہ بادشاہ نے خود کئی ہندی راگ ایجاد کیے تھے، جو اس قدر جوش کن اور دلکش تھے کہ سماع کی

---

[۸۴] سرجدوناتھ سرکار، سٹڈیز اِن مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۹ء، ص ۱۳

محفلوں میں صوفیائے باصفا انھیں سن کر گھنٹوں وجد کے عالم میں رہتے تھے۔[۸۵]

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں "قواعد السلطنت شاہجہان" نام کی ایک کتاب موجود ہے جو بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فتح الملک بہادر کے کتب خانہ میں رہ چکی ہے۔ اس کا مصنف لکھتا ہے کہ شہنشاہِ معظم کو ایرانی، کشمیری اور ہندوستانی راگ راگنیوں سے خاص لگاؤ تھا اور وہ بسا اوقات نصف شب تک ان سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔[۸۶] سرجدوناتھ سرکار کی تحقیق کے مطابق شاہ جہان رات کے ساڑھے آٹھ بجے حرم میں چلا جاتا اور وہاں دو تین گھنٹے تک موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔[۸۷] عہدِ حاضر میں شاہجہان کا مشہور سوانح نگار بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت امورِ سلطنت سے فارغ ہو کر تھکان دور کرنے کے لیے غروبِ آفتاب سے قبل موسیقی سے محظوظ ہوا کرتے تھے اور معمول کے مطابق رات کو سونے سے پیشتر بھی سماع سنتے تھے۔ رات کی محفلوں میں عام طور پہ گانے بجانے پر کنیزیں مامور تھیں۔ اس کے علاوہ شاہی دربار میں بھی خاص جشنوں کے موقع پہ راگ رنگ کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا، جس میں اساتذۂ فن حصہ لیتے تھے۔[۸۸]

اسی ضمن میں شاہجہان کا ایک ہم عصر مؤرخ امین قزوینی رقمطراز ہے کہ

---

[۸۵] ایشوری پرشاد، اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول اِن انڈیا، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۳۶ء، ص ۶۱۶

[۸۶] قواعد السلطنت شاہجہانی، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی، ورق ۱۴ ب

[۸۷] سٹڈیز اِن مغل انڈیا، ص ۱۳

[۸۸] بنارسی پرشاد سکسینہ، ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی، مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۶۲ء، ص ۳۳۷

بادشاہ اکثر اوقات ساز و نغمہ سے جی بہلاتا ہے۔ اُسے ہندی نغمات کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ ہے اور جو اس فن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں موسیقی سے زیادہ اور کسی چیز میں لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہندوستانی موسیقی پر بادشاہ کی بڑی گہری نظر ہے اور اس کے علاوہ ایرانی اور غیر ملکی موسیقی سے وہ بڑی حد تک واقف ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ دوسرے ممالک کے لوگ نغمہ و لحن پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن ہندوستانی نزاکت اور معانی کے قدرداں ہیں۔ بادشاہ عموماً نماز مغرب کے بعد موسیقی سنتا ہے۔ اور مجلس موسیقی برخاست کر کے نماز عشاء باجماعت ادا کرتا ہے۔[89]

نائک بخشو کو فوت ہوئے ایک زمانہ گذر چکا تھا لیکن شاہجہان کو اس کے کمالِ فن کا اعتراف تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں وقت گذرنے کے ساتھ اس نادرِ روزگار موسیقار کا فن بھی ختم نہ ہو جائے۔ شاہجہان نے ماہرینِ فن کو مامور کیا کہ وہ بخشو کے گائے ہوئے دھرپد راگ جمع کریں۔ انھوں نے شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد ہزار دھرپد نائک بخشو کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ حسنِ اتفاق سے یہ کتاب زمانہ کی دست برد سے بچ کر بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں محفوظ ہے۔[90] شاہجہان کے عہد کے اکثر گویوں کا مدار بخشو کی تصانیف پر تھا۔

---

[89] قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۱۲۱ ب

[90] زخاؤ اینڈ ایتھے، فہرست مخطوطات فارسیہ و ترکیہ وغیرہ، جلد اوّل، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۹ء، مخطوطہ فارسی ۱۸۴۶

اس حقیقت کا اعتراف شاہجہان کے درباری مؤرخ عبدالحمید لاہوری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| امروز مدار خنیاگران ہندوستان | آج کل ہندوستان بہشت نشان کے |
| بہشت نشان بر تصانیف بخشو و تصانیف | گویوں کا دار و مدار نائک بخشو اور |
| اوست[91] | اس کی تصانیف پر ہے۔ |

بادشاہنامہ میں قزوینی نے بھی بخشو نائک کو دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دور میں بخشو کی طرز خاص و عام میں مقبول ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس جیسی — صورت و صدا و حسن و ادا — کے ساتھ کوئی نہیں گا سکتا۔[92] اس بات کا اعتراف عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے کہ عہدِ شاہجہان میں بخشو جیسی ٹیپ دوسرے نغمہ سرا ادا نہیں کر سکتے۔[93]

شاہجہان کے ذوقِ موسیقی کا اندازہ اِس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ لال قلعہ کے نوبت خانہ میں گویے موجود رہتے تھے جو دن کے پہروں کو راگوں اور راگنیوں کے ذریعے بتایا کرتے تھے۔ شاہجہان کے عہدِ حکومت میں شادی بیاہ کی تقریبات اور درباری جشن بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوتے تھے۔ بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ، جشن نوروز، جشن وزن قمری جشن وزن شمسی کے موقعوں پر جو تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں موسیقی کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ پیش کیے جاتے تھے۔

---

[91] عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۷۔

[92] محمد امین قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۲۴۲ ب

[93] بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۶۔

محمد صالح کمبوہ سنہ ۱۰۴۲ھ کے واقعات کے ضمن میں رقمطراز ہے کہ جب شہزادہ داراشکوہ کا عقد شہزادہ پرویز کی بیٹی نادرہ بیگم سے ہوا تو اس موقع پر "مطربان ہفت کشور" موجود تھے اور اُنھوں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا۔[94] اس جشن کی تفصیل ذرا قزوینی کی زبانی سنئے۔

جشنے عظیم بود و آواز خوش و
آہنگ دلکش مطربان و خنیاگران
ہوش از سرِ ناہید می ربود[95]

یہ بڑا عظیم جشن تھا۔ سازندوں
اور گویوں کی دلکش اور سریلی آواز نے
ناہید ستارے کے بھی ہوش اُڑا دیے تھے۔

داراشکوہ کے عقد کے چند روز بعد ہی شہزادہ شجاع کی شادی رستم میرزا صفوی کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تو اس موقعہ پر آتشبازی کا بہترین مظاہرہ ہوا اور مشہور و معروف گویوں نے موسیقی کا رنگا رنگ پروگرام پیش کیا۔[96] لطف کی بات یہ ہے کہ جب سنہ ۱۰۴۶ھ میں شاہجہان نے اپنے دلی صفت بیٹے اورنگ زیب کا عقد شاہنواز خان کی بیٹی دلرس بانو سے کیا تو اس تقریب پر موسیقاروں نے موسیقی کا ایسا عمدہ پروگرام پیش کیا کہ بقول عبدالحمید لاہوری آسمان والوں نے کئی روز تک زمین سے سوائے نغمات کے اور کوئی آواز نہیں سنی۔[97]

---

[94] شاہجہان نامہ، جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۴۰۶۔

[95] بادشاہ نامہ، ورق ۲۶۴ الف [96] شاہجہان نامہ، جلد دوم، ص ۴۱۴

[97] بادشاہ نامہ، جلد دوم، ص ۲۶۸ = "از نغمہ و نغمات مطربان سحر پرداز عیش و طرب را روز بازاری و سرور و انبساط را سر و کاری دیگر شدہ، بگوش آسمانیان جز صدای کامرانی نمی رسید و سامعۂ زمینیان جز آوای شادمانی نمی شنید۔"

سنہ ۱۰۵۴ھ میں جب شہزادی جہاں آرا نے غسل صحت کیا تو اس خوشی میں ایک شاہانہ جشن منایا گیا جس پر بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ صرف ہوا، اس موقعہ پر تمام شعراء اور موسیقاروں کو خلعت عطا کئے گئے اور نقد انعام سے بھی نوازا گیا۔ عبدالحمید لاہوری نے خصوصیت کے ساتھ لعل خان کلاونت اور اس کے بیٹوں کا ذکر کیا ہے جنہیں دو ہزار روپے مرحمت ہوئے تھے۔[98]

شاہجہان کے عہد میں دکن، کرناٹک، تلونڈی اور گوالیار موسیقی کے بڑے مرکز تسلیم کئے جاتے تھے، اکبر کے دربار کے اکثر و بیشتر گویے گوالیار سے ہی آئے تھے، شاہجہان کے درباری گویوں کی اکثریت بھی گوالیار ہی کی رہنے والی تھی۔ اودھ میں بلگرام موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بلگرام کے باشندے اپنی فہم و فراست میں مشہور اور موسیقی کے دلدادہ ہیں۔[99] مشرقی پنجاب میں تلونڈی موسیقی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اس قصبہ کی خاک سے بڑے بڑے ماہرینِ فن پیدا ہوئے جنہوں نے موسیقی کی نوک پلک سنوارنے اور اسے عروج پر پہنچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ رحیم داد خان جس نے جہانگیر کے حکم سے شہزادوں کو موسیقی کے زیر و بم سے متعارف کر دیا تھا، تلونڈی ہی کا رہنے والا تھا۔[100]

---

[98] ایضاً، ص ۴۰۰

[99] آئین اکبری، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، ص ۴۳۲

[100] آغا صادق، ماہنامہ قند مردان، موسیقی نمبر مئی جون ۱۹۶۳ء، ص ۶۱

سیف خان رقمطراز ہے کہ شاہجہان کی تخت نشینی کے بعد ہی قلمرو موسیقی کی تخت گاہ گوالیار سے بہت سے فن کار شاہی دربار میں چلے آئے اور ان میں سے اکثر فنکار موسیقی کی جدید دھنوں اور گوالیار کی نئی بندشوں اور ترکیبوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس طرح مغلوں کے دربار میں ایرانی موسیقی کے ساتھ ہندوستانی موسیقی بھی جگہ حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گئی۔ اکبر کے زمانہ اقتدار میں ہی ہندوستانی موسیقی کو کافی اونچا مقام مل گیا تھا۔ ہندی اور ایرانی موسیقی کے اختلاط سے ایک نیا فن پیدا ہو رہا تھا جس میں ایرانی ترکیبوں اور ہندوستانی بندشوں نے مل کر دلکشی پیدا کر دی تھی۔ شاہجہان نے کشمیری دھنیں بھی اس میں شامل کر کے ایک نیا مکتب موسیقی قائم کیا۔[101]

الناس علیٰ دین ملوکہم کے مصداق شاہجہان کی دیکھا دیکھی اس کے درباری امراء بھی موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔ صاحبِ مآثر الامراء شاہنواز خان صفوی کے متعلق لکھتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ہم دل دادۂ راگ و نغمہ، خوانندہ و سازندہ، کہ نزد او فراہم آمدہ بودند در ہیچ سرکارے در آن وقت نبودہ۔[102] | وہ راگ و نغمہ کا دلدادہ تھا، اور جتنے گوئیے اور سازندے اس نے اپنے ہاں جمع کئے تھے، اتنے اس زمانے میں کسی دوسرے کے پاس نہ تھے۔ |

اسی تذکرہ نویس نے شاہجہان کے ایک درباری امیر حسام الدین خان

---

[101] محمد اسلم، شاہجہان کا ذوق موسیقی، امروز سنڈے ایڈیشن ۹ مارچ ۱۹۶۸ء، ص ۷۔

[102] شاہنواز خان، مآثر الامراء، جلد دوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۰ء، ص ۶۷۵۔

کے سوانح حیات مرتب کرتے وقت اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| در فنِ موسیقی بسیار ماہر، خوش محاورہ، بدیہہ گوئی سخندان بود۔[103] | وہ فنِ موسیقی میں مہارت رکھنے کے علاوہ اپنی خوش کلامی اور حاضر جوابی کے لئے بھی مشہور تھے۔ |

یہی تذکرہ نگار زین خان کوکہ کے فرزند مغل خان کے متعلق لکھتا ہے۔

| | |
|---|---|
| شکار دوست بود و بنغمہ و سرود شیفتگی داشت، سازندہ و نوازندہ بسیار فراہم آوردہ۔[104] | وہ شکار کے علاوہ نغمہ و سرود کا بھی بڑا دلدادہ تھا اور اس نے بہت سے گوئیے اور سازندے جمع کر لئے تھے۔ |

بدھ سنگھ ہاڈہ راجہ بوندی کا فرزند، شاہزادہ محمد معظم، کا مصاحب تھا اور وہ کابل میں رہتا تھا۔ اس کے متعلق شاہ نواز خان رقمطراز ہے۔

| | |
|---|---|
| در اقسامِ نغمہ قدرت تمام داشت۔[105] | وہ نغمہ کی مختلف اقسام پر کامل دسترس رکھتا تھا۔ |

شاہجہان کے درباری امراء میں ذوالقرنین فرنگی بھی اپنے ذوق موسیقی کی وجہ سے بڑا مشہور تھا، اس کا ذکر اس مضمون میں جہانگیر کے عہد میں ہو چکا ہے۔

راجہ روز افزوں کا بیٹا عیدے سنگھ بھی موسیقی کا بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا۔

---

[103] ایضاً، جلد اوّل، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء، ص ۵۸۶

[104] ایضاً، جلد سوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۴۹۲

[105] مرآت آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۶ ب

شاہجہان نے اُسے دولت افزوں کا خطاب عطا کیا تھا۔ اساتذۂ موسیقی کا یہ کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ اور سلطان حسین شرقی کے علم و فن میں بڑی دسترس رکھتا اور خیال و ترانہ خوب گاتا تھا۔[١٠٦]

شاہجہان کے درباری اُمراء میں سیف خان بلاشبہ سب سے بڑا موسیقی دان تھا اور اُس نے اس فن پر ۔راگ درپن۔ کے نام سے ایک قابلِ قدر کتاب بھی تالیف کی ہے۔ یہ کتاب بدقسمتی سے ابھی تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی تاہم اس کے مخطوطے پنجاب یونیورسٹی لائبریری، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں اور ان میں سے اوّل الذکر تینوں مخطوطے راقم السطور کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ یہ وہی سیف خان ہے جس کے متعلق ناصر علی سرہندی نے کہا تھا۔

گفتگوئے طوطی از آئینہ می خیزد علے
گر نباشد سیف خان ما را نفس در کار نیست[١٠٧]

اسی سیف خان کے متعلق شاہنواز خان لکھتا ہے۔

| | |
|---|---|
| ہموارہ در حضور بادشاہی دولت بار | وہ ہر وقت بادشاہ کے حضور میں رہتا تھا |
| می افروخت و بدوام روشناسی خود | اور اسی حضور دوام کی وجہ سے انعام و اکرام |
| را در خور نوازش می ساخت[١٠٨] | سے سرفراز ہوتا رہتا تھا۔ |

---

[١٠٦] محمد اکرم امام خان، معدن موسیقی، مطبوعہ لکھنؤ ١٩٢٥ء، ص ٢٨۔
سیف خان نے اس کا نام عدیل سنگھ لکھا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے (راگ درپن ورق ٤٧ب)

[١٠٧] دیوان ناصر علی سرہندی، مطبوعہ نظامی پریس دہلی ١٢٩٢ھ، ص ٢٢۔

[١٠٨] مآثر الامراء، جلد ٢، ص ٢٨٠۔

ایک دوسرے موقع پر شاہنواز خان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:-

| | |
|---|---|
| در فن راگ و نغمہ بسیار ماہر بود[١٠٩] | وہ راگ و نغمہ کے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ |

اس کی تالیف ۔راگ درپن۔ بذاتِ خود سیف خان کے ماہرِ موسیقی ہونے پر دال ہے۔

شاہی دربار کے علاوہ صوفیائے کرام کی خانقاہیں بھی اس دور میں موسیقی کا گہوارہ بن گئی تھیں۔ عہدِ شاہجہان میں قادریہ سلسلہ کی ترویج کے ساتھ سماع کو بھی فروغ ہوا اور اس سلسلہ کے بزرگوں نے دل کھول کر گویوں کی سرپرستی کی۔ قادری بزرگوں کے علاوہ شطاریہ سلسلہ کے درویشوں نے بھی موسیقی کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس جگہ ایک شطاری بزرگ شیخ پیر کا ذکر بیجا نہ ہوگا جو عہدِ شاہجہان میں میرٹھ میں رہتے تھے۔ انہیں قدرت نے ذوقِ موسیقی ودیعت کیا تھا۔ اور ان کی خانقاہ میں ہر وقت شعر و نغمہ کی محفل جمی رہتی تھی۔ شاید اسی سبب سے ان کے ہم عصر انہیں۔ صاحبِ رونقِ اسباب غنا۔ کہتے تھے۔[١١٠] طبقاتِ شاہجہانی کا مؤلف ان کے متعلق رقمطراز ہے:-

| | |
|---|---|
| بوجد و سماع میلانِ خاطر عظیم داشت | وجد و سماع کی طرف ان کا میلان بہت |
| و نغمہائے ہندی می بست و سرہائے | زیادہ تھا اور وہ خود بھی ہندی راگ |
| بزرگان خود می کردہ و مجلس ہا عالی برپا | ترتیب دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے بزرگوں کے |

---

[١٠٩] ایضاً، ص ٤٨٤

[١١٠] محمد صادق، طبقات شاہجہانی، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ١٦٧٣، ورق ٣١٢ب

نمود و نقشہائے وی تاثیر عجب
وارد[111]

عرس مناتے اور اس موقع پر بڑی بڑی مجالس منعقد کرتے۔ ان کے مرتب کردہ راگوں میں ایک عجیب اثر ہوتا تھا۔

شیخ پیر میرٹھی کے انتقال پر محمد صادق نے یہ تاریخ کہی تھی[112]

گفت تاریخ وفاتش خرد دور اندیش
وہ کہ از مردنِ وی بی سروپا شد نغمہ

اگر نغمہ کے سر اور پاؤں یعنی "ن" اور "ہ" حذف کر دئے جائیں تو "غم" باقی رہ جاتا ہے اور حروفِ ابجد کے حساب سے اس کے عدد ۱۰۴۰ھ بنتے ہیں اور یہی ان کا سالِ وفات ہے۔

راگ درپن میں سیف خان نے عہدِ شاہجہان کے جن ۴۳ موسیقاروں کا ذکر کیا ہے ان میں صوفی بہاؤالدین سرِ فہرست ہیں۔ آپ جھنجھانہ کے ایک قریبی گاؤں برناوہ کے رہنے والے تھے لیکن سیر و سیاحت کا شوق انہیں اوائل عمر میں ہی دکن لے گیا۔ وہاں آپ نے ۲۵ سال درویشوں کی خدمت میں گذارے اور ان کی صحبت میں رہتے ہوئے خود بھی درویش کامل بن گئے۔ آپ ہمیشہ سبز رنگ کا لباس زیبِ تن کرتے تھے۔ سیف خان رقمطراز ہے کہ دکن میں رہتے ہوئے آپ نے سنگیت میں کمال حاصل کیا۔ شاہجہان کے دور میں اس فن میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آپ ترانہ اور خیال بہت اچھا گاتے تھے اور رباب اور بین امرتی بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

---

[111] ایضاً۔

[112] ایضاً، ورق ۳۱۳ الف۔

آپ نے — خیال — نامی ایک ساز بھی ایجاد کیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں آپ دکن سے واپس لوٹے اور بقیہ عمر اپنے آبائی وطن میں فقر و تجرد میں گذار دی۔ سیف خان کی روایت کے مطابق آپ نے ۱۱۰ سال کی عمر پائی[113]۔

شیخ شیر محمد بھی اس دور میں ایک نامور موسیقار اور صاحبِ دل درویش ہوئے ہیں۔ ان کی تربیت صوفی بہاؤالدین اور شیخ نصیرالدین نے کی تھی۔ شیخ نصیرالدین کی دعا سے انہوں نے نغمہ و سرود میں خوب ترقی کی اور سلطان حسین شرقی کی طرز کو مقبول بنانے میں پوری تندہی سے مصروف رہے۔ سیف خان نے انہیں سنا تھا اور اس کے خیال میں وہ "خیال" خوب گاتے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ ان کے گانے میں درد ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ درویشوں کی مجالس میں بڑے مقبول تھے وہ خیال کے علاوہ ترانہ اور تکلہ بھی گا لیتے تھے۔ ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

انہوں نے پٹنہ میں بمرض استسقاء وفات پائی اور اس وقت ان کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[114]۔ عنایت خان راسخ شیخ شیر محمد کو اکبرآباد کے رہنے والے بتاتا ہے اور اس کے خیال میں وہ قوالی کے بھی بڑے ماہر تھے اور گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اس فن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے[115]۔

---

[113] سیف خان، راگ درپن، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، نمبر ۱۴ علوم فارسیہ، ورق ۴۲ ب، ۴۳ الف

[114] ایضاً، ورق ۴۳ الف، ۴۳ ب - ۴۴ الف

[115] عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۳۶۔

میاں ڈالو ڈھاڈھی[116] شیخ شیر محمد کے ہم قوم اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے وہ درویشانہ وضع رکھتے تھے اس لئے اہلِ دولت سے ملنا جلنا انہیں ناپسند تھا۔ سیف خان نے ان کا راگ سن کر یہ کہا تھا۔

در دہر بہ خواندن ہمچو اُو دیگری شنیدہ نشید[117]
ان جیسا دہر میں اور کوئی گویا نہیں گا سکتا۔

سیف خان جیسے فنکار کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ:-

وی سبو بھجوی نواخت کہ مثلِ او دیگری نشدہ و در ہیچ عصری نشنیدہ[118]
وہ گھڑا بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور کسی دور میں بھی ان جیسا فنکار سننے میں نہیں آیا۔

میاں ڈالو نے اکبر آباد میں ذات الجنب کے مرض سے وفات پائی۔ ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔

شیخ شیر محمد کا بھائی لوجا بھی اچھا گویا تھا وہ بعارضہ بھگندر اکبر آباد میں فوت ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی[119]۔ شیخ شیر محمد کا پوتا معین الدین بھی اپنے آبائی فن میں کامل دسترس رکھتا تھا۔ شاہنواز خان کا بیان ہے کہ وہ خیال اور ترہت ہی اچھا گاتا تھا[120]۔ عنایت خان راسخ نے اُسے — رسالہ ذکرِ مغنیان ہندوستان — کی تدوین کے وقت احمد شاہ کے پانچویں سال جلوس میں دیکھا تھا، اس وقت وہ کافی معمر ہو چکا تھا۔

---

[116] ابوالفضل لکھتا ہے کہ ڈھاڈھی پنجابی گویوں کو کہتے ہیں اور وہ ڈھڈہ اور کنگرہ بجا کر گاتے ہیں:- آئینِ اکبری، جلد ۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۷ء، ص ۱۴۲

[117] راگ درپن، ورق ۴۴ ب

[118] ایضاً

[119] ایضاً، ورق ۴۷ الف

[120] مرآتِ آفتاب نما، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ورق ۲۹۷ الف

اس کا یہ کہنا ہے کہ اپنے زمانے میں وہ قوالی اور ترانہ گانے اپنی مثال آپ تھا[121]۔

میاں ڈالو ڈھاڈھی کا شاگردِ رشید شیخ کمال بھی بڑا اچھا گویا تھا۔ سیف خان کے ساتھ اس کی اکثر صحبت رہتی تھی۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت شیخ کمال بقیدِ حیات تھا لیکن نغمہ و سرود سے کنارہ کش ہو کر فوج میں بھرتی ہو چکا تھا[122]۔

کبیر قوال شیخ شیر محمد کا شاگرد تھا اور قوالی کے فن میں اپنے اُستاد سے بھی گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اس نے قوالی کی ایک نئی طرز وضع کی تھی۔ شاہی دربار میں بھی اُسے بڑی عزت کا مقام حاصل تھا[123]۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ زندہ تھا اور سیف خان کو اکثر راگ اور قوالی سے محظوظ کرتا رہتا تھا[124]۔

باقیا نائی بڑی اچھی طبیعت کا مالک تھا۔ اور اس نے ہندوستانی اور ایرانی نغموں کو ملا کر ایک نئی طرز نکالی تھی۔ ماہرینِ فن کا یہ کہنا ہے کہ باقیا نائی کے راگ میں بڑی تاثیر تھی۔ ایک موقع پر اس نے شاہجہان کی مدح میں قصیدہ پڑھا جس کے صلہ میں اُسے اپنے وزن کے برابر پانچ ہزار روپے ملے[125]۔ سیف خان نے روڑا قوال کے فن کی بھی تعریف کی ہے

---

[121] رسالہ ذکرِ مغنیان ہندوستان، ص ۳۶

[122] راگ درپن، ورق ۴۵ ب

[123] رسالہ ذکرِ مغنیان ہندوستان، ص ۳۶،

[124] راگ درپن، ورق ۴۷ الف

[125] برہان الدین، شاہجہان نامہ، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری آذر کلکشن نمبر ۷۶۲، ورق ۱۰۶۳ ب۔

وہ بھی شاہجہان کے حضور میں قوالی پیش کیا کرتا تھا۔[126] شاہجہان کے عہد میں شیخ شیر محمد، کبیر، رسوڑا اور میر صالح بڑے اونچے پایہ کے قوال تھے اور اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت درویشوں کی خانقاہوں میں ہی گزرتا تھا، بلکہ حق تو یہ ہے کہ انہیں کے دم قدم سے کئی خانقاہوں کی رونق قائم تھی۔ پیشہ ور گویوں میں سے جہانگیر کا درباری طنبورہ نواز شوقی ہنوز زندہ تھا۔ وہ ہندی اور ایرانی راگ سے کماحقہٗ واقف تھا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اور سیف خان نے راگ درپن میں اس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔[127]

جگن ناتھ کلاونت شاہجہان کا درباری گویّا تھا اور دھرپد گانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ تان سین کے بعد اس جیسا گوّیا سرزمینِ ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ جب تان سین نے جگن ناتھ کو گاتے ہوئے دیکھا تو بےساختہ کہا کہ اس کے بعد وہ اس فن پر کام کرے گا۔[128] قزوینی ساتویں سالِ جلوس کے واقعات کے ضمن میں اس گویے کے متعلق لکھتا ہے:-

جگنات کلاونت کہ بخطاب مہاکب رائے نامور است و در ساختن تصنیف ہندی

و پیدا کردن معانی بلند و مضامین عالی امروز نظیر ندارد و بندگان حضرت او را بواسطہ بستن تصانیف کہ ہندیان آنرا دُرپت گویند در دار السلطنت لاہور گذاشتہ بودند سعادت اندوز ملازمت گشتہ دوازدہ تصانیف کہ بنام ہمیون آنحضرت بمضامین تازہ در نغمات مختلف ساختہ بود بحضور اشرف خواند دلپسند خاطر مشکل پسند بادشاہ دانش ور نکتہ دان افتاد و برحسب اشارہ علیہ اورا بزر وزن کردہ چہار ہزار و پانصد روپیہ کہ ہم سنگ او بر آمد باو مرحمت فرمودند[129]

جگن ناتھ کلاونت، جو مہاکب رائے کے لقب سے مشہور ہے، بلند پایہ اور معنی خیز ہندی راگ تصنیف کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ بادشاہ سلامت نے اُسے ہندی راگ جنہیں دھرپد کہتے ہیں تصنیف کرنے کے لئے لاہور میں چھوڑا ہوا تھا، حضور میں باریاب ہوا۔ اس نے وہ بارہ راگ جو بادشاہ کے نام پر مرتب کئے تھے حضور میں پیش کئے جو دانشور اور نکتہ ور بادشاہ کی مشکل پسند طبیعت کو پسند آئے۔ بادشاہ کے حکم سے اُسے روپوؤں کے عوض تولا گیا اور اس کے وزن کے برابر چار ہزار پانچ سو روپے اُسے مرحمت ہوئے۔

عہد شاہجہان کے تمام مؤرخین نے جگن ناتھ کے کمالِ فن کا بڑی فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی "متعصب" شاہجہان ہے جس نے خطۂ بنارس میں ۷۶ مندر مسمار کروا دیئے تھے۔ شاہجہان نے جہاں قاضی محمد اسلم ہرویؒ اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ جیسے جیّد اور مستند علماء کو روپوں کے عوض تلوایا تھا وہاں اس نے جگن ناتھ جیسے

---

[126] راگ درپن، ورق ۴۷ الف

[127] i۔ تزک جہانگیری، سرسید ایڈیشن، مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۴ء، ص ۱۸۶۔
ii۔ راگ درپن، ورق ۴۹ ب

[128] ایضاً، ورق ۴۵ الف۔

[129] محمد امین قزوینی، بادشاہنامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۷۳، ورق ۳۲۹ ب

ہندو موسیقی دان کی بھی ویسی ہی عزت افزائی کی ہمارے خیال میں جہاں تک علم و فن کا تعلق ہے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی نظر میں مساوی تھے۔

مسلمان موسیقاروں میں دربارِ شاہجہان میں لعل خان کلاونت کا بڑا اونچا مرتبہ تھا۔ لعل خان ابھی نوعمر ہی تھا جب وہ تان سین کی خدمت میں اکتسابِ فیض کی غرض سے حاضر ہوا۔ تان سین نے کمال توجہ سے اس کی تربیت شروع کی۔ ابھی یہ نوآموز ہی تھا کہ تان سین کو پیغامِ اجل آ پہنچا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے فرزند بلاس خان نے اُسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ جب وہ اس فن میں خوب طاق ہو گیا تو بلاس خان نے اپنی بیٹی اس کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سیف خان نے اُسے اپنے وقت کا سب سے بڑا دھرپد راگی لکھا ہے[۱۳۰] عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ سے بھی سیف خان کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔[۱۳۱]

شاہجہان کے دربار میں اس کا بڑا عالی رتبہ تھا اور وہ تان سین کی جگہ پر کھڑا ہو کر اپنا راگ پیش کیا کرتا تھا۔ شاہجہان کو چونکہ دھرپد راگ بے حد مرغوب تھا اس لئے وہ لعل خان کی بڑی قدر کیا کرتا تھا اور ہر جشن کے موقع پر اُسے انعام و اکرام سے لاد دیا کرتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری کی روایت کے مطابق ایک بار بادشاہ نے اس کا راگ سُن کر اُسے گن سمندر کا خطاب اور ایک ہاتھی بطور انعام دیا تھا۔[۱۳۲]

---

[۱۳۰] راگ درپن، ورق ۴۴ ب

[۱۳۱] بادشاہنامہ، جلد ۲، ص ۵ — "در عہد سعادت مہد سرآمد نغمہ سرایان ہندوستانی نبان است و در خواندن دھرپد ھای او بروش او عدیل ندارد"

[۱۳۲] ایضاً، ص ۳۱۱

لعل خان نے ۱۰۶۲ھ میں بعارضہ فالج انتقال کیا، بقول سیف خان وفات کے وقت اس کی عمر اسّی برس کے لگ بھگ تھی۔

لعل خان کے بیٹے خوشحال خان اور بسرام خان بھی شاہی دربار میں ملازم تھے۔ ان میں سے اوّل الذکر کا راگ شاہجہان کو بہت پسند تھا۔ لعل خان کے مرنے کے بعد اس کا منصب خوشحال خان کو ملا اور اُسے بھی تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر گانا پیش کرنے کا شرف حاصل تھا۔[۱۳۳]

عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان نے خوشحال خان کے متعلق ایک بڑا ہی دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خان دربار سے رخصت چاہتے تھے۔ لیکن شاہجہان کسی طرح بھی اُسے رخصت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ مرشد قلی خان نے امیرالامراء کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی خاص موقع پر اس کی درخواست شاہجہان کے حضور میں پیش کر دے گا۔ کئی روز تک یہ دونوں بادشاہ کا موڈ دیکھتے رہے۔ لیکن شاہجہان کا موڈ ہی درست ہونے میں نہ آتا تھا۔ بالآخر ان دونوں نے خوشحال خان کو ایک بڑی رقم کا لالچ دے کر بادشاہ کے حضور میں ایک سحر آمیز راگ پیش کرنے پر آمادہ کر لیا۔ خوشحال خان نے تان سین کے مقام پر کھڑے ہو کر راگ چھیڑا اور جب شاہجہان راگ سننے میں ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا، امیرالامراء نے مرشد قلی خان کی عرضی بادشاہ کے حضور میں پیش کر کے اس پہ بادشاہ کے دستخط کروا لئے۔ جب بادشاہ

---

[۱۳۳] عنایت خان راسخ، رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۶۱ء، ص ۴۵

ہوش میں آیا اور اُسے حقیقت حال معلوم ہوئی تو اس نے خوشحال خان کو تان سین کے مقام پہ کھڑا ہونے سے منع کر دیا۔[۱۳۳]

جگن ناتھ، لعل خان، خوشحال خان اور بسرام خان کا ذکر کرتے ہوئے عہدِ شاہجہان کے مؤرخوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ گویئے تان سین کے بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد تھے اور تان سین کی طرز میں خوب گاتے تھے۔ محمد امین قزوینی اور عبدالحمید لاہوری، دونوں عہد شاہجہان کے نامور مؤرخ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں تان سین کی طرز خواص و عوام میں بہت مقبول تھی۔ قزوینی کے الفاظ ہیں۔

بالفعل طرز تان سین درمیان مردم متداول است چون مدتہا در خدمت حضرت عرش آشیانی بوده طرز و روش و تصانیف او شیوع تمام یافتہ و اکثر کلاونتان این عصر دھرپت ہائی او را می خوانند و بروش تصنیف می سازند۔[۱۳۵]

ان دنوں تان سین کی طرز عوام میں کافی مقبول ہے۔ وہ چونکہ مدت دراز تک اکبر کی خدمت میں رہا تھا اس لیے اس کی طرز، روش اور تصانیف نے خوب رواج پایا۔ اس زمانے کے اکثر کلاونت اس کے مرتب کردہ دھرپد گاتے ہیں یا پھر اس کی لے میں خود مرتب کرتے ہیں۔

گن خان کلاونت بھی شاہجہان کا درباری گویا تھا اور بقول سیف خان وہ علم مارگ میں استاد تھا۔ شہزادہ شجاع کو اس کا راگ بے حد مرغوب تھا،

---

[۱۳۳] ایضاً، ص ۴۶، ۴۵، [۱۳۴] مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۵ ب

[۱۳۵] پادشاہنامہ، ورق ۳۳۰، ۳۳۱ الف

اس لیے اس نے اُسے شاہجہان سے مانگ لیا تھا۔ گن خان کی بقیہ عمر بنگال میں شہزادہ کی خدمت میں گزری اور وہیں اس کا انتقال ہوا۔[۱۳۶] شہزادہ شجاع کا ایک اور مصاحب مصری خان، جو پنجاب کا رہنے والا اور بلاس خان کا شاگرد تھا، اپنے وقت کا بہترین گویا تھا۔ ۱۰۷۶ھ میں راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ہنوز زندہ تھا اور اس کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔[۱۳۷]

ہندو گویوں میں سے اکبر کا ایک ہم عصر گویا جمیر سین شاہجہان کے عہد میں تقریباً اسّی سال کی عمر میں فوت ہوا تھا۔ سیف خان نے اس کا شمار کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ اس کا بیٹا نبل سین عہدِ شاہجہان کے گنے چنے موسیقاروں میں شمار ہوتا ہے۔ بقول سیف خان چالیس برس کی عمر میں اس کے تمام دانت نکل گئے تھے اور چند سال بعد عقل بھی جاتی رہی تھی۔ شاہجہان کے عہدِ حکومت میں ہی پچاس سال کی عمر میں وہ رام جی کو پیارا ہوا۔[۱۳۸]

ایشوری پرشاد کی روایت کے مطابق جنار دھن بیکانیری بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ گاہ گاہے شاہجہان کے حضور میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔[۱۳۹]

---

[۱۳۶] راگ درپن، ورق ۴۶ ب

[۱۳۷] ایضاً، ورق ۴۵ الف

[۱۳۸] ایضاً، ورق ۴۸ الف [۱۳۹] اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۷۶۶ ۔

تلسی رام اور دہرم داس نام کے دو گویے، جن کا شمار سیف خان نے کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے، شاہجہان کے دربار میں ملازم تھے۔ یہ دونوں دین و دھرم سے بیگانہ پایا۔ بالفاظ دگر "زندگی برائے فن" کے قائل تھے۔ اول الذکر نے شاہجہان کے عہد میں ہی انتقال کیا لیکن مؤخر الذکر راگ درپن کی تالیف کے وقت زندہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اب وہ ضعیف ہو چکا ہے اور اس کی آواز بھی خراب ہو گئی ہے۔[۱۴۰]

ان ہندو گویوں میں راقم الحروف کا ہم وطن کب جوت پھلوری بھی بڑا نامور فن کار تھا۔ سیف خان نے بھی اُس کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے اسّی اور نوّے برس کے درمیان عمر پائی اور اپنے وطن مالوف میں ہی فوت ہوا۔[۱۴۱] شاہجہان کے عہد میں سندر گھن نامی ایک موسیقار کی بڑی شہرت تھی۔ شاہجہان نے اُسے اپنے درباری گویوں میں شامل کر لیا تھا۔ تلسی رام اور دہرم داس کی طرح وہ بھی مذہب سے بیگانہ تھا۔[۱۴۲]

سور داس پکھاوجی بھی اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا اور وہ تان سین کے ساتھیوں

---

[۱۴۰] راگ درپن، ورق ۴۷ الف، ۴۷ ب [۱۴۱] ایضاً، ورق ۴۷ ب

[۱۴۲] ایضاً، ورق ۴۷ ب۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سندر گھن اس کا لقب تھا، کیونکہ گھن ایک ساز کا نام ہے وہ گھن بجانے میں ماہر تھا اس لئے اس نے سندر گھن کا لقب پایا۔ اس کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ سیف خان نے بھی اُس کا ذکر اسی لقب کے تحت کیا ہے۔

میں سے تھا۔ جب تان سین گاتا تو یہ اس کے ساتھ پکھاوج بجایا کرتا تھا۔ آخر عمر میں وہ گانے بجانے سے معذور ہو گیا تھا۔ سیف خان نے اُسے دیکھا ہوا تھا اور بقول اُس کے اُس نے سو سال کے قریب عمر پائی۔[۱۴۳]

کرپائی نامی ایک درباری گویا بھی اِسی۔ از دین بیگانہ۔ گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اور بقول سیف خان وہ بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ شاہجہان نے اس سے مردنگ سن کر اُسے مردنگ رائے کے خطاب سے نوازا تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ مردنگ بجانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔[۱۴۴]

تارا چند کلاونت شوقی طنبورہ نواز کا شاگرد تھا لیکن اس نے زیادہ عمر نہیں پائی اس لئے وہ زیادہ نام نہیں پا سکا۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے گنے چُنے فنکاروں میں کیا ہے۔[۱۴۵] ہندو گویوں میں سے سالم چند ڈاکیر بھی اچھا گویا تھا اس کا شمار بھی شاہجہان کے درباری گویوں میں ہوتا ہے۔[۱۴۶]

سرس بین کا شمار بھی شاہجہان کے منظورِ نظر گویوں میں ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی بڑا اچھا گویا تھا اور وہ جہانگیر کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ سرس بین راقم السطور کو اس کا لقب معلوم ہوتا ہے، سیف خان نے اس کا نام نہیں لکھا حالانکہ وہ گاہ گاہے سرس بین سے راگ سنتا رہتا تھا۔[۱۴۷]

---

[۱۴۳] ایضاً، ورق ۴۸ ب [۱۴۴] ایضاً۔ ورق ۴۹ الف

[۱۴۵] ایضاً، ورق ۴۹ ب [۱۴۶] ایضاً، ورق ۴۶ ب

[۱۴۷] ایضاً، ورق ۴۸ ب

مسلمان گویوں میں بابنہ بد بڑا اچھا فن کار تھا اور رباب بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ نوجوانی کے عالم میں اُسے شراب کی لت پڑ گئی اس لیے جلد ہی مر گیا۔ اس کا ایک ہندو شاگرد سکھ سین کلاونت بھی رباب بجانے میں ماہر تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر عہدِ شاہجہان کے ممتاز فن کاروں میں کیا ہے۔[۱۴۸]

الیشوری پرشاد کی روایت کے مطابق شاہجہان کا درباری مؤرخ محمد صالح کنبوہ اور اس کا بھائی ہندی راگ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔[۱۴۹] مسلمان فن کاروں میں فیروز ڈاڈھی پکھاوج بجانے میں، الہداد ڈاڈھی ساکن اُرڈمرٹا ناڈہ سارنگی بجانے میں، ابوالوفا طنبورہ بجانے میں، طاہر ڈاڈھی دُمٹ بجانے میں اور صالح رباب بجانے میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔[۱۵۰] ان میں سے موخرالذکر سیف خان کی سرکار میں ملازم تھا۔ عہدِ شاہجہان میں محمد نامی ایک فنکار بین بجانے میں ملک کے طول و عرض میں مشہور تھا۔ بادشاہ نے ازروِ قدردانی اُسے ——— رس بین ——— کا خطاب دیا تھا۔[۱۵۱]

غلام محی الدین نامی ایک موسیقار فوج میں ملازم تھا۔ آخر عمر میں اس نے فوج کی ملازمت ترک کر کے درویشی اختیار کر لی تھی۔ سیف خان نے اس کے مُرتب کردہ راگوں کی بڑی تعریف کی ہے۔

---

[۱۴۸] الیضاً

[۱۴۹] اے شارٹ ہسٹری آف مسلم رول ان انڈیا۔ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۳۰ء، ص ۷۶۶

[۱۵۰] راگ درپن، ورق ۴۹ الف، ۴۹ب

[۱۵۱] الیضاً۔ ورق ۴۹ الف۔

راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ ابھی بقیدِ حیات تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ لوگوں کی پروا نہیں کرتا اس لیے لوگ بھی اس سے چنداں متعارف نہیں ہیں۔[۱۵۲]

شیخ سعد اللہ لاہوری بھی کسی زمانے میں بڑا اچھا گویا سمجھا جاتا تھا لیکن کثرتِ افیون خوری سے اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی اس لیے بوجہ کبرِسنی اس کے ذہن میں فتور پیدا ہو گیا تھا۔[۱۵۳] شیخ موصوف کی طرح محمد باقی مغل بھی کسی زمانے میں اچھے گویوں میں شمار ہوتا تھا لیکن شیخ کی طرح افیون کھانے سے اس کی آواز بھی خراب ہو گئی تھی۔ جب سیف خان راگ درپن لکھنے بیٹھا تو اس وقت اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔[۱۵۴]

مسلمان گویوں میں بانہ بدخان لوز جہاروی بڑا اچھا فن کار تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ اس نے زیادہ عمر نہیں پائی تاہم اس کا نام خدمتِ فن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔[۱۵۵] ولی ڈاڈھی بھی اپنے دور میں بڑا اچھا موسیقار مانا جاتا تھا۔ بقول سیف خان اس نے اسی سال سے زیادہ عمر پائی اور آگرہ میں فوت ہوا۔[۱۵۶]

شاہجہان کے درباری گویوں میں رنگ خان کلاونت کا بڑا اونچا

---

[۱۵۲] الیضاً۔

[۱۵۳] الیضاً، ورق ۴۶ب

[۱۵۴] الیضاً، ورق ۴۶ب، ۴۷ الف

[۱۵۵] الیضاً، ورق ۴۷ الف

[۱۵۶] الیضاً، ورق ۴۶ب

رتبہ تھا۔ سیف خان لکھتا ہے کہ وہ اہم باسمّٰی اور اپنے فن میں اُستاد تھا اور اس نے اکبر کا عہد دیکھا ہوا تھا۔ وہ شاہجہان کا منظورِ نظر تھا اس لئے شاہی تقریبات کے موقع پر بادشاہ اُسے انعام واکرام سے نوازتا رہتا تھا۔ اورنگ زیب کی شادی کی تقریب پر اور ۱۰۴۵ھ میں نوروز کے موقع پر اس کا نام انعام یافتگان کی فہرست میں موجود ہے۔[۱۵۷] سیف خان لکھتا ہے کہ دربارِ شاہی کے باہر اس کا زیادہ تر وقت اللہ والوں کے ساتھ گزرا کرتا تھا۔ اس نے اسّی اور نوّے برس کے درمیان عمر پائی۔[۱۵۸]

بلاس خان کے شاگردوں میں بخت خان گجراتی نے بڑا نام پایا تھا۔ سیف خان نے اس کا ذکر کلاونتوں کے زمرہ میں کیا ہے۔ سیف خان لکھتا ہے کہ لوگ اس کے راگ کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن مجھے اس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ میں نے اس کے ایک شاگرد بشنتھی کلاونت کو سنا ہے، وہ خوب گاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بخت خان کتنا اچھا گویا ہوگا۔[۱۵۹]

مسلمان گویّوں میں نایک بھنّو کا پوتا نایک افضل بھی بڑا اچھا گویا تسلیم کیا جاتا تھا۔ شاہجہان نے اس کے کمالِ فن کا اعتراف کرتے

---

[۱۵۷] ا۔ محمد صالح کنبوہ، شاہجہان نامہ، جلد دوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۳، ۱۸۶، ۱۸۷، ۲۸۰
۲۔ عبدالحمید لاہوری، بادشاہنامہ، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۷ء، ص ۱۴۲

[۱۵۸] راگ درپن، ورق ۴۶ الف

[۱۵۹] ایضاً، ورق ۴۵ ب۔

اُسے گُن سین کا خطاب دیا تھا۔ نایک افضل کا انتقال کشمیر کے سفر کے دوران ہوا اور وفات کے وقت اس کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔[۱۶۰] سیف خان نے راگ درپن میں حسین خان لومار کا ذکر بھی عہدِ شاہجہان کے ممتاز گویّوں میں کیا ہے۔ اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔[۱۶۱]

عہدِ شاہجہان میں سبحان خان کا شمار بڑے نامی گرامی گویّوں میں ہوتا تھا۔ ان کی طبیعت درویشی کی طرف مائل تھی۔ اس لئے ان کا زیادہ وقت درویشوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ آخر عمر میں تو اُنھوں نے دنیا سے بالکل ہی منہ موڑ لیا تھا۔ عنایت خان راسخ اور شاہنواز خان کی روایات کے مطابق وہ آخر عمر میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں روضۂ رسولؐ پر نعتیں پڑھا کرتے تھے۔[۱۶۲] ان کا فرزند سیّد خان بھی بڑا اچھا گویّا تھا۔ راگ درپن کی تصنیف کے وقت وہ کافی ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ سیف خان کا کہنا ہے کہ وہ امیر خسروؒ کے علم کا ماہر تھا۔ راگ خوب گاتا تھا تاہم دُھرپد بھی بُرا نہیں گاتا تھا۔[۱۶۳]

سید طیب بڈھ بھی عہدِ شاہجہان کے نامی گرامی گویّوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ آگرہ کا رہنے والا تھا اور "بات" خوب گاتا تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔[۱۶۴] میر عماد ساداتِ ہرات سے تعلق رکھتا تھا، اس کا شمار بھی شاہجہان کے عہد کے مشاہیر گویّوں میں ہوتا ہے۔ راگ درپن کی تصنیف

---

[۱۶۰] ایضاً [۱۶۱] ایضاً۔

[۱۶۲] ا۔ رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان، ص ۴۷ ۲۔ مرأت آفتاب نما، ورق ۲۹۶ ب

[۱۶۳] راگ درپن، ورق ۴۸ الف [۱۶۴] ایضاً۔

کے وقت میر عماد حیات تھا۔ سیف خان نے اس کے راگ کی بڑی تعریف کی ہے۔[۱۶۵] اسی طرح رحیم داد ڈاڈھی کا شمار بھی اس وقت کے اچھے گویوں میں ہوتا تھا۔ سیف خان نے اس کے استادِ کامل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔[۱۶۶] ان گویوں کے علاوہ بیانہ کے ایک سورنا نواز کی بھی سیف خان نے بڑی تعریف کی ہے۔ سیف خان راگ درپن کی تصنیف کے وقت اس کا نام بھول چکا تھا اس لیے اس نے اس کا ذکر "یک سورنا نواز از بیانہ" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اسی طرح ایک اور سورنا نواز جو دارا شکوہ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اپنے فن کا استاد مانا جاتا تھا، سیف خان کے ذہن سے اس کا نام بھی محو ہو چکا تھا۔[۱۶۷]

شاہجہان کا عہدِ حکومت ہر لحاظ سے مغلوں کا عہدِ زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ فنِ تعمیر، موسیقی، مصوری، خطاطی اور دوسرے علوم و فنون کو اس عہد میں نمایاں ترقی ہوئی۔ بعض اہلِ معرفت ان سب فنون کو ایک ہی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں "فنِ تعمیر کا حسن وہی حسن ہے جو شاعری، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی میں نظر آتا ہے"۔[۱۶۸] جس طرح اقبال کو ہر چیز میں جلوۂ عشق نظر آتا ہے اور وہ بدر و حنین اور معرکۂ کربلا کو بھی عشق ہی کا نام دیتے ہیں اُسی طرح ہمارے فنانی الفن قسم کے فنکاروں کو شاہجہان کے ہر رگ و ریشے اور اس کے ہر قول و فعل سے نغمہ ہی سنائی دیتا ہے۔ ان کے نزدیک جامع مسجد دہلی، لال قلعہ اور تاج محل کی تعمیر کے

پیچھے بھی شاہجہان کا ذوقِ موسیقی ہی کارگر نظر آتا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> تاج محل میں معمار کا تصور ان بلندیوں تک پہنچ گیا ہے جہاں عمارت، شعر اور نغمہ مل کر وجد کی کیفیت بن جاتے ہیں۔[۱۶۹]

ہمارے خیال میں یہ فنِ موسیقی کی CLIMAX (انتہا) ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں یہ غلط تاثر پایا جاتا ہے کہ اس نے موسیقی کو خوب گہرا کرکے دفن کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے عہد میں موسیقی پر اتنا زیادہ کام ہوا کہ اس کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔[۱۷۰]

---

[۱۶۵] ایضاً۔ [۱۶۶] ایضاً، ورق ۴۷ ب [۱۶۷] ایضاً، ورق ۴۹ ب

[۱۶۸] پروفیسر محمد مجیب، مضمون "قطب صاحب کی عمارتیں"، مشمولہ "نذرِ عرشی" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۵

[۱۶۹] پروفیسر محمد مجیب، مضمون "فنِ تعمیر" مشمولہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۶۳ء، ص ۳۴

[۱۷۰] اورنگ زیب کے عہد میں موسیقی کے لیے دیکھیے میرا مضمون، مشمولہ نذرِ مختار، مرتبہ مالک رام، مطبوعہ دہلی

# مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات

اموی حکومت کے خاتمہ تک مسلمانوں کی فتوحات مکمل ہو چکی تھیں اور عہد عباسی کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی توجہ علم و ادب، سیر و سیاحت اور تجارت کی طرف مبذول ہوئی۔ مسلمانوں میں اپنی عظیم مملکت کو جاننے کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے جغرافیہ پر خاص توجہ دی۔ علاوہ ازیں بڑھتے ہوئے تجارتی تعلقات کے پیش نظر بھی انہیں ملک کے مختلف صوبوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے ہزارہا ہزار اشخاص عازمِ حجاز ہونے لگے، تو ان کی رہنمائی کے لئے بھی جغرافیہ دانوں نے قلم اُٹھائے۔ اس طرح نویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل مسلمانوں میں کئی نامور جغرافیہ دان پیدا ہوئے جو دیکھتے ہی دیکھتے افقِ اسلام پر مہر و مہ بن کر چمکے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مامون الرشید نے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے مشہور یونانی فاضل بطلیموس کی شہرۂ آفاق تالیف المجسطی کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ اس دور کے اکثر و بیشتر مسلمان جغرافیہ دانوں

نے اس کتاب کو اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیا اور پھر اپنے مشاہدات و تجربات سے اس کتاب میں اضافے کئے۔

عہد مامون میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی ایک مشہور ریاضی دان، جغرافیہ دان، ماہر نجوم اور ہندسہ ہو گزرا ہے۔ مامون نے اُسے اپنے قائم کردہ بیت الحکمت میں تحقیق و تجسس میں لگایا۔ وہاں اس نے علم جغرافیہ پر "صورۃ الارض" نام کی ایک کتاب لکھی جس میں اس نے زمین کو کرّہ (GLOBE) تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ سولہویں صدی تک یورپ کے فضلاء زمین کو چپٹی قرار دیتے تھے۔ اور اس "عقیدہ" کا منکر کلیسا کی نظر میں مباح الدم سمجھا جاتا تھا۔

مامون کے زمانے میں ہی شام کے صحرا میں جغرافیہ دانوں نے تجربات شروع کئے اور زمین کی پیمائش کے جغرافیائی درجات متعین کئے۔

مسلمانوں نے موسموں کے اعتبار سے کرّۂ ارض کو سات طبقات میں تقسیم کیا اور الفرغانی (م ۸۶۰ء) البتانی (م ۹۰۰ء) ابن یونس (م ۱۰۰۹ء) اور البیرونی (م ۱۰۴۸ء) نے مقامات کے ساتھ طول بلد اور عرض بلد لکھنے کے طریق کو رواج دیا۔

ابن خردازبہ کو بجا طور پر "بابائے جغرافیہ" کہا جا سکتا ہے۔ وہ پہلا مسلمان جغرافیہ دان تھا جس نے جغرافیہ نویسی کے لئے عربی زبان میں قواعد مرتب کئے۔ اس کی بلند پایہ تالیف "کتاب المسالک" بعد میں آنے والے جغرافیہ دانوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی رہی۔ اس کتاب میں اس نے مختلف ممالک کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں کے درمیانی فاصلے بھی دیئے ہیں۔

احمد بن ابی یعقوب واضح الکاتب الیعقوبی (م ۹۰۰ء) نے بھی نویں صدی

میں دنیائے اسلام کی جی بھر کر سیاحت کی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے سرحدات کی طرف جانے والی شاہراہوں سے بھی کماحقہٗ واقفیت پیدا کر لی تھی۔ اس کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مملکت اسلام کی سرحدات پر دشمنان اسلام کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس مقصد کے تحت اس نے سرحدی علاقوں کی سیاحت پر زیادہ توجہ دی اور اپنا حاصل مطالعہ ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ یعقوبی نے افریقہ کے متعلق "افریقیہ" نام کی ایک الگ کتاب لکھی ہے۔

قدامہ بن جعفر الکاتب دسویں صدی عیسوی میں ایک نامور کاتب ہو گزرا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف "کتاب الخراج وصنعت الکاتب" کے گیارہویں باب میں عہد عباسی کی ڈاک چوکیوں اور شاہراہوں کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کو بازنطینی حکومت سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا اور اس خطرہ کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنی سرحدات سے چوکس رہنے اور سرحدی علاقوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی ضرورت رہتی تھی۔

قدامہ نے اسی دفاعی نقطۂ نظر سے یہ معلومات جمع کی تھیں۔

اسی دور میں ابن رستہ (م ۹۱۰ء) بھی ایک مشہور جغرافیہ دان ہو گزرا ہے جس نے قدامہ کی طرز پر "اعلاق النفیسہ" نام کی ایک معرکۃ آراء کتاب قلمبند کی ہے۔ اس کتاب میں شاہراہوں کے ذکر پر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق جغرافیائی معلومات کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد تمام عالم خصوصاً مملکت اسلام کے متعلق بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔

اسی عہد کے ایک نامور جغرافیہ دان ابن الفقیہہ الہمدانی نے اپنی جغرافیائی معلومات کو ۹۰۳ء میں "کتاب البلدان" میں پیش کیا ہے۔ اس نے بھی

ابن رستہ کی طرح مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق اپنی معلومات کتاب کے آغاز میں تحریر کی ہیں اور اس کے بعد دوسرے شہروں اور صوبوں پر قلم اٹھایا ہے سلیمان نامی تاجر اپنے دور کا ایک نامور ملاح تھا اور اس نے تجارت کی غرض سے ہندوستان اور چین تک بحری سفر کیا تھا۔ سلیمان کا سفرنامہ تو اب ضائع ہو چکا ہے لیکن الہمدانی نے اس کے اقتباسات اپنی کتاب میں جا بجا دے کر اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جس طرح ہندوستان کے متعلق البیرونی نے تحقیق کی تھی اسی طرح جزیرہ نما عرب پر الہمدانی کی تحقیق آخری سند تسلیم کی جاتی ہے۔

۹۲۱ء میں عباسی خلیفہ المقتدر نے ابن فضلان کو سفیر بنا کر بلغاریہ بھیجا تو اس نے اپنے سفر کے حالات قلمبند کر لئے ابن فضلان کے سفرنامہ کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔

علم فقہ کی طرح جغرافیہ میں بھی مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں اور ان میں سے بلخی مکتب کا بانی ابو زید احمد بن سہل بلخی (م ۹۳۴ء) تھا جس کی کتاب "صور الاقالیم" نے شہرت دوام پائی۔ بلخی نے آٹھ برس عراق میں الکندی کی خدمت میں رہ کر جغرافیہ پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد سیر و سیاحت کے لئے نکلا۔ بلخ واپس لوٹ کر اس نے اپنا حاصل مطالعہ مذکورہ بالا کتاب کی صورت میں پیش کیا۔ بلخی کے مقلدین میں الاصطخری، ابن حوقل اور المقدسی بڑے اونچے پایہ کے جغرافیہ دان ہو گزرے ہیں۔ یورپ کے مستشرقین کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے بنائے ہوئے نقشے اس زمانے میں یورپ میں بنائے ہوئے نقشوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ بلخی مکتب کے جغرافیہ دانوں نے جغرافیائی نظریات کو قرآن و حدیث سے تطبیق دینے کی جو کوشش کی تھی علمائے اسلام

اس کے لئے ان کے ممنونِ احسان ہیں۔

ابواسحٰق الاصطخری، ایران کے قدیم پایہ تخت پرسی پولس کا رہنے والا تھا، جسے عرب الاصطخر اور ایرانی تخت جمشید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی مشہور عالم کتاب "المسالک والممالک" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دنیائے اسلام کی سیر و سیاحت بھی خوب کی تھی اور اثنائے سفر سیاحوں اور ملاحوں سے ملنے کے مواقع بھی اسے ملتے رہے تھے۔ اس نے اپنی تصنیف میں تمام اسلامی ممالک کے نقشے بنانے کے علاوہ مختلف شہروں کے درمیانی فاصلے بھی درج کئے ہیں۔ الاصطخری نے دسویں صدی عیسوی میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر جو دنیا کا نقشہ تیار کیا تھا اس پر ہم حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ بھی حال ہی میں شہنشاہِ ایران کے حکم سے شائع ہوا ہے۔

ابوالقاسم محمد بن حوقل کا نام تو ہم میں سے اکثر نے سنا ہوگا وہ بغداد کا رہنے والا تھا اور بچپن ہی سے اُسے علمِ جغرافیہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ابن خرداذبہ، جیہانی اور قدامہ کی تصانیف اس کے مطالعہ میں رہنے لگیں۔ ۹۴۳ء سے ۹۶۸ء تک اس نے دنیائے اسلام کی سیاحت کی اور اثنائے سفر بھی مذکورہ بالا کتب کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ اس سیر و سیاحت کے دوران اس نے اپنی مشہور عالم تصنیف "صورۃ الارض" کے لئے مواد جمع کیا اور اس کتاب کی مقبولیت اور قدر و منزلت کا اسی بات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ابن حوقل کے بعد آنے والے اکثر و بیشتر جغرافیہ دانوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

ابوالحسن علی بن حسین المسعودی (م ۹۵۶ء) صاحبِ مروج الذہب ایک نامور مؤرخ اور سیّاح ہو گزرا ہے۔ جس نے دسویں صدی میں تمام دنیائے اسلام کی سیر کر کے اہلِ علم سے "جہانگشت" کا خطاب پایا ہے۔ اپنے سفر کے دوران اُسے چین جانے کا بھی اتفاق ہوا اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے متعلق تو اس کی فراہم کردہ معلومات علم کا ایک بیش بہا خزانہ سمجھی جاتی ہیں۔ اثنائے سفر اُسے تجربہ کار اور نڈر مسلمان ملاحوں سے تبادلۂ خیال کرنے کا خوب موقع ملتا رہا اور مسعودی نے بحر ہند اور خلیج فارس کے متعلق ان کی معلومات کو عام جغرافیہ دانوں سے کہیں زیادہ پایا۔ مسعودی نے بھی قدامہ اور ابن رستہ کی طرح عباسی مملکت کی شاہراہوں اور ڈاک چوکیوں کی تفصیل اپنی تالیفات میں دی ہے اور ان کے مفروضات کو بے نقاب بھی کیا ہے۔ مسعودی کی تالیفات میں مروج الذہب، اخبار الزمان اور عجائب الدنیا بڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔!

اسی سلسلے میں سامانیوں کے مایۂ ناز وزیر ابوعبداللہ محمد بن احمد الجیہانی کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ہر چند اس کی تالیف "کتاب المسالک والممالک" اب ضائع ہو چکی ہے۔ تاہم اس کی اہمیت کا اندازہ مسعودی اور دوسرے جغرافیہ دانوں کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ الجیہانی کا وقت چونکہ بخارا میں سامانیوں کے دربار میں گذرا تھا اس لئے وسط ایشیا کے متعلق اس کی معلومات عرب میں بسنے والے جغرافیہ دانوں کی نسبت زیادہ صحیح تھیں۔ علاوہ ازیں عہدۂ وزارت پر فائز رہ کر اس نے سرکاری ذرائع سے کافی معلومات حاصل کی ہوں گی جن کی فراہمی دوسروں کے لئے اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ یہ کتاب اگر کسی کتب خانہ سے دستیاب ہو جائے تو اہلِ علم اُسے حرزِ جان بنا کر رکھیں اور اس کے مطالعہ سے اپنی آنکھوں کو جلا بخشیں۔

۹۸۲ء میں حدود العالم نام کی ایک کتاب فارسی زبان میں جغرافیہ پر لکھی گئی۔ اس کے مصنف کا نام تاحال معلوم نہیں ہو سکا۔ فارسی زبان میں اس کتاب کی تالیف میں متعدد عربی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پروفیسر مینورسکی آنجہانی نے لندن سے شائع کی ہے۔ اس میں لاہور کے متعلق تحریر ہے کہ یہاں سیاہ مرچ خوب اُگتی ہے۔ میں نے اس بات کا فاضل مرتب سے ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ مصنف کے زمانے میں لاہور کی منڈی میں سیاہ مرچ بکثرت ہوتی ہوگی جس سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہوگا کہ اس شہر میں سیاہ مرچ پیدا ہوتی ہے ویسے یہ بات بھی بعید از امکان نہیں کہ اس زمانے میں لاہور کی آب و ہوا گرم ہو اور یہاں سیاہ مرچ اُگتی ہو۔

ابو عبداللہ محمد بن احمد المقدسی (م ۱۰۰۰ء) جیسا کہ اس کی نسبت سے ظاہر ہے، بیت المقدس کا رہنے والا تھا۔ راقم الحروف نے اسی سال[1] کے آغاز میں بیت المقدس کے مشہور تاریخی باغ گیتسمینی کے دامن میں لب سڑک اس کے مزار کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو جلا بخشی ہے۔ اس نے جغرافیہ نویسی کے قواعد و ضوابط مرتب کئے اور کسی ملک پر قلم اٹھاتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے اخلاق و اطوار، قومی خصوصیّت، پیداوار، مذہب و عقائد، اوزان اور لین دین کے طریقوں پر بحث کا آغاز کیا یہ چیز عرب جغرافیہ دانوں کے ہاں بالکل نئی بات تھی۔ اسی بات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ المقدسی کے نزدیک جغرافیہ دانی کا مفہوم کتنا وسیع تھا۔ اس کی تصنیف "احسن التقاسیم فی معرفتہ الاقالیم" آج بھی بڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

بزرگ بن شہریار (م ۱۰۰۹ء) اپنے دور کا نامور ملاح اور سیاح ہو گزرا ہے۔ اس کی کتاب "عجائب الهند" میں بحر ہند کے متعلق بہت سی دلچسپ

معلومات پائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جزائر شرق الہند یا موجودہ انڈونیشیا کے متعلق بھی بہت سی دلچسپ حکایات اس کتاب میں مندرج ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں اس طرح کی کتابوں کی مانگ بڑھ رہی تھی اور بزرگ نے اسی چیز کو دورانِ تالیف پیش نظر رکھا۔

ناصر خسرو علوی بھی پانچویں صدی ہجری میں ایک مشہور سیاح ہو گزرا ہے جس نے اپنے آبائی وطن قبادیان سے لے کر مصر تک سیاحت کی تھی۔ اس کا سفرنامہ سلیس فارسی نثر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ناصر خسرو اثنائے سفر ہر چیز کا بغور مطالعہ کر کے پھر اُسے اپنے سفرنامہ میں درج کرتا تھا۔ اس کا سفرنامہ اُس دور کی اسلامی دنیا کا ایک بہترین مرقع ہے۔

ابو الحسن علی بن عبد الرحمٰن المعروف بہ ابن یونس (م ۱۰۰۹ء) فاطمی خلیفہ العزیز کے عہد میں قاہرہ کی رصدگاہ کا انچارج تھا۔ اس نے پنڈولم کی حرکات سے وقت کو شمار کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اور اپنے مشاہدہ سے انحراف شمس کو ۲۳ درجہ ۳۵ دقیقہ پایا، جو موجودہ تحقیق کے عین مطابق ہے۔ ابن یونس نے کسی مقام کا طول بلد اور عرض بلد معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

شرف الدولہ بویہ کے عہد میں ابو سہل ویجان بن رستم الکوہی بڑا نامور جغرافیہ دان اور ماہر نجوم ہو گزرا ہے۔ ابو سہل بغداد کی رصدگاہ میں تجربات کیا کرتا تھا، اور وہیں اس نے اعتدالین ربیعی و خریفی تیار کیں۔ اندلس میں الزرقانی ایک شہرۂ آفاق ہیئت دان اور ماہر جغرافیہ ہو گزرا ہے۔ اس نے آلات ہیئت تیار کئے اور استقبال نقطۂ الاعتدالین کی صحیح مقدار بتائی اسی طرح ابو عبداللہ محمد البتانی نے "زیج البتانی" تیار کی اور یہ کتاب یورپ میں بے حد مقبول ہوئی اور وہاں جدید ترقی میں اس سے بہت مدد لی گئی۔ البتانی

---

[1] یہ جنوری ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔

نے چاند اور دوسرے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کیا اور زمین کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ ایک جزیرہ ہے جو چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔

ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی (م ۱۰۴۸ء) سلطان محمود غزنوی کا درباری اور اپنے دور میں ریاضی، جغرافیہ، ہیئت اور سنسکرت کا زبردست عالم تھا۔ البیرونی نے یہ ثابت کیا ہے کہ کسی زمانے میں پنجاب اور سندھ کی جگہ سمندر ٹھاٹھیں مارا کرتا تھا بعد ازاں دریاؤں نے اس سمندر کو پہاڑوں سے مٹی لا کر پاٹ دیا اور کچھ جغرافیائی تبدیلیاں بھی اس طرح ہوئیں کہ سمندر پیچھے ہٹ گیا اور زمین اوپر ابھر آئی۔ البیرونی نے آتش فشانی کی وجوہات مدّو جزر کے اسباب، سورج اور چاند گرہن، زلزلے کے اسباب موسموں کی تبدیلی ہیروں کی پیدائش چشموں کے اجراء اور سطح زمین پر ہونے والی تبدیلیوں پر بہت کچھ لکھا ہے۔ البیرونی نے مساحت الارض کے قواعد مرتب کئے اور زمین کے محیط کو ۲۴،۷۷۹ میل بتایا جو موجودہ پیمائش سے صرف ۷،۸ میل کم ہے۔

ابن جبیر اندلسی (م ۱۲۱۷ء) ایک مشہور سیاح ہو گزرا ہے جس نے بحیرۂ روم اور فلسطین کی سیاحت کی اور نقشے تیار کئے۔ اس کی تصنیف "رحلہ" آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

یاقوت الحموی (م ۱۲۲۹ء) نے اپنی مشہور عالم تصنیف "معجم البلدان" میں دنیائے اسلام کے ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہروں کے نام، محل وقوع اور ان کی تاریخی اہمیت حروفِ تہجی کے لحاظ سے جمع کر دی ہے۔ اس کتاب سے ہمیں قرونِ وسطیٰ کے ان شہروں اور قصبوں کے محل وقوع بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو منگولوں کے حملوں سے نیست و نابود ہو گئے۔ بعض لحاظ

سے اس کتاب کو انسائیکلو پیڈیا کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یاقوت الحموی کے بعد القزوینی (م ۱۲۷۵ء) اور الدمشقی (م ۱۳۲۵ء) نے بھی اسی طرز پر کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت معجم البلدان کے مقابلہ میں ماند پڑ گئی۔

ابن المجاور نے ۱۲۳۰ء میں "تاریخ المستنصر" کے نام سے جنوبی عرب کی تاریخ لکھی۔ اس کتاب میں جغرافیائی اور تمدنی معلومات بھی عام ملتی ہیں۔ تاریخ ثغر عدن کے تحت ابن المجاور نے عدن میں بردہ فروشی کے متعلق جو شرمناک معلومات دی ہیں میرے خیال میں انہیں پڑھنے کے بعد ایک بار تو عربوں کے سر ندامت سے جھک جاتے ہوں گے۔

ابن فاطمہ (م ۱۲۵۰ء) بھی ایک نامور عرب سیاح ہو گزرا ہے۔ جس نے افریقہ کی سیاحت کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کیا تھا۔ یہ سفرنامہ تو مدت ہوئی نابود ہو چکا ہے البتہ اس کے حوالے ابنِ فاطمہ کے بعد آنے والے جغرافیہ دانوں نے اپنی کتابوں میں بڑی فراخدلی سے دئیے ہیں۔ ابنِ فاطمہ کے سفرنامہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ افریقہ کے متعلق مسلمانوں کی معلومات کافی تھیں اور وہ بحر اوقیانوس میں بھی سفر کے عادی تھے۔

بحیرۂ روم، خلیج فارس، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ عرب اور بحر ہند تو مسلمانوں کی آماجگاہ تھے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ مسلمانوں کے خوف سے رومی مچھلی پکڑنے والی کشتیاں بھی بحر روم میں نہ ڈال سکتے تھے۔ سلیمان بن احمد مین کے شہر مہرہ کا رہنے والا اور مشہور ملاّح ہو گزرا ہے۔ اس نے سولہویں صدی کے نصف اوّل میں سمندروں میں اپنے تجربات اور مشاہدات پہ پانچ کتابیں لکھی تھیں۔

احمد بن ماجد بھی ایک مشہور ملاّح ہو گزرا ہے جو مشرقی افریقہ کی بندرگاہ مالندی سے واسکو ڈے گاما کو ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ لایا تھا۔ پرتگیزوں کا بیان

کہ اس کے پاس ایک گائیڈ بھی تھی جس میں اس نے خلیج فارس، بحیرۂ عرب، بحیرۂ قلزم اور بحرِ ہند کے متعلق معلومات جمع کر رکھی تھیں اور اس کی عمر کے پچاس برس سمندر ہی میں گزرے تھے۔ بقول بعض، قطب نما کی ایجاد کا سہرا بھی اسی احمد کے سر ہے۔

اکثر کتابوں میں سلیمان سیرافی نام کے ایک بحری کپتان کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے چین تک سفر کیا تھا۔ عرب ملاح عموماً چین سے ریشمی کپڑے، انڈونیشیا اور ملایا سے گرم مصالحے اور قلعی، ہندوستان سے صندل، خوشبویات، عمارتی لکڑی اور ناریل عرب لیجاتے اور وہاں سے یہ مال اٹلی کی بندرگاہوں میں پہنچ جاتا اور پھر با معقول ہاتھ یورپی تاجر اُسے دوسرے ممالک میں پہنچا دیتے۔

ابنِ بطوطہ (م ۱۳۷۷ء) مراکش کے مشہور شہر طنجہ کا رہنے والا اور بلاشبہ مسلمانوں میں سب سے بڑا سیاح ہو گزرا ہے اس نے مصر، شام، حجاز، عراق، ایران، ہندوستان، مالدیو، سیلون اور چین کے علاوہ وسط افریقہ تک سیاحت کی۔ سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں وہ کئی برس تک دہلی میں قاضی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ سلطان نے اسے سفیر بنا کر چین کے سفر پر روانہ کیا لیکن راستہ میں اس کا جہاز تباہ ہوا اور وہ بدقت تمام مالدیو اور سیلون ہوتا ہوا چین پہنچا۔ آخر عمر میں ابن بطوطہ اپنے وطن واپس ہوا اور وہاں اس نے "عجائب الاسفار" کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ یہ کتاب اس دور کی اسلامی دنیا پر معلومات کی ایک کان ہے۔

علامہ ابن خلدون ہرچند کہ تاریخ اور عمرانیات کا ماہر تھا تاہم جغرافیہ پر بھی اس کی بڑی گہری نظر تھی۔ علامہ نے جو نقشہ تیار کیا تھا اسے پروفیسر روزن تھال نے مقدمہ ابنِ خلدون کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ ہی شائع

کر دیا ہے۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کو مرکزی مقام حاصل ہے، اور کرۂ ارض کو بحرِ محیط (ENCIRCLING OCEAN) نے گھیرا ہوا ہے۔ اس نقشہ میں سدِّ سکندری بھی واضح کی گئی ہے جو علامہ موصوف کے خیال میں کوریا کے قریب واقع ہے۔

* * *

# دُرِ نظامی کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت

حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے مریدوں میں سے امیر حسن علاء سجزی، علی بن محمود جاندار، خواجہ محمد بن مولانا بدر الدین اسحاق اور خواجہ عزیز الدین صوفی نے بالترتیب فوائد الفواد، درر نظامی، انوار المجالس اور تحفۃ الابرار وکرامۃ الاخیار کے عنوانات سے اپنے مرشد گرامی کے ملفوظات جمع کئے تھے، موخر الذکر دونوں بزرگوں کی کاوشیں اب ناپید ہیں۔ امیر حسن علاء سجزی کی تالیف فوائد الفواد کو شہرت دوام ملی ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے علی بن محمود جاندار کے جمع کردہ ملفوظات کے دو مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں، ان میں سے ایک مخطوط سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے[1] اور دوسرا نسخہ لوہار کلکشن کلکتہ میں موجود ہے[2]۔ راقم السطور کو بھارت کے آخری سفر کے دوران میں ان دونوں مخطوطوں سے استفادہ کرنے کی سعادت ملی ہے۔

## جامع ملفوظات

دُرِ نظامی میں علی بن محمود جاندار نے حضرت نظام الدین اولیاء رح

---

[1] مخطوطہ نمبر ۲۶۰ / ۵۹۹ / ۹۱ مخزونہ سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن

[2] روٹوگراف نمبر ۲۶۴ سیمینار لائبریری شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سے بیعت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے قاضی محی الدین کاشانی کے توسط سے بیعت کی درخواست پیش کی جو منظور ہوئی۔ ان کی دوسری درخواست پر سلطان المشائخ نے انہیں محلوق ہونے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جامع ملفوظات نے قاضی صاحب کے توسط سے یہ بھی حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ مقروض ہیں اس لئے نوکری ترک نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ درخواست بھی منظور ہوئی[1]

بیعت کے بعد علی بن محمود نے سلطان المشائخ سے قرآن پاک حفظ کرنے کی اجازت مانگی۔ حضرت نے اجازت دیتے ہوئے انہیں یہ نصیحت فرمائی کہ وہ قرآن حکیم کسی اچھے قاری سے ابو عمر عاصم رح کی روایت سے پڑھنا سیکھیں[2]۔

درر نظامی کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جامع ملفوظات ۱۳، رمضان المبارک ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) کو حضرت نظام الدین اولیاء رح کے حلقہ مریدی میں داخل ہوا تھا[3]۔

علی بن محمود لکھتے ہیں کہ وہ اور مولانا الشیبانی ہر ہفتے حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور وہاں جو باتیں سنتے تھے انہیں نقل کر لیتے تھے[4]۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس مجموعۂ ملفوظات کا نام دُرِ نظامیہ

---

[1] دُرِ نظامی، مخطوطہ سر سالار جنگ میوزیم ورق ۳۱ ب

[2] ایضاً ورق ۳۰ ب

[3] ایضاً ورق ۳۹ ب

[4] ایضاً ورق ۲ ب

تحریر فرمایا ہے[1]۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں مخطوطوں میں متن میں اس کا نام دُررِ نظامی لکھا ہے[2]۔ اس لئے میں اسے ہی صحیح سمجھتا ہوں۔

جامع ملفوظات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے ان کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ موصوف سلطان المشائخ کے مرید تھے اور انہوں نے خلاصۃ اللطائف کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ شیخ محدث نے اس کتاب سے ایک مختصر سی عربی عبارت بھی نقل کی ہے[3]۔

دُررِ نظامی کے ایک اندراج سے یہ معلوم ہوا کہ علی بن محمود کا ایک بیٹا مسمی ابوالقاسم تھا جو بچپن میں فوت ہو گیا تھا[4]۔

## دُررِ نظامی کا زمانہ تالیف

امیر حسن علا سجزی نے حضرت نظام الدین اولیا رح کی ایک مجلس کے ملفوظات ۱۳ صفر ۷۱۹ھ کی تاریخ کے تحت درج کئے ہیں۔ یہ مجلس فوائد الفواد کے آخر میں ہے اور دُررِ نظامی کی ابتدا میں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جس زمانے میں فوائد الفواد قریب الاختتام تھی ان دنوں علی بن محمود دُررِ نظامی کا آغاز کر رہے تھے۔ اس حساب سے اس تصنیفِ

---

[1] ۱۔ خلیق احمد نظامی، "ملفوظات کی اہمیت" مقالہ مشمولہ نذرِ عرشی، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء ص ۴۳۶۔

[2] ۲۔ دُررِ نظامی، ورق ۲ الف — "این رسالہ را دُررِ نظامی نام کردہ شد"۔

[3] ۳۔ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۹۴، ۹۵۔

[4] ۴۔ دُررِ نظامی، ورق ۵ ب

دلپذیر ہیں زیادہ تر مواد فوائد الفواد کی تکمیل کے بعد کا ہونا چاہیئے۔

## دُررِ نظامی کے مندرجات

دُررِ نظامی میں امام غزالی رح، جار اللہ زمخشری اور عین القضاۃ کے حوالے ملتے ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی تصانیف سلطان المشائخ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ حضرت کو حدیث پر عبور تھا، موصوف علمی مباحث میں حدیث سے استدلال کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ملفوظات میں کئی موضوع حدیثیں بھی آگئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شبِ معراج میں آنحضرت ص کو بارگاہِ ایزدی سے خرقہ ملا تھا[1]۔

## بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رح

دُررِ نظامی میں بابا فرید کے بارے میں بڑا مواد موجود ہے۔ یہ بڑے اچنبے کی بات ہے کہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس سے استفادہ نہیں کیا شاید اس کی وجہ دُررِ نظامی کی کمیابی ہو۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ابتدا میں بابا فرید رح ہانسی میں رہتے تھے، جب وہاں ان کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا تو انہوں نے نقل مکانی میں ہی عافیت جانی، موصوف ہانسی سے اپنے آبائی وطن کوٹھے وال تشریف لے گئے[2]۔ یہ مجہول سی جگہ تھی اس لئے وہاں معاش کم تھی، ملتان نزدیک ہونے کی وجہ سے بابا صاحب وہاں مستور نہ رہ سکے اس لئے موصوف لاہور چلے گئے۔ یہ ایک بڑا شہر تھا جو آبِ رواں (راوی) کے کنارے

---

[1] ۱۔ دُررِ نظامی ورق ۴۹ ب

[2] ۲۔ کوٹھے وال پر ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا مضمون، ماہنامہ المعارف لاہور بابت جولائی ۱۹۸۳ء۔

آباد تھا۔ اس لئے وہاں ان کا جی نہ لگا۔ اس زمانے میں اجودھن ایک مجہول ساگاؤں تھا۔ اس لئے حضرت وہاں تشریف لے گئے اور اپنی زندگی کے آخری ۲۷ سال وہیں گزارے[1]

اس ملفوظ سے بابا فریدؒ کا لاہور میں قیام ثابت ہے جس جگہ ان دنوں ضلع کے دفاتر ہیں وہاں ان کی رہائش گاہ موجود ہے[2]

حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے روایت ہے کہ بابا فرید اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ پیر مرید کے لئے مشاطہ کا حکم رکھتا ہے۔ بابا صاحب اپنے مریدوں کو کسی شخص کی امانت اپنے پاس رکھنے سے منع کرتے تھے[3] ایک روز سلطان المشائخ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ بابا فریدالدینؒ نہ ہی کسی سے اُدھار لیتے اور نہ ہی مال جمع کرتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ آتا اسے خرچ کر ڈالتے اور اگر کچھ نہ آتا تو صبر کرتے تھے۔ بابا فرید اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ فقیر کو ادھار نہیں لینا چاہیئے[4]

سلطان المشائخؒ سے روایت ہے کہ ایک روز بابا فریدؒ نے سماع سننے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے اس روز کوئی قوال وہاں موجود نہ تھا۔ بابا صاحب نے حضرت بدرالدین اسحاقؒ کو بلا کر کہا کہ وہ قاضی

---

[1] دُررِ نظامی، ورق ۹۶ ب

[2] نور احمد، تحقیقات چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴، ص ۴۹۲۔

[3] دُررِ نظامی، ورق ۴۹ ب

[4] ایضاً، ورق ۵۹ ب

حمیدالدین ناگوریؒ کا خط لائیں۔ موصوف "خریطۂ مکتوبات" اٹھا لائے اور اس میں قاضی صاحب کا خط تلاش کر لیا۔ بابا فریدؒ نے انہیں حکم دیا کہ وہ کھڑے ہو کر خط پڑھیں۔ جب انہوں نے یہ رباعی پڑھی:

آں عقل کجا کہ در کمال تو رسد
آں رُوح کجا کہ در جلال تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال
آں دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد

تو بابا صاحب پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جو تحریر و تقریر میں نہیں آسکتی[1]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے حجرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس وقت بابا فریدؒ ننگے سر تھے اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا، موصوف بار بار یہ رباعی پڑھ رہے تھے:

خواہم کہ ہمیشہ در وفائی تو زیم
خاکی شوم و بزیر پائی تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم و برائے تو زیم

بابا صاحب یہ رباعی پڑھ کر سجدہ ریز ہو جاتے اور کچھ دیر بعد کھڑے ہو کر رقص کرنے لگتے۔

---

[1] دُررِ نظامی، ورق ۱۰۲ ب

سلطان المشائخ بڑی دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر ہمت کر کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنا سر بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ بابا صاحب خدا جانے اس وقت کس عالم میں تھے۔ انہوں نے سلطان جی کو مخاطب کر کے فرمایا "بخواہ چہ میخواہی" انہوں نے فوراً عرض کیا "من چیزی از نعمتِ دینی خواستم" بابا صاحب نے فرمایا: وہ نعمتیں انہیں دی جاتی ہیں۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ عمر بھر ان کے دل میں یہ ملال رہا کہ اس وقت انہوں نے کیوں نہ اس بات کی التجا کی کہ ان کا انتقال سماع کے دوران ہو[1]۔

حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ بابا فریدؒ اپنی مجالس میں عوارف المعارف کے حقائق بیان کرتے تھے[2]۔

قرون وسطیٰ میں سلسلہ چشتیہ کی خانقاہوں میں عوارف المعارف کا درس معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ اس سے اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بابا فریدؒ کا تو یہ حال تھا کہ اگر کبھی ان کی طبیعت سماع کی طرف مائل ہوتی اور قوال میسر نہ آتا تو موصوف اپنے کسی مرید سے عوارف المعارف کی چند سطریں پڑھوا کر سنتے اور ان پر وجد طاری ہو جاتا۔

بابا صاحب نے عوارف المعارف کے چند باب سبقاً سبقاً سلطان المشائخ کو پڑھائے تھے۔ جن دنوں ان کے ہاں عوارف المعارف کا درس

---

[1] دُررِ نظامی ورق ۹۹ الف۔ "چرا نخواستم کہ در سماع بمیرم"۔

[2] ایضاً ورق ۴۹ الف

ہو رہا تھا، بابا صاحب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انہوں نے صاحبِ عوارف المعارف کے نام کی مناسبت سے اس کا نام شہاب الدین رکھا[1]۔

جامع ملفوظات نے ایک روز حضرت نظام الدین اولیاؒ سے یہ سنا کہ بابا فریدؒ کبھی کبھی "ڈولہ" میں سوار ہوا کرتے تھے[2]۔ دُررِ نظامی میں ایک موقع پر "کھچڑی" کا ذکر بھی آیا ہے[3]۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی بول چال میں ہندی الفاظ بلا تکلف بولے جاتے تھے۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص بابا فریدؒ کا مرید ہونے کی خواہش کا اظہار کرتا تو بابا صاحب اسے فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھنے کو کہتے۔ اس کے بعد اس سے "امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ)..... الخ پڑھواتے اور پھر اس سے شہد اللہ انہ لا الہ الا ھو اور ان الدین عند اللہ الاسلام کا اقرار کرواتے۔ پھر اس سے کہتے "بیعت کرو مجھ ضعیف سے، مجھ ضعیف کے خواجہ سے اور خواجہ کے خواجہ سے اور اقرار کرو کہ میں اپنے ہاتھ کو روکوں گا بُرے کام سے اور قدم کو روکوں گا بری جگہ جانے سے اور نگاہ کو قابو میں رکھوں گا نہ دیکھنے والی چیز سے"۔ جب مرید اس کا اقرار کرتا تو اس سے یہ بھی عہد لیتے کہ وہ شریعت پر عمل کرے گا۔ پھر اس سے انشاءاللہ

---

[1] حسن علا سجزی، فوائد الفواد (اردو ترجمہ) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳، ص ۱۷۴۔

[2] دُررِ نظامی، ورق ۴۹ الف

[3] ایضاً ورق ۸۶ الف

کھلواتے [1]

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے بابا فریدؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں فقط ایک بار جراٴت کا مظاہرہ کیا اور ان سے چلّہ کاٹنے کی اجازت مانگی۔ خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسی باتوں سے درویش کی شہرت ہوتی ہے۔ نیز یہ ان کے پیروں کا طریقہ نہیں ہے [2] حضرت نظام الدینؒ کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی ایک مجلس میں چلّہ کشی کا ذکر آیا تو موصوف نے حاضرین کو بتایا :

"خواجگان ما در اربعین نہ نشستہ اند [3]

ان واضح بیانات کی روشنی میں پتہ نہیں چشتیہ سلسلے میں چلّہ کشی کیسے داخل ہو گئی۔ بابا فریدؒ کو ان کے مرشد نے چلّہ کشی سے منع کیا تھا پھر بھی ان کے سوانح نگاروں نے ان کی طرف ایک چلّہ منسوب کر دیا ہے جو انہوں نے اُچ کی ایک مسجد کے کنوئیں میں الٹا لٹک کر کیا تھا [4] مجاورین نے سادہ لوح عقیدت مندوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے صرف لاہور شہر میں خواجہ معین الدین چشتی کی دو چلّہ گاہیں کھڑی کر دی ہیں۔

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۲۸ ب

۲۔ ایضاً ورق ۲۸ الف

۳۔ محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم ، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۲۳۱۔

۴۔ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۵۳ ، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بابا فریدؒ اور خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے بیانات کی روشنی میں ان کی بھلا کیا حقیقت ہے ؟

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ بابا فرید اور ان کے داماد حضرت بدر الدین اسحاق بیٹھ کر اپنے گھٹنے کھڑے رکھتے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر مراقبہ کیا کرتے تھے [1]

حضرت نظام الدینؒ سے روایت ہے کہ پہلے بخارا میں شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا انتقال ہوا اور اس سانحہ کے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریا واصل بحق ہوئے۔ حضرت زکریا کی رحلت کے تین سال بعد بابا فریدؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا [2]

## حضرت نظام الدین اولیأ رحمہُ اللہ

دُررِ نظامی میں حضرت نظام الدین اولیأ کے بارے میں بڑا اہم مواد موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ تصنیف ان کے سوانح نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہی۔

جامع ملفوظات سلطان المشائخ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ان کے ابتدائی زمانے میں ایک روز شیخ نجیب الدین متوکلؒ ان کے ہاں تشریف لائے۔ سلطان جی نے اپنی والدہ ماجدہ سے کہا کہ ان کے لئے کھانا لائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ان کے ہاں کھانا کہاں سے آیا [3]

---

(گذشتہ صفحہ سے) "در چاہ مسجدِ جامع جاج کہ در مقام اُچ است چلّہ معکوس کشید تا چہل روز"۔

۱۔ دُررِ نظامی، ورق ۵ ب ۲۔ ایضاً ، ورق ۱۱۶ الف

۳۔ ایضاً ورق ۶ الف

حضرت نظام الدینؒ نے ابتدائی زمانے میں عسرت کا ایسا دور دیکھا تھا کہ جب اپنے بڑھاپے میں ان کا ذکر کرتے تو ان کا دل بھر آتا، موصوف فرماتے ہیں کہ غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) میں دہلی میں خربوزے اتنے سستے تھے کہ دو جیتل میں ایک من آتے تھے اس کے باوجود فصل کا موسم گزر جاتا تھا اور خربوزے چکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ انہوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ نہ ہی تو خربوزے خریدنے کی ہمت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی شخص بطور تحفہ لا کر دیتا تھا۔ یہ واقعہ بیان کر کے موصوف نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ اللہ کے فضل سے ان کے دل میں خربوزوں کی طلب بھی پیدا نہ ہوتی تھی[1]

عسرت کے اسی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ان کے ہاں جس روز فاقہ ہوتا تو ان کی والدہ محترمہ انہیں مخاطب کر کے فرماتیں "آج ہم اللہ کے مہمان ہیں"۔ سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ موصوف اپنی والدہ محترمہ سے یہ بات سن کر ہمیشہ ذوق حاصل کرتے اور اس وقت کے منتظر رہتے کہ دیکھئے دوبارہ کب موصوفہ یہ بات فرماتی ہیں۔ حضرت نے حاضرین کو بتایا کہ اس انتظار سے ان کے دل میں ذوق پیدا ہوتا اور انہیں راحت ملتی[2]

حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ درویش کے گھر میں شبِ فاقہ شبِ معراج ہوتی ہے[3]

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۶۱ الف ۔ ۲۔ ایضاً ورق ۶۲ ب

۳۔ ایضاً ورق ۶۲ الف

ایک روز سلطان جی نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ نوجوانی کے عالم میں موصوف دہلی کی مسجد غیاثی میں جایا کرتے تھے اور ان دنوں وہاں امیر عالم دالوالجی وعظ کیا کرتا تھا[1]

جس دن حضرت نظام الدین اولیاء بابا فرید سے بیعت ہوئے اس روز انہوں نے بابا صاحب سے پوچھا کہ اب وہ تعلم اختیار کریں یا نوافل میں مشغول ہو جائیں۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ وہ انہیں تعلم سے منع نہیں کرتے وہ دونوں کام کریں۔ سلطان جی فرمایا کرتے تھے کہ درویش کو ضروری علم آنا چاہیئے[2] پنجاب کے مشہور صوفی شاعر سلطان باہو کا قول ہے کہ بے علم فقیر آخر کافر ہو کر مرتا ہے۔

جامع ملفوظات رقم طراز ہیں کہ ایک روز جب وہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت موصوف — **وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون** — کی تفسیر بیان فرما رہے تھے اور دورانِ گفتگو ابن عباسؓ کے حوالے بھی دیتے جاتے تھے[3]

علی بن محمود جاندار لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخؒ کسی مرید کی تعظیم کے لئے نہ اٹھتے تھے لیکن جب کبھی قاضی محی الدین کاشانی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ آخر عمر میں جب ان کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تو انہوں نے قاضی صاحب سے

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۶۵ ب

۲۔ ایضاً ورق ۷ ب

۳ ایضاً ورق ۶۰ ب

معذرت کرلی[۱] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں عطار کی بڑی قدر تھی اور موصوف اپنے عالم مریدوں کا کھڑے ہوکر استقبال کیا کرتے تھے۔

## حضرت بہاء الدین زکریاؒ

چشتی بزرگوں کے ملفوظات میں حضرت بہاءؒ الدین زکریاؒ اور شیخ جلال الدین تبریزی کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ چشتی حلقوں میں بڑے مقبول تھے۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاؒ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت زکریاؒ صرف سترہ روز شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کی خدمت میں رہے اور اس مختصر سی مدت میں انہوں نے جو فیض اپنے مرشد سے پایا وہ دوسروں نے سالہا سال میں بھی حاصل نہیں کیا۔ حضرت شیخ الشیوخ نے انہیں خلافت سے نوازا تو شیخ کے پرانے مرید رنجیدہ ہوئے کہ وہ مدتوں سے یہاں پڑے ہیں اور یہ نووارد چند ہی روز میں اتنی بڑی نعمت لے کر جا رہا ہے۔ اس پر شیخ الشیوخ نے فرمایا کہ وہ گیلا ایندھن لے کر ان کی خدمت میں آتے ہیں اور زکریاؒ چوب خشک لے کر آیا تھا۔ جسے ایک ہی پھونک میں آگ لگ گئی[۲]

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے روایت ہے کہ جوانی کے عالم

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۲ ب

۲۔ ایضاً، ورق ۴۶ ب

میں حضرت زکریاؒ اپنے چچا کے سامان کی تجارت کیا کرتے تھے ایک بار انہیں تجارت میں خسارہ ہوا تو چچا نے انہیں طعنہ دیا جس نے تازیانے کا کام دیا۔ حضرت زکریاؒ تجارت کا شغل چھوڑ کر تحصیل علم کے لئے بخارا تشریف لے گئے اور حصول علم کے بعد بغداد میں شیخ الشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے[۱]

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے روایت ہے کہ ناصر الدین قباچہ کے عہد میں منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کیا۔ حضرت زکریاؒ نے اسے ایک تیر دے کر کہا کہ رات کے وقت منگولوں کی طرف چلا دیں۔ خدا کا کرنا کہ اسی رات منگول محاصرہ اٹھا کر واپس چلے گئے[۲]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت بہاو الدین زکریاؒ کے مرید حسن افغان بڑے اونچے پایہ کے بزرگ تھے اور انہیں کشف القلوب ہوتا تھا۔ حضرت زکریاؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے ہیں تو موصوف حسن افغان کو بارگاہ خداوندی میں پیش کر دیں گے[۳] امیر حسن علاء سجزی نے فوائد الفواد میں یہ واقعہ ۲۶ شوال ۷۰۷ھ کو منعقد ہونے والی مجلس کے ضمن میں درج کیا ہے۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاؒ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۸۳ الف

۲۔ ایضاً ورق ۸۲ ب

۳۔ ایضاً ورق ۲۳ الف

حضرت بہاءالدین زکریاؒ نفلی روزے کم رکھا کرتے تھے۔ لیکن عبادت بکثرت کرتے تھے۔ جب کوئی نفلی روزوں کے بارے میں سوال کرتا تو موصوف یہ آیت پڑھ کر اسے خاموش کر دیتے:

کلوا من الطیبٰت و اعملوا صالحاً[1] (المومنون: ۵۱)

سلطان المشائخؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ملتان میں ناصر الدین قباچہ نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ قاضی قطب الدین کاشانی وہیں رہتے تھے اور مدرسہ کی مسجد میں امامت بھی فرماتے تھے۔ حضرت زکریاؒ کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز ان کی اقتدا میں ادا فرماتے۔ ایک روز قاضی صاحب نے ان سے کہا کہ موصوف اتنی دُور سے وہاں آنے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟ حضرت زکریاؒ نے فرمایا کہ وہ اس پر عمل کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| من صلی خلف | جس نے متقی عالم کے پیچھے |
| عالم تقی فکانما | نماز ادا کی اس نے گویا نبی کے |
| صلی خلف نبی | پیچھے نماز ادا کی[2] |

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریاؒ بیمار ہوئے تو ایک اجنبی نے ایک خط لا کر حضرت صدرالدین عارفؒ کو دیا اور ان سے التماس کی کہ اسے حضرت زکریاؒ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ حضرت زکریاؒ نے وہ خط پڑھ کر حاضرین سے کہا "دوستو! ہمارا وقت سفر آ گیا ہے"۔ حاضرین ان کی بات سن کر رونے لگے۔ اگلی شب حضرت زکریاؒ بام سے

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۲۷ ب

۲۔ ایضاً، ورق ۲۲ الف

گرے اور اسی صدمے سے ان کا انتقال ہوا[1]۔

حضرت نظام الدینؒ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص سیاہ لباس پہن کر حضرت زکریاؒ کے سامنے آتا تو موصوف اسے دیکھ کر فرماتے "یہ کیا شیطان کا لباس پہن کر آ گئے ہو[2]"

## حضرت جلال الدین تبریزیؒ

حضرت نظام الدین اور دوسرے چشتی مشائخ کے ملفوظات میں حضرت جلال الدین تبریزی کا بار بار ذکر آتا ہے۔ ایک دن سلطان المشائخ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت جلال الدین تبریزی نے جتنی خدمت اپنے مرشد کی کی ہے اتنی کسی مرید نے نہیں کی۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہرورویؒ ہر سال حج کو جایا کرتے تھے۔ ان کا معدہ کمزور تھا اس لئے سرد کھانے سے پرہیز فرماتے تھے۔ حضرت جلال الدین تبریزی اپنے سر پر انگیٹھی رکھ کر شیخ کے ساتھ چلتے کہ پتہ نہیں موصوف کس وقت کھانا طلب فرمائیں[3]۔ ایک روایت ہے کہ کوئلوں کی گرمی سے ان کے سر پر بال اُگنے بند ہو گئے تھے۔

---

۱۔ دُررِ نظامی ورق ۱۱۶ الف

شیخ الاسلام بہاءالدین از بام بیفتاد
ہمدران شب برحمتِ حق پیوست۔

۲۔ ایضاً، ورق ۸۷ الف

"این لباس شیطان است"

۳۔ ایضاً، ورق ۲۹ الف

## حضرت امیر خسروؒ

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ امیر خسرو دن بھر کے واقعات اور حالات رات کے وقت حضرت نظام الدین کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور موصوف یہ واقعات سن کر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے[1]

علی بن محمود جاندار امیر خسرو کے برادر طریقت تھے اس لئے وہ ان کی عادات سے خوب واقف تھے۔ موصوف امیر خسرو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ شطرنج کے خوب ماہر تھے[2]

## شیخ سنائی

حضرت نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں کہ شیخ سنائیؒ کے والد آدم اور سلطان محمود غزنوی کے استاد شیخ شیبہ ہمسائے تھے۔ ایک رات شیخ شیبہ نے خواب میں دیکھا کہ آدم کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جو بہت بڑا عالم اور شاعر ہے اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور آدم کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے حضور میں توحید پر مبنی اشعار پڑھ رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان اشعار کے طفیل غزنی کے تمام باشندوں کو بخش دیا۔ اگلی صبح شیخ شیبہ نے یہ ماجرا شیخ آدم سے بیان کیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ موصوف فوت ہو گئے اور ان کی وفات کے بعد سنائی پیدا ہوئے۔ حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ سنائی ابتدا میں اُمّی محض تھے[3]

---

۱۔ درر نظامی ورق ۴۶ الف

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً ورق ۴۶ ب ۴۷ الف

## امام اعظم ابو حنیفہ اور خواب کی تعبیر

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ کسی خلیفے نے خواب میں حضرت عزرائیل کو دیکھا اور اس سے سوال کیا کہ اس کی عمر کتنی باقی ہے۔ اس نے پانچ انگلیاں دکھائیں۔ اس سے پانچ دن بھی مُراد لئے جا سکتے تھے اور پانچ سال بھی، خلیفہ کو اس بارے میں بڑا تردد تھا۔ اس نے حضرت ابو حنیفہؒ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ ملک الموت نے یہ نہیں کہا کہ وہ پانچ دن یا پانچ سال اور جیئے گا بلکہ اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچ چیزوں کا علم کسی کو نہیں دیا:

ان اللہ عندہٗ علم الساعۃ وینزل
الغیث ویعلم ما فی الارحام وما
تدری نفسٌ ماذا تکسب غدًا وما
تدری نفسٌ بایّ ارضٍ تموت ان
اللہ علیمٌ خبیرٌ ○ (لقمان ۳۴)

خلیفہ یہ تعبیر سن کر خوش ہوا اور امام صاحب کو خلعت دے کر رخصت کیا[1]

حضرت نظام الدین کے زمانے میں اس قصے کی نسبت امام ابو حنیفہؒ کی طرف ہو گئی تھی۔ ورنہ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ امام مالک کو خواب میں حضور نبی کریمؐ نے ایسا اشارہ کیا تھا اور انہوں نے امام ابن سیرینؒ سے اس کی تعبیر پوچھی تھی اور انہوں نے وہ جواب

---

۱۔ درر نظامی ورق ۱۰۸ الف

دیا تھا جو مذکورہ بالا روایت میں امام اعظم کی طرف منسوب ہے۔

## امام ناصرؒ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ امام ناصر الدین کو سکتہ ہوا تو لوگوں نے انہیں مردہ سمجھ کر دفن کر دیا۔ رات کے وقت قبر میں انہیں ہوش آیا تو انہوں نے سورۃ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک کفن چور نے ان کی قبر کھودنی شروع کر دی۔ امام صاحب کو جب معلوم ہوا کہ کوئی شخص ان کی قبر کھود رہا ہے تو انہوں نے آواز ہلکی کر دی، کفن چور نے جب کفن اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو امام صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے کفن چور کا مارے دہشت کے پتہ پھٹ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ امام صاحب کو اس کی موت پر بڑا رنج ہوا۔

امام صاحب رات کے اندھیرے میں اپنے گھر کی طرف چلے اور راستے میں موصوف اپنے دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ لوگ کہیں ان کو دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔ اس لئے موصوف آہستہ آہستہ چھپتے چھپاتے اپنے گھر پہنچے اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ وہ فلاں شخص ہیں انہیں سکتہ ہو گیا تھا اور لوگ انہیں مردہ سمجھ کر دفن کر آئے تھے حالانکہ وہ زندہ تھے یوں انہوں نے لوگوں کا خوف دور کر دیا۔[1]

جامع فوائد الفواد نے یہی واقعہ ۷ ذی القعد ۷۱۰ھ کی مجلس کے ضمن میں درج کیا ہے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ امام ناصر نے اس واقعہ کے بعد تفسیر ناصری لکھی تھی۔[2]

---

۱۔ درر نظامی ورق ۳۲ ب    ۲۔ امیر حسن علا سجزی، فوائد الفواد (بقیہ صفحہ پر)

---

## شیخ فرید الدین عطارؒ

درر نظامی میں مرقوم ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ ایک ایسے شخص سے ملے جس نے شیخ فرید الدین عطار کو دیکھا تھا۔ اس شخص نے سلطان جی کو بتایا کہ جب چنگیز خاں کا لشکر نیشاپور پہنچا تو شیخ عطار اپنی خانقاہ میں سترہ مریدوں کے ساتھ قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے۔ جب منگول وہاں پہنچ کر قتل عام کرنے لگے تو موصوف نے فرمایا، "این چہ تیغ قہاریست و این چہ تیغ جباریست" جب شیخ عطار کے قتل کی باری آئی تو انہوں نے فرمایا۔ "این چہ کرم است و این چہ احسانست!"

یہ واقعہ بیان کر کے سلطان المشائخ نے فرمایا کہ سالک کو چاہیئے کہ وہ تمام کام خدا پر چھوڑ دے اور اس کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ موصوف نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ جب منگولوں کا لشکر چنگیز خاں کی قیادت میں نیشاپور پہنچا تو حاکم خراساں نے شیخ عطار سے کہا کہ موصوف دعا فرمائیں کہ یہ لشکر واپس چلا جائے۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ اب دعا کا وقت نہیں رہا۔ اب تسلیم و رضا کا وقت ہے۔

حضرت نظام الدین نے یہ روایت بیان کر کے فرمایا کہ موصوف اس بات کے قائل ہیں کہ نزولِ بلا کے وقت بھی دعا کی جائے تاکہ اس سے کم سے کم نقصان پہنچے۔[1]

---

(صفحہ گزشتہ سے)، اردو ترجمہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء ص ۱۴۹

۱۔ درر نظامی، ورق ۶۰ الف

## نجم الدین صغریٰ

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ ایک بار خواجہ معین الدین اجمیری رح نجم الدین صغریٰ سے ملنے گئے وہ اس زمانے میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھا۔ اس نے خواجہ بزرگ کو دیکھ کر رُخ پھیر لیا۔ انہوں نے اس بے رخی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح سے نالاں ہے۔ دراصل وہ ان کی مقبولیت پر حسد کرتا تھا۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو موصوف انہیں اپنے ساتھ اجمیر لے جاتے ہیں۔ خواجہ بزرگ نے قطب الدین سے فرمایا "بابا قطب الدین! تم میرے ساتھ اجمیر چلو۔ تم مسند پر بیٹھنا اور میں تمہارے سامنے کھڑا رہوں گا۔ خواجہ قطب الدین نے عرض کیا، "اللہ اللہ! میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کے سامنے بیٹھوں"! خواجہ بزرگ نے فرمایا "اچھا تو پھر تم جانو!" خواجہ صاحب اجمیر روانہ ہو گئے اور ادھر دہلی میں خواجہ قطب الدین کا انتقال ہو گیا[1]

### سلطان التمش

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد کسی نے اُسے خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا ماجرا گزرا۔ سلطان نے کہا کہ حوضِ شمسی تعمیر کرنے کی وجہ سے اس کی مغفرت ہو گئی ہے[2]

---

۱۔ دررنظامی، ورق ۸۴ ب

۲۔ ایضاً، ورق ۱۱۵ الف

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیری کے فرزندوں کو سرکاری زمین ملی۔ اس زمین کے بارے میں ان کا مقطع سے کچھ اختلاف ہو گیا۔ بیٹوں کے اصرار پر خواجہ بزرگ خود دہلی گئے تاکہ سلطان التمش سے مل کر یہ قضیہ طے کرا دیں۔ خواجہ قطب الدین نے اپنے مرشد سے کہا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں۔ موصوف خود سلطان سے مل کر ان کا کام کروا دیں گے۔ جب خواجہ قطب الدین سلطان التمش کے ہاں پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اس سے قبل اس نے ان سے ملنے کی کئی بار خواہش ظاہر کی تھی لیکن خواجہ صاحب اسے اپنے ہاں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے سلطان کو مقطع کے ساتھ اختلاف سے آگاہ کیا اور اس نے فوراً ان کا کام کر دیا[1]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ قاضی محی الدین کاشانی سے منقول ہے کہ سلطان التمش اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح ایک ہی سال میں فوت ہوئے[2]

### معزالدین کیقباد

عام طور پر سلطان معز الدین کیقباد (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۰ء) کو ایک عیاش طبع حکمران سمجھا جاتا ہے۔ جس کے شب و روز فسق و فجور کی مجلسوں میں گزرتے تھے۔

---

۱۔ دررنظامی ورق ۸۳ ب

۲۔ ایضاً ورق ۱۱۵ الف

درر نظامی کی روایت ہے کہ کیقباد نے اپنے دادا سلطان غیاث الدین بلبن کی روح کو ایصال ثواب کے لئے اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کافور کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو خیرات کیا کرے۔ ایک بار کافور نے اس رقم میں سے دو ٹنکے سلطان جی کی خدمت میں بھی بھیجے، جو انہوں نے قبول کر لئے۔ اس کے بعد بھی وہ متواتر کئی جمعے سلطان جی کی خدمت میں بھی کچھ رقم بھیجتا رہا[۱]

## عہد علائی

جس زمانے میں علی بن محمود جاندار درر نظامی مرتب کر رہے تھے وہ سلطان علاء الدین خلجی کا دور حکومت تھا۔ اس کی سخت گیر پالیسی کے باوجود چوری چکاری عام تھی۔ جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ بزرگوں کے گھر بھی غیر محفوظ تھے۔ ایک بار چور شیخ احمد نہروالی کے گھر کا بھی صفایا کر گئے تھے[۲]

درر نظامی کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں مسلح ہندو رہزن جنگلوں میں مسافروں کو لوٹا کرتے تھے[۳] ایک دوسرے موقع پر علی بن جاندار لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں راستے غیر محفوظ تھے[۴]

---

۱۔ درر نظامی ورق ۱۰۱ ب

۲۔ ایضاً ورق ۷۵ الف

۳۔ ایضاً ورق ۵۴ ب

۴۔ ایضاً ورق ۸۷ الف

علاء الدین خلجی کا دورِ حکومت خیر و برکت کا دور سمجھا جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین اس بابرکت عہد کے لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اکثر لوگوں کے مال حرام اور مشتبہ ہیں[۱]۔

آج ہمارے زمانے میں لوگوں کے مال کی کیا حیثیت ہے؟

## قدیم دھلی

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ابتدا میں غیاث پور، جہاں حضرت نظام الدین رہتے تھے ایک معمولی سا گاؤں تھا[۲] اور وہاں بہت کم آبادی تھی۔ جب سلطان کیقباد نے کیلوگھری میں سکونت اختیار کی تو لوگوں کی توجہ غیاث پور کی طرف ہوئی[۳]

علی بن محمود جاندار نے حوض رانی کے نواح میں "باغ جسرت" کی نشان دہی کی ہے[۴] (حوض رانی کے علاقے میں اب شاندار بنگلے بن گئے ہیں اور ہمارے فاضل بزرگ قاضی سجاد حسین پرنسپل مدرسہ فتح پوری نے بھی وہیں ایک بنگلہ تعمیر کروایا ہے)۔

راقم الحروف نے جوامع الکلم کے بار بار مطالعے سے قدیم دہلی کے تیرہ دروازوں کا کھوج لگایا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے چودھویں دروازے

---

۱۔ درر نظامی ورق ۵۹ الف

۲۔ ایضاً ورق ۷۳ الف

" موضعی مجہول بود "

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً ورق ۷۲ ب

"بہندر کال" کی نشاندہی کی ہے[1] حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات نفائس الانفاس میں پندرھویں دروازے "دروازہ پل" کا سراغ ملتا ہے[2] درر نظامی میں دہلی کے سولھویں دروازے "دروازہ کمال" کا ذکر آیا ہے[3]

علی بن محمود جاندار نے ایک بزرگ حاجی روزبہ کا ذکر کیا ہے جن کی قبر "دروازہ غزنین" کے باہر فصیل کے ساتھ تھی[4]

## بیعت کا آغاز

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ایک روز حاضرین مجلس کو بتایا کہ بیعت کی ابتدا بیعتِ رضوان سے ہوئی ہے[5]

ہماری یہ ناقص رائے ہے کہ بیعتِ رضوان سے بھی آٹھ سال قبل عقبہ کی گھاٹی میں بیعت کی ابتدا ہوئی تھی جس میں انصار نے آنحضرتؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ اپنی جان، مال اور اولاد سے بڑھ کر آپکی حفاظت کریں گے۔

---

۱۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ج ۲ ص ۱۱۰

۲۔ عماد کاشانی، نفائس الانفاس، مخطوطہ، مخزونہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نمبر ۳۴۴ ص ۶۵

۳۔ درر نظامی ورق ۴۷ الف

۴۔ ایضاً ورق ۸۵ ب

۵۔ ایضاً ورق ۳۶ ب

## توبہ کی اقسام

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاؒ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ توبہ کی تین اقسام ہیں:

ماضی، حال، اور مستقبل

ماضی کی توبہ یہ ہے کہ دشمنوں کو راضی کرے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے دس درہم غصب کئے ہوں تو وہ توبہ توبہ کہنے سے معاف نہیں ہوں گے تاآنکہ دس درہم مالک کو لے جا کر نہ دے۔ اگر کسی شخص کو گالی دی ہو اور وہ مر گیا ہو تو اس کی صفات بیان کرے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرے اور اگر اس سے زنا کا ارتکاب ہوا ہو تو توبہ کرے لوگوں کو کھانا کھلائے اور شربت پلائے۔

حال کی توبہ یہ ہے کہ اپنے گناہوں پر پشیمان اور نادم ہو، مستقبل کی توبہ یہ ہے کہ وہ عہد کرے کہ آئندہ گناہ نہ کرے گا۔

اس موقع پر حضرت محی الدین کاشانی نے سلطان المشائخ سے پوچھا کہ اگر کسی نے اوائل جوانی میں گناہ کیا ہو اور بعد میں توبہ کر لی ہو لیکن کبھی کبھی دل میں اس پرانے گناہ کا خیال آ جاتا ہو تو اسے یہ کیسے معلوم ہو کہ اس کی توبہ قبول ہو گئی ہے اور اس گناہ کا اثر زائل ہو گیا ہے، سلطان المشائخ نے فرمایا کہ وہ یہ دیکھے کہ اگر اس گناہ کے تصور سے اسے لذت محسوس ہوتی ہو تو وہ یہ سمجھ لے کہ ہنوز اس گناہ کا اثر باقی ہے (یعنی اس کی توبہ قبول نہیں ہوئی) اور اگر اس کے تصور سے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہو تو وہ یہ جان لے کہ اس گناہ کا اثر زائل ہو چکا ہے اور یہ توبہ کی قبولیت کی دلیل

ہو گی۔[1]

## معرفت کی حقیقت

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار کسی اجنبی نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے کہا کہ اسے معرفت کے معنی بتائیں۔ حضرت نے کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اگلے روز اس نے پھر یہی سوال کیا تو حضرت نے حسبِ سابق کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ وہ ان سے معرفت کے بارے میں سوال کرتا ہے اور موصوف جواب دینے کی بجائے کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا "میرے بھائی یہی معرفت ہے کسی کی حاجت پوری کرو اور کسی کو راحت پہنچاؤ"[2]

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ غزنین سے مولانا فخرالدین نامی ایک بزرگ کسی پیر پارسا سے ملنے گئے جب یہ ان کے ہاں پہنچے تو اس وقت پیر صاحب مہمانوں کے لئے کھانا پکانے میں مصروف تھے اس لئے مولانا کی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن مولانا نے پیر صاحب سے کہا کہ وہ اتنا لمبا سفر کر کے ان سے استفادہ کرنے آئے تھے اور وہ کھانا پکانے میں مصروف رہتے ہیں اس لئے استفادہ کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پیر صاحب نے مولانا سے پوچھا کہ انہوں نے معرفت خدا کے موضوع پر بھی کچھ پڑھا ہے؟ مولانا نے کہا کہ انہوں نے تو اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ معرفت خدا سے

---

۱۔ درر نظامی، ورق ۱۴ الف ۱۴ ب

۲۔ ایضاً، ورق ۱۲ ب

با خبر ہوتے تو پھر کتابیں نہ لکھتے۔[1]

صوفیوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ جو شخص معرفت خدا کے بارے میں علم رکھتا ہے وہ اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا اور جو اس کے متعلق لکھتا ہے وہ معرفت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

## تائب اور متقی میں فرق

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاؒ کی مجلس میں تائب اور متقی کے موضوع پر بحث چل نکلی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ تائب بہتر ہے اور بعض لوگوں کی رائے تھی کہ متقی کو اس پر فضیلت حاصل ہے۔ تائب کے طرف داروں نے کہا کہ وہ معاصی کا مزہ چکھ کر تائب ہوا ہے، متقی تو گناہ کی لذت ہی سے نا آشنا ہے اس لئے اس کے تقوے میں کوئی کمال نہیں ہے۔

حضرت نظام الدین نے طرفین کی بات سن کر فرمایا کہ ایک بار لوگوں نے کسی جولاہے سے پوچھا کہ متقی اور تائب میں کیا فرق ہے؟ اس نے کہا کہ وہ متقی اور تائب کے معنی نہیں جانتا لوگوں نے اسے بتایا کہ متقی وہ ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو اور تائب وہ ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کر لی ہو۔ جولاہے نے جواب دیا کہ وہ ایک بات جانتا ہے کہ ایک تاگہ وہ ہے جو ٹوٹا نہ ہو اور اصلی جگہ پر رہا ہو اور دوسرا تاگا وہ ہے جو ٹوٹ جائے اور اسے جوڑ دیا جائے۔ اس کا تجربہ ہے کہ وہ دونوں تاگے برابر نہیں ہو سکتے۔[2]

---

۱۔ ایضاً، ورق ۱۳ الف

۲۔ ایضاً ورق ۱۵ الف

یہ واقعہ فوائد الفواد میں ۱۳ صفر ۷۱۹ھ کو منعقد ہونے والی مجلس کے ذیل میں بھی درج ہے۔

## اخوت کی اقسام

ایک روز حضرت نظام الدین نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اخوت دو طرح کی ہوتی ہے۔

۱۔ اخوتِ نسب

۲۔ اخوتِ دین

ان دونوں میں اخوت دین قوی تر ہے۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ اگر دو حقیقی بھائی ہوں اور ان میں سے ایک کافر ہو اور دوسرا مومن تو مومن اپنے کافر بھائی کی میراث نہیں لے سکتا۔ اسی لئے اخوتِ نسب کمزور ہے۔ اب رہی اخوت دین، تو یہ بڑی مضبوط ہے کیونکہ ان بھائیوں کا تعلق دنیا میں تو ہے ہی آخرت میں بھی رہے گا۔[1]

## نفلوں کی جماعت

چشتیوں کے ہاں جماعت کے ساتھ نفل ادا کرنے کا رواج تھا حضرت سلطان المشائخ نے اسے اپنے بزرگوں کا مسلک بتایا ہے۔ موصوف نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ بابا فریدؒ کے حکم سے انہوں نے بھی نفل با جماعت ادا کئے تھے بلکہ امامت کا شرف بھی انہیں کے حصے میں آیا تھا۔[2]

---

[1] درر نظامی، ورق ۵۷ الف

[2] ایضاً، ورق ۲۲ ب

## زکوۃ کی اقسام

حضرت نظام الدینؒ اولیاؒ نے ایک روز حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ زکوٰۃ کی تین اقسام ہیں:

۱۔ زکوٰۃ شریعت

۲۔ زکوٰۃ طریقت

۳۔ زکوٰۃ حقیقت

زکوٰۃ شریعت یہ ہے کہ دو سو درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ دے۔ زکوٰۃ طریقت یہ ہے کہ پانچ درہم اپنے پاس رکھ کر باقی رقم زکوٰۃ میں دے دے اور زکوٰۃ حقیقت یہ ہے کہ پوری رقم زکوٰۃ میں دے ڈالے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے[1]

## ہدیۂ شاہی کا حکم

سلطان المشائخ نے ایک روز جامع ملفوظات کی موجودگی میں فرمایا کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مرشد حضرت ابو سعید تبریزیؒ اور ان کے مرید اکثر فاقہ سے رہتے تھے۔ موصوف کسی سے کچھ نہ لیتے۔ دن کو ان کا اور ان کے مریدوں کا روزہ ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت تمام حضرات کڑوے خربوزے (حنظل) سے افطار کرتے اور رات بھر عبادت میں مصروف رہتے۔ ایک روز حاکم تبریز نے قاصد کے ہاتھ کچھ رقم حضرت ابو سعید کے خادم کو بھجوائی۔ اس نے اسی رقم سے افطاری کا سامان خرید کر حضرت کے سامنے لا رکھا۔ اگلی صبح حضرت نے خادم کو بلا کر

---

[1] درر نظامی، ورق ۲۶ الف

کہا کہ گزشتہ رات انہیں عبادت میں لذت محسوس نہیں ہوئی اس لئے وہ یہ بتائے کہ افطاری کا سامان کہاں سے آیا تھا؟ خادم نے ڈرتے ڈرتے سارا واقعہ سنایا۔ حضرت ابو سعید نے پوچھا کہ جب شاہی قاصد رقم لے کر خانقاہ میں آیا تو وہ کہاں کھڑا ہوا تھا۔ خادم نے اس جگہ کی نشاندہی کی تو حضرت نے وہاں سے مٹی اکھڑوا کر خانقاہ سے باہر پھنکوا دی[1]

## بیعت صرف زندہ سے کرنی چاہیئے

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے روایت ہے کہ بابا فریدؒ کا ایک بیٹا دہلی جا کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر بیٹھ گیا اور خود کو ان کا مرید سمجھ کر محلوق ہو گیا۔ بابا صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے بیٹے کو لکھا کہ خواجہ صاحب ان کے مخدوم اور مرشد ہیں۔ لیکن غائب کی بیعت جائز نہیں۔ صحیح بیعت وہ ہے جو زندہ شیخ کے ہاتھ پر کی جائے[2]

## اہل بہشت کا ایک گروہ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایسے خوش نصیب لوگ بھی ہوں گے جنہیں قیامت کے دن فرشتے اس طرح گھسیٹ کر بہشت میں لے جائیں گے جس طرح بچوں کو گھسیٹ کر مکتب کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ خدا کی بارگاہ میں التجا کریں گے کہ انہوں نے محبت کے

---

[1] درر نظامی ورق ۷۰ الف

[2] ایضاً، ورق ۳۷ الف

ساتھ اس کی عبادت کی تھی لہٰذا اس عبادت کے صلے میں وہ بہشت میں نہیں جانا چاہتے بارگاہِ خداوندی سے فرشتوں کو یہ حکم ملے گا کہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی بہشت کی طرف لے جائیں[1]

## عصمتِ انبیاء

حضرت نظام الدین نے ایک روز حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ انبیاء کرام گناہوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں لیکن اولیاء اللہ گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں معصوم نہیں[2]

## شہرت بعد از مرگ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار لوگوں نے صوفی حمید الدین ناگوریؒ سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض بزرگ مرنے کے بعد نامور ہو جاتے ہیں اور بعض بزرگوں کو لوگ بھلا دیتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو لوگ اپنی زندگی میں مشہور ہو گئے تھے وہ مر کر گمنام ہو گئے اور جو زندگی میں گمنام رہتے تھے وہ مر کر مشہور ہو گئے[3]

## حسین بن منصور حلّاج

علی بن محمود جاندار رقم طراز ہیں کہ حضرت نظام الدین نے ایک مجلس میں فرمایا کہ حسین بن منصور حلاج کی لاش جلا کر اس کی راکھ دجلہ میں بہا دی۔ اتفاق سے سید احمد کبیر نے وہ پانی لیا۔ اس سبب

---

[1] درر نظامی ورق ۱۷ الف

[2] ایضاً، ورق ۸۸ الف

[3] ایضاً ورق ۹۶ الف

سے ان پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو گئی[1]

## کرنے کا کام

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دن کو روزہ رکھے رات کو عبادت کرے اور وہ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکا ہو، تو سمجھ لیجیئے اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اصل کام دل سے دنیا کی محبت ختم کرنا ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں ذرا برابر بھی دنیا کی محبت ہو اور وہ خدا سے محبت کا دم بھرتا ہو تو جان لیجیئے کہ وہ کذاب ہے، قیامت کے دن ایسا شخص خدا کے دوستوں کے سامنے شرمسار ہوگا[2]

## عزلت کا فائدہ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ عزلت کا فائدہ فکر و ذکر ہے اور یہ بزرگ ترین عبادت ہے۔ یہ نعمت خلق سے خلوت اور گوشہ نشینی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی[3]

## مومن ہونے کی شرط

حضرت نظام الدین فرماتے ہیں کہ اتیمور نامی ایک ترک نے دہلی میں ایک مسجد بنوائی اور بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے بھائی نجیب الدین متوکلؒ کو امامت کے فرائض سونپے۔ اس نے انہیں رہنے کے لئے ایک مکان بھی دیا۔ کچھ عرصہ بعد اتیمور نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام

---

[1] درر نظامی، ورق ۱۷ الف

[2] ایضاً ورق ۷۰ ب

[3] ایضاً ورق ۷۰ ب

کے ساتھ کی اور اس تقریب پر ایک لاکھ ٹنکے سے بھی زیادہ رقم خرچ کر ڈالی۔ ایک دن شیخ موصوف نے اس سے کہا کہ جب تک وہ اس سے زیادہ رقم راہ خدا میں خرچ نہیں کرتا اس وقت تک وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ اتیمور نے ناراض ہو کر انہیں امامت سے الگ کر دیا اور مکان بھی خالی کرا لیا۔ شیخ نجیب الدینؒ اس سلوک پر بڑے رنجیدہ ہوئے اور دہلی سے اجودھن چلے گئے۔ انہوں نے بابا صاحب کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ بابا صاحب نے ان سے کہا کہ ایسی باتوں پر دل تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ مزید براں انہوں نے اپنے برادر خورد کی تسلی کے لئے یہ آیت بھی پڑھی:

ما ننسخ من ایۃٍ او ننسھا نات بخیر
منھا او مثلھا (البقرہ ۱۰۶)

کچھ عرصہ بعد اتیمر نامی ایک شخص اس نواح میں آیا اور اس نے بابا صاحب اور ان کے اعزا کی بڑی خدمت کی[1]

## مشائخ زادے

درر نظامی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مشائخ اپنے نالائق فرزندوں کے ہاتھوں نالاں رہتے تھے جامع ملفوظات مشائخ زادوں کے اطوار و اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یخرج الحیّ من المیّت ویخرج المیّت
من الحیّ۔

---

[1] درر نظامی، ورق ۱۸ الف ۱۸ ب

ایک شیخ طریقت نے اپنے فرزندوں کے بجائے ایک غلام کو اپنی مسند پر بٹھایا تھا[1]

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت اخی جمشید راجگیری کے ملفوظات میں نقل ہوا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ایک شیخ کے سات بیٹے تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے والد کی مسند پر بیٹھنے کی تمنا دل میں لئے بیٹھا تھا۔ جب اس بزرگ کی وفات کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ فلاں کلال کے ہندو غلام کو خرید کر اس کی خدمت میں پیش کریں حضرت نے اس غلام کو کلمہ شہادت پڑھایا اور ایک ہی توجہ میں اس کو سلوک کے تمام مقامات طے کرا کے اپنی مسند پر بٹھا دیا[2] بیٹوں نے اس پر احتجاج کیا تو باپ نے ان سے کہا کہ اگر باپ مال و دولت چھوڑے تو اس کے وارث بیٹے ہوتے ہیں، عشق و محبت میں میراث نہیں ہوتی[3]

بابا فریدالدین گنج شکرؒ بھی اپنے فرزندوں سے خوش نہ تھے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ اگر عورت کو خلافت اور مشائخ کا سجادہ دینا مناسب ہوتا تو اپنی صاحبزادی بی بی شریفہ کو اپنا جانشین بنا دیتے[4]

---

۱- دررِ نظامی ورق ۴۶ الف

۲- تصوف کی اصطلاح میں اسے توجہ قسری کہتے ہیں۔ مرشد ایک ہی توجہ میں مرید کو تمام مقامات طے کرا دیتا ہے۔

۳- یحییٰ بن علی الاصغر، ملفوظات اخی جمشید راجگیریؒ، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کلکشن ۴/۴۶ فارسیہ مذہب و تصوف، ورق ۵۹ الف، ۵۹ ب

۴- (اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

یہ تو اس وقت کے شیخ کے خیالات تھے۔ سلطان شمس الدین التمش بھی اپنے بیس بیٹوں کی موجودگی میں یہ کہا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی رضیہ میں حکمران بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

## اختتام

دررِ نظامی کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

ای ساقی می بریز و ساغر بشکن
می باکہ بخوریم چون حریفان رفتند

---

(صفحہ گزشتہ سے) خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۶

# فتوحات فیروز شاہی

ملا نظام الدین احمد صاحب طبقات اکبری کی روایت ہے کہ سلطان فیروز تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے اپنے عہدِ حکومت کے اہم ترین واقعات اور اپنی اصلاحات کو "فتوحات فیروز شاہی" کے نام سے قلمبند کیا تھا۔ اس خیال سے کہ زمانہ کے ظالم ہاتھوں سے کہیں اس کی یہ مختصر سی تالیف ضائع نہ ہو جائے، سلطان نے اُسے لفظ بلفظ جامع مسجد فیروز آباد کے ہشت پہلو گنبد پہ کندہ کروا دیا۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیے کہ سلطان فیروز تغلق نے اپنی تالیف کو زندہ و جاوید رکھنے کے لئے جس سنگین گنبد پہ کندہ کروایا تھا وہ تو مدت ہوئی تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ البتہ اس کی تحریر بے جان سے کاغذ پر آج بھی محفوظ ہے۔

فتوحات فیروز شاہی کے دو مخطوطے ہمارے علم میں ہیں، ان میں سے ایک مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے اور دوسرا برٹش میوزیم لندن میں۔ ۱۸۸۵ء میں دہلی سے کسی صاحب نے اسے شائع کیا تھا لیکن چھپنے کے ساتھ ہی یہ رسالہ چھپ گیا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے بھی ایک بار اُسے چھاپا تھا لیکن وہ ایڈیشن بھی اب ناپید ہے۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر شیخ عبدالرشید نے ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے متن تیار کر کے علی گڑھ سے اسے بڑے خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا اور اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا، لیکن اس رسالہ کے اردو ترجمہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

فتوحات فیروز شاہی کا مطالعہ فیروز شاہ کے ذہن کو سمجھنے کے علاوہ اس دور کے مذہبی افکار اور تصوف کے رجحانات کو جاننے کے لئے از حد ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# یا فتاح

اس خالق غفور و شکور کو حمد بے حد اور شکر بے حد سزاوار ہے جس نے مجھ بیچارے مسکین فیروز بن رجب غلام محمد شاہ بن تغلق شاہ کو احیاءِ سنّتِ رسول، بیخ کنی بدعات، دفعِ منکرات، منعِ محرمات اور فرائض و واجبات ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس سیّدِ کائناتؐ پہ بے شمار رحمتیں ہوں جو رسم و رواج کے خاتمہ کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ (حضورؐ کا فرمان ہے کہ "میں (جاہلیت کے) رسم و رواج ختم کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہوں"۔ ان پر اور ان کی آل اور اصحاب پر، جن کی مساعی جمیلہ سے جاہلیت کے رسم و رواج ختم ہوئے تھے، درود اور سلام ہو۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اما بعد۔ اس معطیِ حقیقی کے انعام و اکرام کا اظہارِ شکر واجبات میں سے ہے، اس لئے اس کا شکر احسن طریقے سے کرنا چاہیئے۔ آدم علیہ السلام کی اولاد کے سردار (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور "اما بنعمت ربک فحدث" میں اسی

طرف اشارہ ہے)۔ اس مسکین وبیکس کو بھی خدا تعالیٰ نے بہت سی نعمتیں عطا کی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ میں ان عطیات الٰہی کا، جو اس نے مجھے بخشے ہیں، طاقتِ بشری کے مطابق شکر ادا کروں۔ شاید اسی طرح میں اس کے شکر گزار بندوں میں داخل ہو جاؤں۔

اس خالقِ رازق جل جلالہٗ وعم نوالہٗ کے عطیات میں سے ایک عطیہ یہ ہے کہ ملک ہندوستان میں (بہت سی) بدعتیں اور خلاف شریعت باتیں مروج تھیں اور وہ عوام کی فطرت میں داخل ہو کر ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھیں اور لوگ راہ سنت سے منحرف ہو چکے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس بیچارے اور مسکین بندے کو یہ توفیق بخشی اور اس نے بدعتوں، خلافِ شریعت اور حرام کاموں کے خاتمہ کو اپنا فرض سمجھا۔ اس نے (اس سلسلے میں) بڑی جدوجہد کی یہاں تک کہ خدا کی مدد اور نصرت سے باطل رسموں اور خلاف شرع امور کا بالکل خاتمہ ہو گیا، اور حق اور باطل میں تمیز ہو گئی۔

۱۔ اولاً یہ کہ زمانہ ماضی میں مسلمانوں کا بہت سا خون بہایا جاتا تھا اور انھیں طرح طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ (مجرموں کے) ہاتھ، پاؤں، کان اور ناک کاٹے جاتے، آنکھیں نکالی جاتیں، پگھلا ہوا سیسہ حلق میں انڈیلا جاتا، موگری کے ساتھ ان کے ہاتھ، پاؤں اور سینہ کی ہڈیاں توڑی جاتیں، جسم کو آگ کے ساتھ داغا جاتا، ہاتھ پاؤں اور سینہ میں میخیں ٹھونکی جاتیں، کھال اتاری جاتی، خاردار ڈنڈے لگائے جاتے اور پاؤں کاٹ دیے جاتے تھے۔ آرے کے ساتھ چیر کر دو ٹکڑے کر دینے کے علاوہ ان کا اور بھی کئی طریقوں سے مُثلہ کیا جاتا تھا۔ اُس اکرم الاکرمین نے اور ارحم الراحمین نے اس بندۂ امیدوارِ کرم کے دل میں القا کیا اور اسے ہمت عطا فرما کر اس کام پر مامور کیا

کہ مسلمانوں کا خون بلاوجہ نہ بہنے پائے اور انہیں کسی بھی قسم کی اذیت نہ پہنچنے دے اور کسی بھی شخص کا مُثلہ نہ ہونے دے۔

### بیت

چگونہ شکر این نعمت گزارم
کہ زور مردم آزاری نہ دارم

(اگلے سلاطین) یہ سب کام کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں پر رعب بیٹھ جائے اور ان کا خوف دلوں پہ طاری ہو جائے اور انتظامِ سلطنت درست ہو جائے۔ وہ اس بات کی مثال دیا کرتے تھے۔

### بیت

ملک را بر قرار می خواہی
تیغ را بی قرار خواہی داشت

خدا کے فضل سے، جو اس مسکین کے شاملِ حال ہے، وہ سختیاں اور ڈر اب مہربانی، کرم اور احسان میں بدل گئے ہیں اور خواص و عام کے دلوں میں خوف و رجا پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ اب کسی کو قتل کرنے، مارنے پیٹنے، تکلیف دینے، سختی کرنے یا شکنجے میں کسنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ (مجھے) یہ سعادت خدا کے فضل اور عنایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

### نظم

کرم کن چو دست تو بالاتر است    کہ بخشایش از خشم والاتر است
ترا چون زباری بزرگی عطاست    بہ تعجیل رسم سیاست خطاست
گر اول توقف کنی در قصاص    توان کشت اورا کہ بدہی خلاص

ولیکن چو قالب پراگندہ گشت    نیارد بہ فرمان تو زندہ گشت
نگہ کن گہی مادر مہر سنج    بر آن طفل خود چند برداشت رنج
مگو "مرد کشتم صد اندر نبرد"    یکی زندہ کن تات خوانند مرد
چو بر خود نداری روا نشتری    مکش تیغ بر گردن دیگری
نکوشش اندر آن کز تنی خون رود    کہ جان باز ناید چو بیرون رود
بخون ریز خلق مشو فتنہ دوست    ترا نیز خونیست آخر بہ پوست
ہزار آفرین بر چنان رہبران    کہ پیش بزرگان نکو شد بخوان
زدولاب چرخ آن کسان راست آب    کہ ایشان نیارد در خون شتاب

چو دشمن زبون گشت احسان بکن
بہ قدرت جوان مردی جان بکن

خدا کی مدد سے (میں نے اپنے) دل میں اس بات کا تہیہ کر لیا کہ ہر مسلمان کا خون اور ہر مومن کا جسم محفوظ و مامون رہے گا اور اگر کوئی شخص راہِ شریعت سے ہٹے تو کتاب اللہ اور قاضی کے فیصلے کے مطابق وہ جس سزا کا مستحق ہو، اُسے دی جائے۔ وللہ الحمد علی توفیقہ

۲۔ اس کے علاوہ مجھ پر حق تعالیٰ و جل کا یہ فضل و کرم ہے کہ گذشتہ سلاطین کے القابات، جو جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے حذف کر دیے گئے تھے، اور ان مسلمان بادشاہوں کے نام، جن کی ہمت اور برکت سے کافروں کے شہر فتح ہوئے، جن کی فتوحات کے جھنڈے ہر ملک میں گڑے، صنم کدے برباد ہوئے، منبر تعمیر ہوئے، مسجدیں آباد ہوئیں، اعلائے کلمتہ الحق ہوا، اہلِ اسلام طاقتور اور حربی کافر ذمی بنے، بھلا دیے گئے تھے، میں نے حکم دیا۔ کہ حسب سابق سب کے نام اور اوصاف خطبہ میں پڑھے جائیں اور انہیں

دعائے مغفرت کے ساتھ یاد کیا جائے۔

### بیت

چو خواہی کہ نامت بود جاودان
مکن نام نیک بزرگان نہان

۳۔ اس کے علاوہ اس ہادی عز اسمہٗ کی مدد سے، زمانۂ ماضی میں جو ٹیکس، غیر قانونی، غیر شرعی اور حرام طریقوں سے جمع کر کے بیت المال میں داخل کیے جاتے تھے، مثلاً منڈوی برگ[1]، دلالت بازار[2]، جزاری[3]، امیری طرب[4]، گل فروشی[5]، جزیۂ تنبول[6]، چنگی غلہ[7]، کتابی[8]، نیلگری[9]، ماہی فروشی، ندافی[10]، صابون گری، ریسمان فروشی، روغن گری[11]، نخود بریاں[12]، تہ بازاری، چھتہ[13]

---

[1] منڈی کا ٹیکس
[2] دلالوں پر ٹیکس
[3] بڑے قصائیوں پر ٹیکس
[4] ناچ گانوں اور تماشوں پر ٹیکس
[5] پھولوں کی فروخت پر ٹیکس
[6] پان پر ٹیکس
[7] غلہ پر چنگی۔
[8] i۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کے خیال میں کتابت پر جو ٹیکس لیا جاتا تھا اُسے کتابی کہتے تھے۔
ii۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے خیال میں یہ لفظ کتابی نہیں بلکہ کبابی ہے اور اس سے وہ ٹیکس مراد ہے جو کبابوں پر لگایا جاتا تھا۔
iii۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اسے کیالی پڑھا ہے، ان کے خیال میں یہ ٹیکس تولنے والوں پر عائد کیا جاتا تھا۔
[9] نیل کی صنعت پر ٹیکس
[10] دھنے پر ٹیکس
[11] تیل نکالنے پر ٹیکس
[12] بھنے ہوئے چنوں پر ٹیکس
[13] چھتہ پر ٹیکس، بقول بعض کپڑے کی چھپائی پر ٹیکس۔

قمار خانہ[14]، داد بیگی[15]، کوتوالی[16]، احتسابی[17]، قصابی[18]، کوزہ خشت پزی[19]، کرہی[20]، چرائی[21] اور مصادرات[22]، ان کے متعلق میں نے دیوانِ مالیات کو حکم بھیجا کہ انہیں فی الفور ختم کر دیا جائے اور جو سرکاری آفیسر ایسے ٹیکس لوگوں سے لے کر (خزانے میں)، جمع کرلے اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

**بیت**

دل دوستان جمع بہتر کہ گنج
خزینہ تہی بہ کہ مردم بہ رنج

(میں نے یہ بھی حکم دیا کہ) جو مال بیت المال میں جمع ہو وہ انہی مدوں سے آئے جنہیں شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روا رکھا ہے اور دینی کتب میں بھی ان کا جواز موجود ہو، مثلاً زمین کا خراج، عُشر، زکوٰۃ وغیرہ یا پھر ہندوؤں سے لیا گیا جزیہ یا لاوارث جائداد، یا مالِ غنیمت اور کانوں کی پیداوار کا خمس، ایسی مدوں کی آمدنی جو کتاب اللہ کی رُو سے جائز نہ ہو، کسی طرح بھی بیت المال میں جمع نہ ہونے پائے۔

۴۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس سے پہلے یہ رسم اور عادت، جو سراسر بدعت تھی، رواج پا گئی تھی، کہ مالِ غنیمت کے چار حصے خزانے میں جاتے تھے اور

پانچواں حصہ غازیوں کو دیا جاتا تھا، حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے اور چار حصے غازیوں میں تقسیم کئے جائیں۔ یہاں سرکاری حکم کے مطابق اس کے برعکس ہو رہا تھا، تقسیم کا یہ حکم چونکہ شریعت کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے مالِ غنیمت کو جو بھی اپنے تصرف میں لاتا وہ فعل حرام کا مرتکب ہوتا تھا۔ اس طرح اگر کوئی کنیز بچے کو جنم دیتی تو وہ حرامی ہوتا تھا۔ اسے روکنے کے لئے ہم نے یہ حکم دیا کہ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے اور چار حصے غازیوں میں تقسیم کئے جائیں۔

۵۔ اس کے علاوہ یہ کہ شیعہ مذہب کے پیرو، جنھیں روافض کہتے ہیں، لوگوں کو مذہب رفض و تشیع کی دعوت دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق رسالے اور کتابیں لکھیں اور تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ حضرات خلفائے راشدین، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور تمام صوفیائے کرام رضی اللہ عنہم کو اعلانیہ بُرا بھلا کہتے اور لواطت کرتے تھے۔ وہ قرآن مجید کو "ملحقات عثمانی" کہتے تھے۔ میں نے ان سب کو گرفتار کر لیا، ان کی گمراہی اور ضلالت چونکہ ثابت ہو چکی تھی لہٰذا ان میں سے جو غالی تھے انھیں قتل کروا دیا اور دوسروں کو مار پیٹ، ڈانٹ ڈپٹ اور تشہیر کر کے چھوڑ دیا۔ ان کی کتابوں کو سرِعام جلا ڈالا، یوں، خدا کی عنایت سے، اس فرقہ کا شر مکمل طور پر ختم ہوا۔

۶۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملحد اور اباحتی جمع ہو گئے اور وہ عوام کو الحاد اور اباحت کی طرف بلایا کرتے تھے۔ رات کے وقت وہ بلا تمیز محرم

---

[14] جوا خانہ پر ٹیکس

[15] کورٹ فیس

[16] پولیس سے متعلق فیس

[17] احتساب کے متعلق فیس

[18] عام قصائیوں پر ٹیکس

[19] مٹی کے برتن اور اینٹیں بنانے پر ٹیکس

[20] دیہات کے مکان پر ٹیکس

[21] جانور چرانے پر ٹیکس۔

[22] جرمانے۔

وغیر محرم ایک خاص جگہ جمع ہوتے اور کھانا اور شراب سامنے رکھ کر کہتے کہ یہی ہماری عبادت ہے، انھوں نے ایک بت بھی بنا لیا تھا اور وہ لوگوں کو اس بات پر مجبور کرتے تھے کہ وہ اُسے سجدہ کریں۔ اس رات وہ اپنی بیویوں، ماؤں اور بہنوں کو جمع کرتے اور پھر جس کا لباس ان کے ہاتھ لگتا اُسی کے ساتھ زنا کرتے۔ ان کے پیروں کے، جو شیعہ تھے، ہم نے سر اڑا دیے اور باقیوں کو قید کیا، جلاوطن کیا یا سزا دی، یہاں تک کہ ان کا شر اسلامی حکومت سے مکمل طور پر ختم ہو گیا۔

۷۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک طبقہ دھریت اور ترک و تجرید کے رنگ میں لوگوں کو گمراہ کر کے مرید بنا رہا تھا۔ وہ لوگ کلماتِ کفر بھی بکا کرتے تھے۔ ان گمراہوں کا مرشد احمد بہاری نامی ایک شخص تھا جو شہر (دہلی) میں رہتا تھا۔ بہاریوں کا ایک گروہ، جو اُسے خدا کہتا تھا، گرفتار کر کے پابزنجیر ہمارے سامنے لایا گیا۔ یہ لوگ نبی اکرمؐ کی شان میں گستاخیاں کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جس شخص کی نو بیویاں ہوں اُس کی نبوت کی بھلا کیا شان ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مرید کہا کرتا تھا کہ دہلی میں خدا، یعنی احمد بہاری، ظاہر ہوا ہے۔ ان کے خلاف چونکہ اس بات کا ثبوت مل چکا تھا اس لیے ان دونوں کو میں نے گرفتار کر کے قتل کروا دیا اور دوسروں کو توبہ و استغفار کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے ان سب کو جلاوطن کر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تاکہ شر بھی منتشر ہو کر ختم ہو جائے۔

۸۔ اس کے علاوہ یہ کہ شہر دہلی میں ایک شخص رکن زالدین، ملقب بہ مہدی نے کہا کہ میں مہدی آخرالزمان ہوں اور مجھے علمِ لدنّی حاصل

ہو گیا ہے۔ میں نے کسی سے تعلیم اور فیض حاصل نہیں کیا اور مجھ کو تمام مخلوقات کے ناموں کا علم ہے جس کو سوائے آدم علیہ السلام کے اور کوئی پیغمبر نہیں جانتا۔ (اسی طرح) علم حروف کے راز جو کسی کو معلوم نہیں وہ مجھ پر ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔ اس نے اس پر کتابیں لکھیں اور لوگوں کو گمراہی اور بے راہ روی کی دعوت دی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں "رکن الدین رسول اللہ" ہوں۔ بڑے بزرگوں نے میرے سامنے اس بات کی گواہی دی کہ وہ ایسا ہی کہتا ہے اور ہم نے اس سے یہی کچھ سنا ہے۔ جب اُسے ہمارے سامنے لایا گیا اور ہم نے اس کی گمراہی اور بے راہ روی کے متعلق استفسار کیا تو اس نے اس بدعت اور گمراہی کا اقرار کیا۔

علمائے دین نے کہا، "وہ کافر ہو چکا ہے اور اس کا خون بہانا جائز ہے۔ یہ فتنہ چونکہ اس کے خبثِ باطن کی وجہ سے اسلام اور اہلِ سنت و جماعت میں سر اُٹھا رہا ہے اس لئے اگر اس کے دفعیہ میں، معاذ اللہ، تاخیر کی گئی تو اس کا یہ اثر ہو گا کہ بہت سے مسلمان گمراہ ہو کر دینِ اسلام سے نکل جائیں گے اس سے ایسا فتنہ پیدا ہو گا کہ بے شمار لوگ مارے جائیں گے۔"

ہم نے کہا کہ دنیا بھر کے علماء میں اس خبیث کی گمراہی اور فتنہ و فساد کا اعلان کیا جائے۔ اور ہر کس و ناکس کے کانوں تک یہ بات پہنچائی جائے۔ لہٰذا ان علمائے دین اور آئمہ شریعت کے فتویٰ کے مطابق وہ جس سزا کا مستحق ہو اُسے دی جائے۔ اُسے ان لوگوں کے ساتھ، جو اس کے معتقد، مددگار اور شریکِ کار تھے، قتل کیا گیا اور عوام میں خاص و عام نے جا کر اس کے گوشت، پوست اور اعضائے جسمانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے۔ اس طرح اس کا شر ختم ہوا جو دنیا والوں کے لئے باعث

تنبیہ ہوا۔

خدا کی نصرت اور عنایت سے میں نے اس طرح کے شر اور اس قسم کی بدعات کا استیصال کیا اور حق تبارک و تعالیٰ نے اپنے اس مسکین بندے کو یہ توفیق دی کہ وہ سُنّت کا احیا کرے۔ اس کے ذکر کی غرض محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے اس تحریر کو سُن کر یا پڑھ کر اگر کسی شخص کو اپنے دین کی فلاح مطلوب ہو تو وہ اسی طریقے پر عمل کرے اُسے اس کا اجر ملے گا، اور اُسے اس کارِ خیر کی طرف توجہ دلانے پر ہم بھی داخلِ ثواب ہوں گے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

9۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملک گجرات میں عین ماہرو کے غلاموں میں ایک شخص شیخ بن بیٹھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا اور "انا الحق" کا نعرہ لگانے لگا۔ وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتا تھا کہ جب میں "انا الحق" کہا کروں تو تم "توئی، توئی" کہا کرو۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ میں وہ بادشاہ ہوں جس کو موت نہیں آتی۔ اس نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں کلماتِ کفر مندرج تھے، اُسے زنجیروں سے جکڑ کر ہمارے سامنے لایا گیا۔ اس کی گمراہی چونکہ ثابت ہو چکی تھی۔ اس لئے ہم نے اُسے قتل کرا دیا اور اس نے جو رسالہ لکھا تھا وہ ہم نے جلا دیا۔ اس طرح خدا پرست مسلمانوں کے درمیان سے یہ فتنہ ختم ہوا۔

10۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک رسم اور عادت، جس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں لیکن شہر (دہلی) کے مسلمانوں کی فطرت میں داخل ہو چکی تھی، یعنی ایامِ متبرکہ میں عورتیں، ٹولیوں کی شکل میں، پالکیوں، بہلیوں اور ڈولیوں میں بیٹھ کر یا گھوڑوں اور گدھوں پر سوار، فوج در فوج اور گروہ

در گروہ پا پیادہ شہر سے باہر نکلتیں اور مزارات پر جاتیں (آوارہ مزاج لونڈے اور اوباش جو خواہشاتِ نفسانی میں مبتلا اور صلاح و تقویٰ سے عاری ہیں ان کے پیچھے ہو لیتے، جو فتنہ و فساد ان کی حرکات سے ظاہر ہو سکتا ہے وہ چشمِ بینا سے) پوشیدہ نہیں ہے۔ یوں بھی عورتوں کا اس طرح باہر نکلنا شرعاً منع ہے۔ ہم نے حکم دیا کہ کوئی عورت کسی مزار پہ نہ جائے اور اگر کوئی وہاں جائے تو اُسے سزا دی جائے۔ ان دنوں حق تعالیٰ کی عنایت سے کسی باپردہ مسلم خاتون یا عورت کی یہ مجال نہیں کہ باہر نکلے اور زیارت کو جائے۔ یہ بدعت بھی یوں ختم ہوئی۔

11۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدا کی دین ہے کہ ناپاک اور صنم پرست ہندوؤں نے، جنہوں نے عقدِ ذمت میں آ کر جزیہ دینا قبول کیا ہے اور ان کے گھر بار محفوظ ہیں، شہر کے اندر اور گرد و نواح میں نئے بتخانے تعمیر کر لیے تھے، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں چونکہ بتخانے تعمیر کرنے جائز نہیں ہیں اس لئے ہم نے حق تعالیٰ کی توفیق سے ان کی تعمیر کردہ غلط بنیاد عمارتوں کو برباد کر دیا۔ ہم نے ان کافروں کے سرغنے، جو دوسروں کو گمراہ کیا کرتے تھے، قتل کر ڈالے اور عام لوگوں کو مختلف قسم کی سزائیں دے کر متنبہ کیا۔ اس طرح یہ فساد بھی ختم ہوا۔

اس کے علاوہ ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ موضع ملوہ میں ایک تالاب ہے جسے کُنڈ کہتے ہیں اور وہاں بت خانے بنے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ اپنے متعلقین کے ساتھ ایک خاص دن، اپنی عادت کے مطابق، اسلحہ سجائے ہوئے کافی ساز و سامان کے ساتھ سوار ہو کر نکلتا ہے۔ ان کی عورتیں اور بچے پالکیوں اور بہلیوں میں بیٹھ کر

ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ وہ لوگ وہاں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر بت پرستی کرتے ہیں۔ وہ اس فتنہ میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ دکاندار قسم قسم کی کھانے پینے کی اشیاء لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں اور دکانیں لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک بے دین طبقہ نفسانی خواہشات لے کر ان کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ جب یہ بات ہمارے کانوں تک پہنچی تو ہم نے، خدا کی توفیق اور مدد سے اس فساد کو، جس کی وجہ سے دین اسلام کو نقصان پہنچ رہا تھا، ختم کرنے کا عزم کر لیا۔ جس دن وہ لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے حکم دیا کہ ان کے گروؤں کو، جو انہیں ورغلاتے اور گمراہ کرتے ہیں، قتل کیا جائے اور عام ہندوؤں کو اذیت ناک سزائیں دے کر (وہاں جمع ہونے سے) منع کیا۔ ہم نے وہ بت خانہ برباد کر ڈالا اور اس جگہ ایک مسجد بنوائی اور (گرد و نواح میں مسلمانوں کے) قصبات آباد کئے، ان میں سے ایک کا نام تغلق پور اور دوسرے کا نام سالار پور رکھا۔ ان دنوں اس جگہ جہاں ناپاک کافروں نے بتخانہ بنایا ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمان سچے معبود کے آگے سجدہ کرنے کے علاوہ، تکبیریں کہتے، اذانیں دیتے اور جماعت کے ساتھ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ جس جگہ پہلے کافروں کے مسکن ہوا کرتے تھے اب وہاں مسلمان بستے ہیں جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ذکر اور ورد کرتے رہتے ہیں۔ (اسلام کی اس سربلندی) کے لئے اللہ کی تعریف کرنی چاہیئے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ خبر ملی کہ موضع صالح پور میں بعض ہندوؤں نے ایک نیا شوالہ تعمیر کر لیا ہے اور بت پرستی میں مشغول ہیں۔ ہم نے وہاں

بھی بت خانہ برباد کرنے کے لئے آدمی بھیجے اور جو لوگ گمراہی پر اصرار کر رہے تھے انہیں جلاوطن کر دیا۔

علاوہ ازیں یہ کہ گوہانہ نام کے ایک قصبہ میں ہندوؤں نے ایک نیا بتخانہ تعمیر کر لیا تھا اور مشرکوں کا ایک گروہ وہاں جمع ہو کر بت پرستی کیا کرتا تھا۔ انہیں گرفتار کر کے ہمارے پاس لائے۔ ہم نے حکم دیا کہ ان میں سے جو شخص مایۂ فساد ہیں ان کی گمراہی کا اعلان کیا جائے اور انہیں قصرِ شاہی کی ڈیوڑھی کے سامنے قتل کیا جائے۔ ہم نے یہ حکم دیا کہ کفر کی کتابیں، اور بُت پرستی کے جو لوازمات وہ اپنے ساتھ لائے تھے انھیں بھی عوام کے سامنے مقتل میں ہی جلایا جائے۔ باقی لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کے ساتھ (ان کاموں سے) منع کیا جائے تاکہ دوسروں کو تنبیہ ہو اور آئندہ دار الاسلام میں کوئی ذمی ایسی جرأت نہ کرے۔

۱۲۔ اس کے علاوہ یہ کہ زمانۂ ماضی میں یہ رواج تھا کہ دسترخوان پر طلائی اور نقرئی ظروف استعمال کئے جاتے تھے اور تلواروں کے دستوں اور ترکش پر سونے سے نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ہم نے ایسا کرنے سے منع کیا اور اپنے اسلحہ کے نیام شکار شدہ جانوروں کی ہڈیوں سے بنوائے۔ ہم نے ان برتنوں کے استعمال کی عادت ڈالی جن کا استعمال شریعت کی رو سے جائز ہے۔

۱۳۔ علاوہ ازیں یہ کہ گذشتہ زمانے میں یہ رواج تھا کہ کپڑوں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں اور یہ (کپڑے) شاہی دربار میں لوگوں کو خلعت کے طور پر پہنائے جاتے تھے۔ اسی طرح لگام، زین، سواری

لے جانور کے طوق، عود جلانے والی انگیٹھی، تھال، پیالہ، کوزہ، طشت، لوٹے، خیمے، پردے، تخت، کرسی، جملہ آلات اور ہتھیاروں پر تصویریں بنائی جاتی تھیں یا پھر مجسمے بنے ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور عنایت شامل حال ہوئی تو ہم نے حکم دیا کہ ان تمام اشیاء پر سے تصویریں اور مجسمے مٹا دئیے جائیں اور (جو نقش و نگار) خلافِ شریعت نہیں اور ان کا بنانا جائز اور مباح ہے وہ بنائیں جائیں۔ جو مجسمے گھروں، دیواروں اور محلوں پر بنے ہوئے تھے، ان کے متعلق یہ حکم دیا کہ انہیں مٹا دیا جائے۔

۱۴۔ علاوہ ازیں یہ کہ اس سے پہلے اکثر بزرگوں کا لباس غیر شرعی یا ریشمی ہوتا تھا اور اس پر زردوزی کا کام کیا ہوا ہوتا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے ہم نے ایسا لباس اختیار کیا جو شریعت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی رُو سے مباح ہے۔ زردوزی والے کپڑے اور زربفت کی کلاہ کا استعمال شروع کیا جس میں (سنہری کام کی) چوڑائی چار انگشت سے زیادہ نہ ہو، اور جو کچھ غیر شرعی اور ناجائز تھا یا جس کا استعمال شریعت میں منع تھا، اُسے ترک کر دیا۔ اسلام پر (کاربند ہونے کے لئے) اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

۱۵۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسکین بندے پر جو عنایات کی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے ہمیں کارِ خیر کے لئے عمارات بنانے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ ہم نے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں اس غرض سے تعمیر کی ہیں کہ ان میں علماء، مشائخ، زاہد اور عابد معبودِ حقیقی کی عبادت کریں اور بنانے والے کو دُعائے خیر سے یاد کریں۔

ہم نے نہریں بھی کھدوائی ہیں اور درخت بھی لگوائے ہیں۔ [illegible] ایسی اراضی، جس کا حصول شریعت کے مطابق ہے اور اس پر سبھی کا اتفا ہے، نیز اس پر علمائے شریعت کا اجماع ہو چکا ہے (کہ اس کا حصول) ہر طرح کے شک و شبہ سے بالا ہے ہم نے اس کا ذکر صراحت کے ساتھ وقف نامہ میں کر دیا ہے کہ اس کی آمدنی بندگانِ خدا تک پہنچا دی جائے۔

۱۶۔ اس کے علاوہ خدا کے عطیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم نے گذشتہ سلاطین اور سابقہ اُمراء کی تعمیر کردہ عمارات کی جو امتداد زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں مرمت کرائی یا انہیں نئے سرے سے تعمیر کروا کے ان کو رونق بخشی۔ ہم نے ان عمارات کے استحکام کو اپنی تعمیر کردہ عمارات پر مقدم جانا۔

دہلی کی پُرانی جامع مسجد، جو سلطان معز الدین سام کی تعمیر کردہ ہے، قدامت کی وجہ سے مرمت طلب تھی، ہم نے اس کی اس طرح مرمت کروائی کہ اب اس میں نئے سرے سے جان پڑ گئی ہے۔

سلطان معز الدین سام کا مقبرہ، جس کی غربی دیوار اور پرانے دروازے کے تختے بالکل بیکار ہو چکے تھے، نئے سرے سے بنوایا۔ اس کے دروازوں، کھڑکیوں اور زینوں میں معمولی لکڑی کی بجائے صندل کی لکڑی استعمال کی گئی۔

سلطان معز الدین کا مینارہ، جو آسمانی بجلی کے حادثہ سے گر گیا تھا (ہم نے) اُسے اپنی اصل بلندی سے بھی بالا اور پہلے سے کہیں بہتر بنوا دیا حوض شمسی تک پانی لانے والی نالی کو بعض بد دیانت لوگوں نے کہیں اوپر ہی سے کاٹ کر پانی کی بہم رسانی روک دی تھی۔ ہم نے آب رسانی کی راہ میں حائل تمام رُکاوٹیں دُور کر دیں اور بیجا متجاوزوں

کی سرزنش کی۔

حوض علائی بے آب ہو کر مٹی سے اٹا پڑا تھا اور شہر کے لوگ اس میں کاشت کرنے لگے تھے۔ انھوں نے وہاں کنوئیں کھود لیے تھے اور ان کا پانی فروخت کرنے لگے تھے۔ ایک مدت کے بعد ہم نے اُسے (دوبارہ) کھدوایا۔ اب یہ عظیم حوض سال بھر پانی سے بھرا رہتا ہے۔

اسی طرح سلطان شمس الدنیا والدین التمش رضی اللہ عنہ کا مدرسہ، جس کے کئی کمرے منہدم ہو چکے تھے انہیں پہلے سے بھی کہیں بہتر بنوایا۔ مقبرہ کی تعمیر کے وقت صحن میں گچ کا پلستر نہیں ہوا تھا، وہ بھی کروادیا۔ گنبد میں پتھر سے تراشے ہوئے زینے کا اضافہ کیا اور چاروں برجوں کے جو پشتے ٹوٹ رہے تھے انہیں درست کروادیا۔

سلطان شمس الدین کے فرزند سلطان معزالدین کا مقبرہ جو ملک پور میں واقع ہے، اس طرح منہدم ہوا تھا کہ گویا وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس جگہ نئے سرے سے گنبد، چبوترہ اور چار دیواری تعمیر کی۔

سلطان رکن الدین بن سلطان شمس الدین کا مقبرہ جو ملک پور میں واقع ہے اس کے گرد چار دیواری بنوائی۔ (اس کے علاوہ) وہاں ایک نیا گنبد بنوایا اور خانقاہ تعمیر کروائی۔

سلطان جلال الدین کے مقبرہ کی مرمت کروائی اور وہاں نیا دروازہ تعمیر کیا۔

سلطان علاؤالدین کے مقبرہ کی مرمت کروائی اور اس میں صندل کے دروازے لگوائے (اس کے علاوہ) پیاؤ کی دیوار اور مدرسہ کے اندر جو مسجد ہے اس کی قبلہ رُخ دیوار کی نیو سے لے کر فرش تک مرمت کروائی۔

مقبرہ سلطان قطب الدین اور سلطان علاؤالدین کے فرزندوں خضر خان، شادی خان، فرید خان، سلطان شہاب الدین، سکندر خان، (محمد خان)

عثمان خان اور اس کے پوتوں اور پڑپوتوں کے مزاروں کی از سرِ نو مرمت کروائی۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الحق والدین محبوب الٰہی قدس اللہ سرہٗ کے مزار کی جالیاں اور دروازے صندل کی لکڑی سے بنوائے اور سونے کی قندیلیں، سنہری زنجیروں کے سہارے، گنبد کے چاروں گوشوں میں آویزاں کیں۔ جماعت خانہ (کے نام سے ایک) نئی عمارت تعمیر کی پہلے وہاں ایسی عمارت نہ تھی۔

سلطان علاؤالدین کا وزیر اعظم ملک تاج الدین کافوری جو باون ہزار سواروں کا سردار تھا، بڑی عقل اور فراست کا مالک تھا۔ اس نے ایسے بہت سے ملک، جہاں گذشتہ سلاطین کے گھوڑوں کے قدم بھی نہ پہنچے تھے، فتح کر کے سلطان علاؤالدین کے نام کا خطبہ جاری کیا۔ اس کا مقبرہ ڈھ چکا تھا اور اس کی قبر زمین کے برابر ہو گئی تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ حکومت کا خیر خواہ اور نمک حلال (ملازم) تھا۔ اس کا مقبرہ نئے سرے سے بنوادیا۔

دارالامان میں، جہاں ہمارے مخادیم کے مزارات اور خوابگاہیں ہیں۔ صندل کے دروازے لگائے اور اپنے ان آقاؤں کی قبروں پہ خانہ کعبہ کے دروازہ کے پردوں کے شامیانے لگوائے۔ ان مقبروں اور مدرسوں کی عمارتوں اور ان کی مرمت کے مصارف ان کے پرانے اوقاف سے پورے کئے۔ اس سے قبل جہاں آنے جانے والوں، فرش، روشنی اور دوسرے لوازمات کے لئے، جو ایسی جگہوں کے شایانِ شان ہیں، (رقم) مقرر نہ تھی، گاؤں وقف کئے تاکہ ان کی آمدنی ہمیشہ وہاں خرچ ہوتی رہے

اسی طرح جہاں پناہ کو، جس کا بانی سلطان محمد شاہ مرحوم و مغفور میرا آقا اور ولی نعمت تھا اور جس کی خدمت میں رہ کر میں پلا اور بڑھا ہوں، آباد کیا۔ اسی طرح مملکت دہلی میں واقع گذشتہ سلاطین کے تعمیر کردہ تمام

قلعوں کی مرمت کروائی۔

۱۷۔ اس کے علاوہ ہم نے مدرسوں اور مقبروں کے لئے، نیز گذشتہ سلاطین اور مشائخ عظام کے مزاروں پہ آنے جانے والوں کے لئے، اور ان بابرکت مقامات کے لئے ضروری سامان فراہم کرنے کی غرض سے ان کے پرانے وقف شدہ دیہات اور زمینوں کو برقرار رکھا، اور جن کے لئے اوقاف کی آمدنی یا اس کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا، ان کے حصے مقرر کئے تاکہ ہمیشہ کے لئے وہاں کارِ خیر جاری ہو جائے تاکہ آنے جانے والوں، اہل علم اور اہلِ معرفت کو وہاں آرام ملے اور وہ ہمیں اور انہیں دعائے خیر سے یاد کرتے رہیں۔

۱۸۔ اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے ہمیں توفیق بخشی اور ہم نے شفاخانہ قائم کیا تاکہ خاص و عام میں سے جسے کوئی مرض لاحق ہو یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہاں پہنچ جائے۔ وہاں طبیب موجود رہتے ہیں۔ دوا اور (پرہیزی) غذا کے مصارف اوقاف کی آمدنی) سے دئیے جاتے ہیں۔ مقیم اور مسافر، رذیل اور شریف، آزاد اور غلام، ہر طرح کے مریض وہاں آتے ہیں۔ (شفاخانہ میں) ان کا علاج ہوتا ہے اور خدا کے فضل و کرم سے وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

۱۹۔ اس کے علاوہ یہ کہ خدائے ذوالجلال اور قادرِ بے کمال نے اس بندۂ عاصی کو توفیق بخشی کہ وہ لوگ جو میرے آقا سلطان محمد شاہ مرحوم و مغفور، خدا اس کی قبر کو معطر کرے، کے عہدِ حکومت میں تقدیرِ الٰہی سے مارے گئے تھے، یا جن لوگوں کی آنکھیں، ناک، ہاتھ اور پاؤں جیسے اعضا ضائع ہو گئے تھے ان کے وارثوں کو شاہ مرحوم و مغفور سے راضی کیا۔ ان میں سے ہر ایک کو مال و زر دے کر رضامند کیا اور (ان سے) خوشنودی کے خطوط، جن پر مستند شہادتیں ثبت تھیں، لے کر ایک صندوق میں بند کر کے دارالامان میں سلطان مرحوم و مغفور، (خدا اس کی قبر کو روشن کرے،

کی قبر کے سرہانے رکھوا دیا تاکہ خدا تعالیٰ اپنے کرمِ بے پایاں سے میرے اس آقا اور مربی کو غریقِ رحمت کرے اور انہیں بھی اپنے (خاص) خزانے سے خوشی عطا کر کے میرے ولی نعمت کی طرف سے خوش کر دے۔

۲۰۔ اس کے علاوہ ایک عطیۂ الٰہی یہ بھی ہے کہ وہ دیہات یا زمین (جو لوگوں کے پاس) زمانۂ قدیم سے چلے آتے تھے لیکن گذشتہ دورِ حکومت میں ان سے چھن گئے تھے اور سرکاری دفتر کے ریکارڈ کی رو سے ان کے قبضہ اور تصرف میں نہ رہے تھے (ان کے متعلق ہم نے یہ حکم دیا کہ) جو کوئی ان کی ملکیت کا ثبوت شرعی عدالت میں پیش کرے وہ دیہات اور زمینیں یا جو کچھ بھی اس کی ملک ہو، اس پر قابض ہو جائے۔ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی توفیق سے ہم اس فضیلت کے مقام پہ ہیں اور حقداروں کو ان کے حق مل گئے ہیں۔

۲۱۔ اس کے علاوہ ہمیں توفیق ملی کہ ذمیوں کو دینِ ہدیٰ کی طرف رغبت دلائیں۔ ہم نے یہ اعلان کیا کہ کافروں میں سے جو بھی کلمۂ توحید پڑھ کر دینِ اسلام قبول کرے گا، جیسا کہ شریعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں آیا ہے، اس سے جزیہ ہٹا لیا جائے گا۔ یہ آواز سب کے کانوں تک پہنچا دی اور ہندوؤں نے فوج در فوج اور گروہ در گروہ آ کر اسلام قبول کیا اور اسی طرح آج تک وہ ہر طرف سے آ کر ایمان لاتے ہیں۔ ان سے جزیہ ہٹا لیا جاتا ہے اور وہ انعام اور خلعت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

۲۲۔ اس کے علاوہ یہ بھی خدا کی عنایت ہے کہ ہمارے عہدِ حکومت میں خدا کے بندوں کا مال و دولت ہر طرح سے محفوظ و مامون ہے اور ہم یہ روا نہیں رکھتے کہ کسی کی ملکیت سے تھوڑی بہت یا معمولی اور قلیل مقدار ہی چھین لی جائے، بہت سے بہکانے والے ہمارے پاس آ کر چغلیاں لگاتے ہیں کہ فلاں تاجر کے پاس اتنے لاکھ اور

فلاں عہدیدار کے پاس اتنے لاکھ کی رقم ہے۔ ہم نے سزا اور عقوبت سے چغلخوروں کی زبانیں بند کر دی ہیں تاکہ لوگ اس طبقہ کے شر سے محفوظ رہیں۔ بلاشبہ اب سبھی لوگ ہماری شفقت سے مجبور ہو کر ہمارے گرویدہ اور مخلص دوست ہو گئے ہیں۔

### قطعہ

نام نکو طلب، کہ گنج سخا　　بہتر از گنج خواستہ صد بار
یک تنا بہ کہ چند خرمن گنج　　یک دعا بہ کہ مال صد خروار

اس کے علاوہ یہ کہ خدا کی عنایت سے ہمارے دل میں فقیروں اور مسکینوں کی تواضع اور ان کی دلداری جاگزین ہو چکی ہے۔ ہم جہاں بھی کسی فقیر یا گوشہ نشین کو پاتے ہیں۔ اس سے ملنے کے لئے چل کر جاتے ہیں اور اس سے دُعا کی درخواست کرتے ہیں۔ (سنا ہے کہ) سب سے اچھا امیر وہ ہوتا ہے جو فقیر کے دروازے پر جاتا ہے"، کیا عجب کہ ہمیں بھی یہ رُتبہ مل جائے۔

۲۴۔ اس کے علاوہ یہ کہ سرکاری ملازمین میں سے جو بھی عمرِ طبعی پاتا اور اور بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا وظیفہ مقرر کر کے اُسے سبکدوش کر دیتے ہیں۔ (وقتِ وداع) ہم اُسے یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اب آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤ اور جن منکراتِ دین و شرع کا جوانی میں ارتکاب کیا تھا ان سے تائب ہو کر دنیا سے مُنہ موڑ لو اور آخرت کے معاملات کی طرف دھیان رکھو۔

### رُباعی

چون پیر شدی، کار جوان نتوان کرد
پیریست نہ کافری، نہان نتوان کرد
در ظلمت شب ہر آنچہ کردی کردی
در روشنیٔ روز نہان نتوان کرد،

۲۵۔ اس کے علاوہ

### قطعہ

طریق و رسم صاحب دولت آنست　　کہ بنوازند مردان نکو را،
دگر چون عمر آنکس منقضی شد　　نکو دارند فرزندان او را،

اشعار بالا کے مصداق جو بالاذمانِ (شاہی) جاہ و منصب رکھتے ہیں، جب تقدیرِ الٰہی سے وہ اس دارِ غرور سے دارِ سرور میں چلے جاتے ہیں، ان کا جاہ و منصب اِن کے فرزندوں کو اس طرح عطا کرتے ہیں کہ ان کے آبا کو جو عزت اور آسائش میسّر تھی اس میں کمی نہ ہو۔

### قطعہ

رسم و آئین بادشاہان است　　کہ خردمند را عزیز کنند
وز پس عہد او، وفاداری　　با خردمند زادہ نیز کنند

۲۶۔ مزید براں، سب سے بڑی اور بہتر نعمت جو خداوند کریم جل جلالہٗ و عم نوالہٗ نے اس بندے کو بخشی ہے وہ خلیفۂ وقت ابنِ عمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، دوستی، خیر خواہی اور فرمانبرداری ہے، اور یہی (ہماری) حکومت کے قانونی ہونے کا ثبوت ہے۔ کسی (حاکم) کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خلیفہ کا خادم ہونے کا شرف حاصل نہ کرے اور اس کے دربارِ عالیہ سے منشور حاصل نہ کرے۔ خدا نے (ہمیں) اس کی توفیق دی اور اس کے متعلق (ہمارا) عقیدہ بہت پختہ ہے۔ دربارِ خلافت سے ہمیں اذنِ مطلق اور خلیفہ کی نیابت کا منشور عطا ہوا ہے اور اعلیحضرت امیر المومنین نے جس منشور میں ہماری بیعت کی قبولیت کا ذکر کیا ہے اس میں ہمیں "سید السلاطین" کے خطاب سے بھی مشرف کیا ہے۔ اُنھوں نے دربارِ خلافت سے پے در پے ہم پر جو نوازشات کی ہیں ان میں خلعت، عمامہ، علم، خاتم، تلوار اور قدم شریف شامل ہیں، ان سے دنیا والوں پر بزرگی

اور شان ظاہر ہوتی ہے۔

یہ باتیں اس لئے لکھی ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عنایات کا ذکر کیا جائے اور اس کے انعام و اکرام کے ہزارویں حصے میں سے ایک حصہ اور کثیر میں سے حقیر سی بات کا شکر ادا کیا جائے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جو لوگ کارِ خیر اور نیکی کے کے خواہشمند ہیں، وہ اس کا مطالعہ کر کے یہ جان لیں کہ یہی مستحسن طریقہ ہے، اور پھر مروّت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اس پر کاربند ہونے کی سعادت حاصل کریں۔ انہیں اپنے اعمال کا ثواب اور ہمیں نیکی کی رغبت دلانے کا اجر ملے گا۔ نیکی کی طرف بلانا گویا نیکی کا کام کرنا ہے۔

# نظریۂ خلافت

خلیفہ کا لفظ خلافت سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی نیابت جانشینی اور کسی کی قائم مقامی کے ہیں لیے قرآنی اصطلاح میں خلیفہ سے مراد نائب اور خلافت سے مراد نیابت ہے۔ دینی اور سیاسی اصطلاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہ وسلم کے جانشین کو خلیفہ کہتے ہیں اور یہ اصطلاح خود آنحضرتؐ نے اس حدیث میں استعمال فرمائی ہے:

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین[1]

نبوت کے بعد خلافت بڑا اہم ادارہ ہے اور صحابہ کرامؓ نے نصبِ امام کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تدفین پر ترجیح دی ہے۔ انگلستان میں صدیوں سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ جب کوئی حکمران فوت ہوتا ہے تو اس وقت تک اس کی تدفین عمل میں نہیں آتی جب تک اس کے ولی عہد کی تخت نشینی

---

۱۔ سعید احمد اکبرآبادی، صدیق اکبر، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۱ء ص ۸۹

۲۔ شاہ اسمٰعیل شہید، منصبِ امامت، مطبوعہ دہلی ۱۸۷۷ ص ۶۷

کا باقاعدہ اعلان نہیں ہو جاتا۔ ملک و ملت کی فلاح اسی میں ہے کہ اس منصب کو خالی نہ چھوڑا جائے اور جب کوئی سربراہ مملکت فوت ہو جائے تو اس کی جگہ فوراً کسی مستحق شخص کو سربراہ بنا دیا جائے۔ ابو یعلیٰ محمد بن الحسین الفراءؒ (م ۱۰۶۵ء) امام احمد بن حنبلؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ لوگوں کو حکم دینے والے امام کی غیر موجودگی میں فتنہ پیدا ہو جائے گا۔[1]

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (م ۱۷۶۲ء) امام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقامتِ دین، احیائے علوم دینیہ، اقامتِ ارکانِ دین، قیامِ جہاد، ترتیبِ جیوش، قیامِ عدلیہ، رفعِ مظالم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے خلافت کا قیام ضروری ہے[2] اسی طرح امام ابو حفص عمر النسفی اپنی تصنیف مجمع العلوم میں "اصول دین علیٰ اعتقاد المہتدین"، کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ نفاذِ شریعت، اقامتِ حدود، دارالسلام میں کفار کے داخلے کو روکنے، لشکر تیار کرنے، زکوٰۃ اور دوسرے واجبات وصول کرنے، دشمنوں چوروں اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کرنے، جمعہ اور عیدین کی نمازیں قائم کرنے، لوگوں کے جھگڑے چکانے، نابالغوں کے حقوق کی نگہداشت اور تزویج کا اہتمام کرنے اور مالِ غنیمت کی تقسیم

کے لئے نصب امام کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔[1]

شیخ الاسلام تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ (م ۱۳۲۸ء) جنہیں میں اسلامی فکر کا بہترین ترجمان سمجھتا ہوں، ضرورتِ امام کے تحت رقم طراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو یا بالفاظِ دیگر تبلیغ کو واجب قرار دیا ہے اور یہ فریضہ قوت و امارت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اسی طرح جہاد، عدل، انصاف، اقامتِ حج، جمعہ و عیدین، مظلوموں کی داد رسی، اقامتِ حدود اور بہت سے دوسرے فرائض و واجبات بھی قوت کے بغیر انجام نہیں پا سکتے۔[2] اس لئے نصب امام کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک خلیفہ یا امام کا تعین مسلمانوں پر "الیٰ یوم القیامہ" واجب بالکفایہ ہے[3] فضل اللہ بن روزبہان اصفہانی (م ۱۵۲۱ء) فرماتے ہیں کہ نصبِ امام اہلِ حق پر شرعاً واجب ہے[4] امام ابو الحسن علی الماوردی (م ۱۰۵۷ء) فرماتے ہیں کہ امامت کا وجوب ثابت ہے۔ یہ اپنے حکم میں جہاد اور حصولِ علم کی طرح فرض کفایہ ہے اور اگر کوئی شخص امام بن گیا تو تمام لوگوں سے اس کی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی[5] ابو یعلیٰ بھی نصبِ امامت کو فرض

---

۱۔ ابو یعلیٰ، الاحکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء ص ۱۹

۲۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفا، مطبوعہ بریلی ۱۸۶۹ء ص ۲

---

۱۔ فضل اللہ بن روزبہان، سلوک الملوک، مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۶ء ص ۴۱

۲۔ پروفیسر رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء ص ۱۶۸

۳۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء مطبوعہ بریلی ۱۸۶۹ء ص ۳

۴۔ فضل اللہ بن روزبہان، سلوک الملوک مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۹۶۶ء ص

۵۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۸۱ء ص ۴، ۵

کفایہ مانتے ہیں لیکن وہ یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ڈالنے کے بجائے اہلِ حل و عقد اور خلافت کے لئے جامع شرائط امیدوار پر ڈالتے ہیں[1]۔ شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ اہل سنت کے ہاں نصبِ امام اُمت پر واجب بالکفایہ ہے لیکن شیعوں کے ہاں خدا پر واجب ہے کہ وہ امام مقرر کرے[2]۔ نصب امام کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فقہا کرام اور سیاسی مفکروں نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں مر جائے کہ اس کی گردن میں امام کی اطاعت کا جوا نہ ہو تو وہ گویا جاہلیت کی موت مرتا ہے[3]۔

یہ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے اور اہم منصب کی ذمہ داریاں نبھانی ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ اسی لئے ہمارے سیاسی مفکروں نے خلیفہ کے لئے چند شرائط عاید کی ہیں۔ جب تک کوئی شخص ان شرائط پر پورا نہ اترے اس وقت تک وہ مسند خلافت پر بیٹھنے کے لائق نہیں۔ اس ضمن میں امام ابوالحسن علی الماوردیؒ نے امیدوار خلافت کے لئے سات شرائط عاید کی ہیں:

۱۔ عادل ہو تاکہ حق پژوہی کر سکے۔

۲۔ عالم ہو تاکہ اجتہاد کر سکے۔

۳۔ صحتِ حواس، تاکہ اپنے فرائض کما حقہ ادا کر سکے۔

---

۱۔ ابو یعلیٰ، احکام السلطانیہ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء ص ۱۹

۲۔ شاہ ولی اللہ، المقدمۃ السنیہ، مخطوطہ رضا لائبریری، رامپور ورق ۱ الف

۳۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفا، مطبوعہ کراچی، مطبع سعیدی، حصہ اوّل ص ۳

۴۔ عاقل ہو

۵۔ شجاع ہو

۶۔ قریشی ہو

۷۔ سلامتی اعضاء یعنی اس میں جسمانی عیب نہ ہوں[1]۔

امام الماوردیؒ کے ہم عصر ابو یعلیٰ محمد بن الحسین الفرا (م ۱۰۶۵ء) لکھتے ہیں کہ امیدوار خلافت کو ان صفات کا حامل ہونا چاہیے:

۱۔ وہ قریشی ہو

۲۔ اس میں قاضی کی جملہ شرائط موجود ہوں یعنی وہ آزاد بالغ عاقل اور عادل ہو۔

۳۔ وہ امورِ حرب سے واقف ہو، سیاست کو سمجھتا ہو اور شرعی حدود نافذ کر سکتا ہو۔

۴۔ وہ علم دین میں دوسروں سے افضل ہو[2]۔

علامہ ابنِ خلدون (م ۱۴۰۶ء) کے نزدیک امیدوار خلافت کے لئے صرف چار شرائط کافی ہیں:

۱۔ علم:۔ اسے احکامِ شریعت اور مسائل کا علم ہو، وہ صاحبِ اجتہاد ہو۔ صرف عالم ہونا کافی نہیں۔ ابن خلدون خلیفہ کے لئے تقلید کو نقص شمار کرتے ہیں۔

۲۔ عدالت:۔ خلافت ایک دینی منصب ہے لہٰذا خلیفہ کو

---

۱۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ ص ۲۰

۲۔ ابو یعلیٰ، احکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ ص ۲۰

راستباز اور نکو کار ہونا چاہیئے۔

۳۔ کفایت :۔ خلیفہ میں حدود شرعیہ قائم کرنے کی صلاحیت اور جہاد کی سمجھ بوجھ ہونی چاہیئے۔

۴۔ سلامتی حواس و اعضاء تاکہ وہ اپنے فرائض کماحقہ انجام دے سکے[۱]

مولانا فضل اللہ بن روزبہانؒ (م ۱۵۲۱ء) نے امام الماوردی کی عائد کردہ شرائط کو ذرا وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

۱۔ وہ قریشی ہو

۲۔ مجتہد ہو

۳۔ عادل ہو

۴۔ بالغ ہونا

۵۔ عاقل ہو

۶۔ شجاع و قوی دل ہو

۷۔ صاحب رائے و تدبیر ہو تاکہ ملک کے امور سنبھال سکے۔

۸۔ خداوند کفایت اور علم بمصالح مال ہو۔

۹۔ مرد ہو، کیونکہ عورتیں اس منصب جلیلہ کی اہل نہیں۔

۱۰۔ آزاد ہو، کیونکہ غلامی باعثِ عار ہے۔

۱۱۔ سمیع و بصیر ہو۔

---

[۱] پروفیسر رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء ص ۲۰۲

۱۲۔ ناطق ہو تاکہ بات چیت کر سکے[۱]

شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۷۶۲ء) نے امیدوارِ خلافت کے لئے امام الماوردی اور فضل اللہ بن روزبہان سے ملتی جلتی شرائط عاید کی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امیدوار خلافت کو ان دس شرائط پر پورا اترنا چاہیئے:

۱۔ وہ مسلمان ہو

۲۔ مرد ہو، عورت نہ ہو

۳۔ آزاد ہو غلام نہ ہو

۴۔ شجاع ہو

۵۔ عاقل و بالغ، بالفاظ دیگر وہ مجنوں کمسن اور حواس باختہ نہ ہو

۶۔ متکلم، سمیع اور بصیر ہو، یعنی وہ گونگا، بہرہ اور اندھا نہ ہو

۷۔ امور حرب میں صاحب رائے ہو

۸۔ مجتہد ہو

۹۔ عادل ہو

۱۰۔ قریشی ہو[۲]

نظام الملک طوسی (م ۱۰۹۱ء) کے نزدیک اس کے لئے علاوہ دیگر صفات کے خوش شکل ہونا بھی ضروری ہے[۳] ان کا یہ خیال ہے کہ اگر وہ بدشکل ہوگا تو اس کا رعب لوگوں کے دلوں پر نہیں بیٹھے

---

[۱] فضل اللہ بن روزبہان سلوک الملوک مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۶۶ء ص ۴۱، ۴۲

[۲] شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفا، مطبوعہ بریلی ۱۸۶۹ء، ص ۴، ۵

[۳] نظام الملک طوسی، سیاست نامہ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۴ش ص ۷

گا اور وہ اس کی اطاعت سے روگردانی کریں گے۔

امام ابوالحامد محمد الغزالی (م ۱۱۱۱ء) کی یہ رائے ہے کہ خلیفہ کے لئے عاقل و ذکی ہونا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس کے لئے فہم و فراست عقل و ادراک، دور اندیشی، اعلیٰ ترین قوت ارادی، حالات حاضرہ سے واقفیت، رعایا کے ساتھ بے پناہ محبت اور قدیم حکمرانوں کی تاریخ کا علم بھی ضروری ہے۔ اس میں عدل، تواضع، سخاوت اور رحم دلی جیسے اوصاف ضرور ہونے چاہیئں[1]

ابو نصر فارابی (م ۹۵۰ء) یونانی فلسفے سے بہت متاثر ہے اور لوگ اسے ارسطوئے ثانی کہتے ہیں۔ اس کے نزدیک خلیفہ کو ان بارہ صفات کا حامل ہونا چاہیئے:

۱۔ وہ جسمانی لحاظ سے بے عیب ہو

۲۔ ذکی اور عاقل ہو

۳۔ محض ناطق نہ ہو بلکہ بہترین مقرر ہو اور وہ اپنی تقریر سے بڑے سے بڑے مجمعے پر چھا جائے۔

۴۔ لہو ولعب سے متنفر ہو۔

۵۔ قوی حافظہ کا مالک ہو

۶۔ لوگوں پر علم کے لئے اپنی محبت واضح کر سکے۔

۷۔ کم سے کم بحث میں بات کی تہہ کو پہنچ جائے۔

۸۔ خواہشات نفسانی پر مکمل قابو رکھتا ہو۔ وہ خور و نوش اور

---

[1] پروفیسر رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ ص ۱۲۰

جنسی تعلقات کو حد سے آگے نہ بڑھنے دے۔

۹۔ وسیع القلب ہو اور اسے عدل و انصاف سے خصوصی لگاؤ ہو اور وہ ظلم و تشدد کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دے۔

۱۰۔ جس چیز کو وہ اچھا سمجھتا ہو اسے بلا خوف و تردید نافذ کر سکتا ہو۔

۱۱۔ اس کا خزانہ ہمیشہ معمور رہے۔

۱۲۔ وہ سچ سے محبت اور جھوٹ سے نفرت کرتا ہو[1]

فارابی اور غزالی نے مسلمانوں کا دور زوال دیکھا تھا اس لئے اس قسم کا مثالی حکمران ملنا محال تھا۔ لہٰذا ان دونوں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر بصد حسرت کہا کہ ان دنوں ایک شخص میں ان تمام صفات کا جمع ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے اس میں جتنی صفات کم ہوں اس کے اتنے ہی مشیر مقرر کر دیے جائیں جن میں وہ صفات موجود ہوں۔ جن سے حکمران عاری ہے۔ فارابی فلسفہ سے فطری لگاؤ کے تحت یہ کہتا ہے کہ اس کے مشیروں میں ایک فلاسفر ضرور ہونا چاہیئے ورنہ اس کی حکومت زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی[2]

نظامی عروضی سمرقندی (م بعد ۱۱۵۲ء) رقم طراز ہے کہ خلیفہ کے لئے نبی کا نائب ہونا ضروری ہے تاکہ وہ شرع و سنت کو قائم رکھے۔ اس کے لئے افضل و اکمل ہونا شرط ہے[3] اس کے برعکس اہل سنت کے

---

[1] ایضاً، ص ۵۵، ۵۶

[2] ایضاً، ص ۵۶

[3] نظامی عروضی سمرقندی، چہار مقالہ، مطبوعہ لیڈن ۱۹۱۰ء، ص ۱۱

عقاید کے۔ امام ابو حفص عمر النسفیؒ کے نزدیک خلیفہ کے لئے اپنے ہمعصروں سے افضل ہونا کوئی شرط نہیں[۱] امام حسن عسکری کی وفات کے بعد جب اثنا عشری شیعہ امام کی غیبت کے قائل ہوئے تو النسفی نے کہا کہ ہمارے نزدیک امام کے لئے ظاہر ہونا شرط ہے[۲]

شاہ اسماعیل شہید دم ۱۸۳۱ء کے پیش نظر سید احمد بریلویؒ تھے جکے ہاتھ پر مجاہدین نے بیعت جہاد کی تھی۔ شاہ شہیدؒ نے حالات گردوپیش اور ضرورت جہاد کو مدنظر رکھتے ہوئے خلیفہ کے لئے مندرجہ ذیل شرائط لازمی قرار دی ہیں:

۱۔ وہ فسق و فجور اور جور و تعدی کو روک سکتا ہو

۲۔ وہ ملحدوں کے فساد اور بدعیتوں کی رخنہ اندازی کا سدباب کر سکتا ہو

۳۔ وہ لشکرکشی کا طریقہ جانتا ہو

۴۔ وہ شجاع، جرأت مند اور صاحب استقامت ہو اور شجاعت کا قدردان ہو۔

۵۔ وہ صاحب صولت و سطوت ہو

۶۔ وہ خداشناس اور قانون عدل و انصاف کے تابع ہو۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھے۔

۷۔ وہ ملت کی حفاظت کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

---

[۱] فضل اللہ بن روزبھان، سلوک الملوک مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۶ء ص ۴۳

[۲]

۸۔ وہ مردم شناس ہو

۹۔ وہ اقسام بدعت و منہیات، فواحشات، فسق و فجور اور لہو و لعب کا سدباب کرنے کا اہل ہو۔

۱۰۔ وہ بیت المال کے مداخل و مخارج کے بندوبست کا سلیقہ جانتا ہو[۱]

یہ تمام شرائط گنوانے کے بعد شاہ شہیدؒ فرماتے ہیں کہ خلیفہ چونکہ پیغمبر کا جانشین ہوتا ہے اس لیے اسے پیغمبرانہ صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔

اہلِ تشیع کے ہاں امام حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے ہوتا ہے۔ اسے لوگ منتخب نہیں کرتے بلکہ وہ "مامور من اللہ" ہوتا ہے۔ وہ معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔ اس سے عمداً یا سہواً کسی بھی قسم کا کبیرہ یا صغیرہ گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ ان شرائط پر تمام علمائے امامیہ کا اجماع ہے[۲]

شیعوں کے ہاں امام ظاہر بھی ہو سکتا ہے اور غائب بھی۔ ان کے عقیدہ کے مطابق دنیا بغیر امام کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے موجودہ امام محمد المہدی عراق میں سامرا کے مقام پر ایک غار میں روپوش ہے وہ قیامت کے قریب ظاہر ہو کر دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کردیگا۔

---

[۱] شاہ اسماعیل شہیدؒ، منصب امامت، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء ص ۳۰، ۳۱

[۲] ابن طقطقی، کتاب الفخری، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۲ء ص ۱۸

[۳] سٹانلے لین پول، فہرست مسکوکات مشرقیہ در متحف برطانی، مطبوعہ لندن ۱۸۹۰ء ج پنجم

[۴] باقر مجلسی، حیات القلوب، نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۳ ج ۳ ص ۱۵

اسماعیلی، شیعوں ہی کی ایک شاخ ہیں۔ وہ اثنا عشری شیعوں سے چھٹے امام جعفر صادقؒ کی وفات کے بعد الگ ہو گئے۔ جعفر صادقؒ کے بڑے بیٹے اسماعیل اپنے والد کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے اس لئے جعفر صادق کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے موسیٰ کاظمؒ ان کے جانشین ہوئے۔ اسوقت شیعوں کے ایک گروہ نے یہ مشہور کر دیا کہ موسیٰ کاظمؒ کی امامت صحیح نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگرچہ اسماعیل اپنے والد کی زندگی میں فوت ہو گئے ہیں لیکن امامت کے حقدار وہی تھے۔ امام کو خدا مقرر کرتا ہے بندے اسے مقرر نہیں کرتے۔ اسماعیل کو خدا تعالیٰ امام مقرر کر چکا تھا اس لئے اسماعیل کے بعد منصبِ امامت اس کی اولاد میں منتقل ہو گا۔[1]

اسماعیلیوں کے ہاں امام طیب (م ۱۱۳۲ء) تک امامت کا سلسلہ بغیر کسی نزاع کے چلتا رہا۔ امام طیّب کی غیبت کے بعد ان کے جانشین کے بارے میں ان کے معتقدین میں اختلاف رونما ہوا۔ اسماعیلیوں کے ایک گروہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ امام طیّب آخری امام تھے۔ ان کے بعد اب کوئی امام نہیں آئیگا اور امام کی نیابت "داعی" کریں گے۔ جو اسماعیلی امام طیّب پر ختم امامت کے قائل ہوئے وہ "بوہرے" کہلائے یہ سلسلہ کچھ عرصے تک بلا کسی نزاع کے چلتا رہا۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ "داعی" کے منصب کے حصول پر داؤد اور سلیمان میں اختلاف پیدا ہو گیا اور یہ جماعت دو گروہوں میں منقسم ہو

---

[1] ۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اردو آرٹیکل اسماعیلیہ

گئی۔ داؤد کے حامی داؤدی بوہرے اور سلیمان کے طرفدار سلیمانی بوہرے کہلانے لگے۔[1] داؤدی بوہروں کے موجودہ داعیٔ مطلق ملّا برہان الدین ہیں جن کی دعوت کا مرکز سورت میں جامعہ سیفیہ کے نام سے مشہور ہے۔ سلیمانی بوہروں کی تعداد بہت کم ہے اور حقانی چوک گاڑی کھاتا کراچی میں ان کی مسجد موجود ہے۔

زیدی بھی شیعوں ہی کا ایک فرقہ ہے۔ یہ لوگ امام زین العابدینؒ کے بعد محمد باقرؒ کے بجائے ان کے بھائی زید کی امامت کے قائل ہیں یمن کے باشندوں کی اکثریت اسی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ زیدی اپنے عقاید میں شیعوں کے دوسرے فرقوں کی نسبت اہل سنت کے قریب تر ہیں۔[2] علامہ شوکانی صاحب نیل الاوطار اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ہاں افضل کی موجودگی میں مفضول کی بیعت بھی جائز ہے۔ زیدیوں کا کہنا ہے کہ خلافت کے مستحق تو حضرت علیؓ تھے۔ لیکن جب ان کی بجائے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا تقرر بطور خلیفہ ہو گیا تو ان کی خلافت بھی جائز ہو گی۔

خلافت کے بارے میں جہاں تک خوارج کا تعلق ہے۔ ابتدا میں وہ اس بات کے قائل تھے کہ امیدوارِ خلافت کے لئے عرب ہونا شرط ہے بعد میں انہوں نے یہ شرط اڑا دی اور ان کے ہاں کوئی بھی مسلمان خلیفہ ہو سکتا ہے۔

خلافت کے بارے میں معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر تمام لوگ

---

[1] ۱۔ ایضاً (گذشتہ صفحہ) [2] ۲۔ خواجہ عباد اللہ اختر، مذاہب اسلامیہ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ ص ۲۹۱

احکامِ شریعت پر کاربند ہو جائیں۔ وہ پیار و محبت کے ساتھ مل جل کر رہیں اور معاملات میں دیانتدار ہو جائیں تو پھر نصبِ امام کی سرے ہی سے ضرورت نہیں۔[1] خوارج کے بعض گروہ بھی اس معاملے میں معتزلہ کے ہمنوا تھے۔ خلافت کے متعلق معتزلہ کا یہ عقیدہ محلِّ نظر ہے۔ عہدِ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ سے بہتر اور کونسا زمانہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں مُخبرِ صادق ؐ کا فرمان ہے:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم
ثم الذین یلونهم

اس خیر القرون میں بھی نصبِ امام کی ضرورت اس شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ صحابہ کرام ؓ نے اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تدفین پر ترجیح دی تو بعد کے زمانے میں نصبِ امام کے بغیر کیونکر گزارہ ہو سکتا ہے۔

عہدِ سلاطین میں تو لوگوں کے ذہنوں یہ بات بٹھائی گئی:

لولا السلطان اكل الناس بعضهم بعضا

یعنی اگر سلطان نہ ہو تو انسان، انسان کو کھا جائے۔[2] اگرچہ یہ حدیث محدّثین کے نزدیک ضعیف ہے لیکن اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] الفرڈ گلیوم دی ٹریڈیشنز آف اسلام، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۲۴ء ص ۱۶۰

[2] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵۲۔

مرجئہ فرقہ اُموی عہد میں بڑے عروج پر تھا۔ ان کے خیال میں خلیفہ کے لئے مسلمان ہونا اور زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار کرنا کافی ہے۔ انہیں خلیفہ کی سیرت و کردار سے کوئی بحث نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بندہ اور خدا کا معاملہ ہے اور وہ اپنے اعمال کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔[1]

امام ماوردی، ابو یعلیٰ اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط عاید کی ہے ان کے خیال میں غیر قریشی اس منصب کا اہل نہیں۔ شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں استدلال کے طور پر چار حدیثیں نقل کی ہیں:

| | |
|---|---|
| ۱۔ قال رسول اللہ الأئمة من القریش | یعنی امام قریش میں سے ہوں گے۔ |
| ۲۔ عن ابی هریره و جابر ابن عبد اللہ الناس تبع لقریش فی هذا الشان | یعنی لوگ اس معاملے میں قریش کی پیروی کریں گے۔ |
| ۳۔ عن عبد اللہ ابن عمر ؓ لایزال هذا الامر فی قریش ما بقی منهم اثنان | یعنی یہ امر (خلافت) قریش میں سے ختم نہ ہوگا جب تک ان میں دو افراد بھی زندہ ہیں۔ |
| ۴۔ عن معاویه بن | |

---

[1] حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظم مملکت مطبوعہ دہلی ۱۹۴۷ ص ۲۷

| | |
|---|---|
| ابی سفیانؓ ان ھذا | یعنی جب تک قریش دین |
| الامر فی قریش | کی اقامت کرتے رہیں گے |
| لا یعادیھم احدٌ | یہ امر (خلافت) انہی میں رہے |
| لاکبہ اللہ علی وجھہ | گا جو کوئی اس معاملے میں ان |
| ما اقاموا الدین | سے جھگڑا کرے گا اللہ تعالیٰ |
| | اس کو ذلیل کرے گا[1] |

محدثِ شہیر جلال الدین سیوطیؒ (م ۱۵۰۵ء) نے بھی اس ضمن میں تین حدیثیں نقل کی ہیں:

| | |
|---|---|
| ۱- الائمۃ من القریش | یعنی حکومت پر قریش کا |
| ۲- الملک فی قریش و | قضا پر انصار کا اور اذان |
| القضاہ فی الانصار و | پر حبشہ والوں کا حق ہے۔ |
| الاذان فی الحبشہ۔ و | اس حدیث کی اسناد صحیح |
| اسنادہٗ صحیح | ہیں۔ |
| ۳- الخلافتہ فی قریش | یعنی حکومت قریش کے پاس |
| والحکم فی الانصار | فیصلے انصار کے پاس اور دعوت |
| والدعوۃ فی الحبشہ | اذان حبشہ والوں کے پاس رہے |
| (بحوالہ مسند احمد بن حنبل) | گی۔[2] |

ایک دوسرے موقع پر سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ

---

[1] شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء مطبوعہ بریلی ۱۸۶۹ء ص ۵

[2] جلال الدین سیوطیؒ، تاریخ الخلفاء مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۶ء، ص ۷

نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

| | |
|---|---|
| ولم یعرف العرب | یعنی عرب اس معاملے میں |
| ھذا الامر الا لھذا | قریش کے قبیلے کے علاوہ اور |
| الحیی من قریش | کسی کو نہیں جانتے۔ یہ عربوں |
| ھم اوسط العرب نسباً | میں اپنے نسب اور سکونت |
| وداراً | کے اعتبار سے مرکزی حیثیت |
| | رکھتے ہیں۔[1] |

طبری نے بھی الفاظ کے معمولی سے تغیر کے ساتھ صدیق اکبرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے[2]

عبداللہ بن مسلم المعروف بہ ابنِ قتیبہ الدینوری (م ۸۹۷ء) لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنو ساعدہ میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا:

| | |
|---|---|
| لا تدین العرب | یعنی عرب قریش کے قبیلے |
| الا لھذا الحیّ من | کے علاوہ اور کسی کی اطاعت |
| قریش۔ | نہیں کریں گے[3] |

اسی طرح امام مسلم بن حجاج نیشاپوریؒ نے بھی شرطِ قریش کے ضمن میں چار حدیثیں نقل کی ہیں، ان احادیث کا لب لباب

---

[1] ایضاً ص ۶۴

[2] ابن جریر طبری، تاریخ الرسل والملوک، مطبوعہ بٹیویا ۱۸۹۰ء ج ۴ ص ۱۸۲۳

[3] ابن قتیبہ، عیون الاخبار، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۲۸ء، ج ۲ ص ۲۳۴

یہ ہے کہ اہلِ عرب خیر و شر میں قریش کی پیروی کریں گے۔ عرب کے غیر مسلم قریش کے غیر مسلموں اور عرب کے مسلمان قریش کے مسلمانوں کے نقشِ قدم پر چلیں گے[1]

تمام محدثین، فقہاء اور سیاسی مفکروں نے ان احادیث کو صحیح اور ان کی اسناد کو معتبر لکھا ہے اس کے باوجود اصحابِ فکر و نظر نے اس شرط قریش پر بڑی بحث کی ہے۔ ابنِ خلدون لکھتے ہیں کہ شرط قریش کو سقیفہ بنو ساعدہ میں صحابہ کرامؓ نے تسلیم کیا ہے لیکن تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ قریش نے اپنی صلاحیت عیش و عشرت اور سستی و کاہلی کی نذر کر دی۔ وہ امور خلافت کی انجام دہی کے قابل نہ رہے اور عجمی ان پر غالب آ گئے۔ ان حالات میں سیاسی مفکروں کو اشتباہ پیدا ہو گیا اور سرے سے قریشیت کی شرط کے ہی منکر ہو گئے[2]

امام ابی بکر محمد بن طیب باقلانیؒ (م ۱۰۱۳ء) کی یہ رائے ہے کہ جس وقت حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط عاید کی تھی اس وقت قریش میں اچھے لوگ موجود تھے۔ اب ویسے نہیں رہے اس لئے اب خلیفہ کے لئے قریشی ہونا ضروری نہیں[3] برصغیر کے نامور عالم مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ بھی امام باقلانیؒ

کے ہمنوا ہو کر فرماتے ہیں کہ کون کہہ سکتا ہے کہ جب خود قریش میں ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسی شخصیتیں موجود ہوں تو پھر وہاں کسی اور کو بھی امامت و خلافت کا استحقاق ہو سکتا ہے[1]۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ قریش میں ہمیشہ ایسی ہی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی؟ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ قریش پر پہلے آل بویہ غالب آ گئے اور پھر سلجوقی مسلط ہو گئے۔ آل بویہ اور سلاجقہ کے عہد میں عباسی خلیفہ کی پوزیشن تقریباً ایسی ہی تھی جیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں لال قلعہ کے اندر کمپنی کے وظیفہ خوار اور بے اختیار مغل بادشاہ کی۔ اگر قریشی حکمران کے پاس اختیار ہی نہ ہوں تو پھر نمائش کے طور پر اس کو مسندِ خلافت پر بٹھانے سے کیا فائدہ؟

اگر خلیفہ کے لئے قریشی ہونا ہی شرط ہے تو پھر اسلام، جو عالمگیر مذہب ہونے کا داعی اور رنگ و نسل کے امتیاز کا مخالف ہے۔ یہودیت کی طرح ایک نسلی اور قبائلی مذہب بن کر رہ جائے گا۔ شرط قریش پر زور دینے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے بنی نوع انسان کے نام اپنے آخری پیام میں یہ فرمایا تھا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سیاہ کو سفید پر اور سفید کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے، قرآن نے بھی رنگ و نسل کی بجائے تقویٰ کو معیار بزرگی قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے:

ان اکرمکم عند     تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ
اللہ اتقٰکم ؕ     معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

---

[1] امام مسلم، الصحیح، مطبوعہ استانبول ۱۳۳۲ھ ج ۶ ص ۲، ۳

[2] سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبرؓ ص ۱۰۳

[3] سید عبدالقادر حسینی، دی کانسٹیٹیوشن آف دی عرب ایمپائر، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۴ء، ص ۴۶، ۴۷

---

[1] سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبر، ص ۱۰۳

حضرت عمر فاروقؓ اس وقت سقیفہ بنو ساعدہ میں موجود تھے جب حضرت ابوبکرؓ صدیق نے الائمۃ من القریش والی حدیث پڑھی تھی۔ اس لیئے ان پر اس حدیث سے ناواقفیت کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ جب ان کا وقت آخر قریب آیا تو حاضرین نے ان سے سوال کیا کہ ان کا جانشین کون ہوگا؟

انہوں نے فرمایا:۔

لو کان ابو عبیدہ حیاً لاستخلفتہ

یعنی اگر ابو عبیدہؓ بن الجراح زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ بنا جاتا آپ نے ذرا توقف کے بعد فرمایا:۔

لو کان سالم مولیٰ ابو حذیفۃ حیاً لاستخلفتہ

یعنی اگر سالم مولیٰ ابو حذیفہؓ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ نامزد کردیتا[1]

حضرت سالمؓ ایرانی النسل اور اصطخر کے رہنے والے تھے اور ان کا شمار ان چار قاریوں میں ہوتا ہے جن سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام اپنے صحابہ کو قرآن سیکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے[2] ایک بار حضورؐ نے ان سے تلاوت سن کر فرمایا تھا:

الحمد للہ الذی جعل
فی امتی مثلک

تمام تعریف اس خدا کے لئے ہے
جس نے میری امت میں تجھ سا شخص پیدا
کیا[3] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

---

۱- ابن الاثیر الکامل فی التاریخ، مطبوعہ لیڈن ۱۸۶۸ء ج ۳ ص ۵۰

۲- ابن عبدالبر، الاستیعاب، مطبوعہ قاہرہ مطبع نہضتہ مصر، ج ۲ ص ۵۶۷/۵۶۸

موصوف نے جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف اس شان سے حصہ لیا کہ مہاجرین کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ جب وہ ختم المرسلینؐ کی نبوت کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے تو صحابہ کرامؓ نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا:

ذھب ربع القرآن

یعنی ایک چوتھائی قرآن ضائع ہوگیا[1]

اگر خلیفہ کے لئے قریشی ہونا ہی شرط ہوتی تو حضرت عمر فاروقؓ ایک عجمی غلام کا نام اپنے جانشین کے طور پر کیوں لیتے؟ حضرت عمر فاروق تو سالمؓ کے کمالات کے اس قدر معترف تھے کہ وہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ[2] السابقون الاولون اصحاب کی موجودگی میں انہیں بھی خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام اہلسنت ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگرد رشید قاضی ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی خلیفہ کے لئے قریشی ہونا کوئی شرط نہیں[3]۔ امام حاکم نیشاپوری نے ہمارے خیال کی تائید میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ایک حدیث نقل کی ہے:

---

۳- (صفحہ گذشتہ سے) الباقلانی، الانصاف، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۰ ص ۷۳

۱- ابن حجر، اصابہ فی تمیز الصحابہ، مطبوعہ کلکتہ ۷۳-۱۸۵۶ء ج ۲، ص ۱۱۰

۲- سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبرؓ، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۱ ص ۱۰۰

۳- مولانا انور شاہ، فیض الباری، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۸ء ج ۴ ص ۴۹۸

| | |
|---|---|
| وعليكم بالطاعة | یعنی، تم پر حبشی غلام کی اطاعت |
| وان عبداً حبشياً عضوا | واجب ہے اور اسے مضبوطی |
| عليها بالنواجذ | سے پکڑو[1] |

خطیب تبریزیؒ نے مشکوٰۃ المصابیح میں امام بخاریؒ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے:

| | |
|---|---|
| عن انس ان رسول | حضرت انسؓ رسول اکرمؐ |
| الله صلى الله عليه وسلم | سے روایت کرتے ہیں کہ اگر |
| قال: اسمعوا واطيعوا | ایسے حبشی کو تمہارا حاکم بنایا |
| وان استعمل عليكم | جائے کہ جس کا سر منقی کی طرح |
| عبدٌ حبشي كان | ہو، تو اس کی بات سنو اور اطاعت |
| رأسه زبيبة | کرو[2] |

حضور علیہ السلام کے ان فرامین کی روشنی میں خلیفہ کے لئے قریشی ہونے کی شرط کہاں باقی رہ جاتی ہے؟

امام بغویؒ (م ۱۱۲۳ء) فرماتے ہیں کہ اگر قریشی میں جملہ صفات موجود نہ ہوں تو پھر عجمی بھی خلیفہ بن سکتا ہے۔ ان کے نزدیک ترک بھی اس منصب جلیلہ کا اہل ہے[3] یہ ایک حقیقت ہے کہ جب سولھویں صدی کے دوسرے عشرے میں سلطان سلیم

عثمانی نے خلافت کا اعلان کیا تو کسی عالم دین نے اس سے یہ نہیں کہا کہ خلیفہ کے لئے قریشی ہونا شرط ہے اور وہ چونکہ ترک ہے اس لئے وہ اس منصبِ جلیلہ کا اہل نہیں۔ عثمانی ترکوں نے چار سو سال تک بارِ خلافت اپنے کندھوں پر اٹھایا اور کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔

دور حاضر کے دانشوروں اور محققوں نے اسلام میں جمہوریت کی روح پیدا کرنے میں خوارج کی خدمات کو سراہا ہے۔ جس وقت سُنّی مفکرین خلیفہ کے لئے قریشی ہونا اور شیعہ مفکرین حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے ہونا شرط قرار دیتے ہیں اس وقت خوارج نے اس اندازِ فکر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انہوں نے برملا کہنا شروع کیا کہ جب قرآن مجید میں عزت و شرافت کا معیار تقویٰ ہے اور حضورؐ نے حبشی غلام کی اطاعت کو بھی واجب قرار دیا ہے تو پھر خلیفہ کے لئے نسل و خاندان کی قید کہاں باقی رہ جاتی ہے؟[1] یہ سچ ہے کہ اسلام نے برہمنوں کی طرح کوئی رعایت یافتہ طبقہ پیدا نہیں کیا اور یہ تو وہ دین ہے جس میں رنگ و نسل اور ملک و قوم کی کوئی تفریق نہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ جیسے بزرگ حضرت بلالؓ حبشی کو یاسیدی بلال کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے جب حضرت عمر فاروقؓ ابولؤلؤ فیروز کے ہاتھوں زخمی ہوئے تو انہوں نے حکم دیا کہ جب تک ان کے جانشین کے بارے میں فیصلہ

---

۱۔ امام حاکم، المستدرک، مطبوعہ حیدرآباد ۲۳ ـ ۱۹۱۷ء ج ۱ ص ۹۶

۲۔ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، مطبوعہ دمشق ۱۹۶۱ ج ۲ ص ۳۱۶

۳۔ فضل اللہ بن روزبہان، سلوک الملوک، مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۶۶ ص ۴۳

---

۱۔ ایڈورڈ گرانول براؤن اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، مطبوعہ کیمبرج ۱۹۳۰ء ج ۱ ص ۲۴۰ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہ ہو جائے حضرت صہیب رومیؓ مسجد نبوی میں نماز پڑھایا کریں[۱]۔ حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف بھی اسی رومی بزرگ کو حاصل ہے۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو امیر لشکر مقرر فرمایا اور اکابر صحابہؓ کو جن میں حضرت عمر فاروقؓ جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں ان کے ماتحت لڑنے کے لئے روانہ فرمایا۔ ان جیتی جاگتی مثالوں کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ غیر قریشی منصب خلافت کا اہل نہیں۔ جن احادیث میں خلیفہ کے لئے قریشی ہونا شرط بتایا گیا ہے ہم ان احادیث کی تردید نہیں کرتے۔

وہ احادیث صحیح ہیں اور ان کی اسناد بھی معتبر ہیں لیکن ان کی توضیح دوسرے انداز سے کرتے ہیں۔

اس مسئلے میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی فرماتے ہیں کہ الائمۃ من قریش کا مطلب کیا ہے؟ یعنی یہ انشا ہے یا خبر؟ اگر یہ خبر ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام اطلاع دے رہے ہیں کہ امت میں جو امام پیدا ہوں گے وہ قریش میں سے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ یہ خبر صحیح نہیں۔ تاریخ اسلام میں وقتاً فوقتاً ایسے خلفاء ضرور پیدا ہوتے رہے ہیں جو اقامت دین کا فرض ادا کرتے تھے اور جملہ شرائط امامت کے جامع تھے لیکن قریشی نہیں تھے۔

اگر یہ انشا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضورؐ حکم دے رہے ہیں کہ جو امام منتخب کیا جائے اس کے لئے قریشی ہونا شرط ہے تو پھر ان

---

(بقیہ حاشیہ) اے ای سیم، پولیٹیکل تھیوری آف دی خوارج، مطبوعہ بالٹی مور ۱۹۵۶ء ص ۶۲

[۱] ابن قتیبہ دینوری، الامامۃ والسیاسۃ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۳۷ ج ۱ ص ۲۵

روایات کا کیا جواب ہوگا جن میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ایک حبشی بھی تمہارا امام ہو تو اس کی اطاعت کرو۔ ایک غیر قریشی کی امامت اگر منعقد ہی نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی اطاعت کا حکم کیسا؟

تاریخ میں ایسا وقت بھی آگیا جب کہ قریشی اقامتِ دین کے قابل نہیں رہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ چونکہ نصب امام پوری امت پر فرض کفایہ ہے اس لئے ایسی صورتحال میں امام کا انتخاب کیوں کر کیا جائے گا؟ جو قریشی ہے وہ اقامت دین سے عاجز ہے اور جو اقامت دین کر سکتا ہے وہ بدقسمتی سے قریشی نہیں ان دونوں میں سے کس کو امام بنایا جائے گا؟ اگر قریشی کو ہی تو پھر— "اقاموا الدین" کا مطلب کیا ہوا؟ اور اگر غیر قریشی ہو تو پھر ظاہر ہے "الائمۃ من قریش" انشاء کے لئے نہیں ہوا اور اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہوتی کہ امام و خلیفہ کے لئے قریشی النسب ہونا ضروری ہے۔

آگے چل کر مولانا اکبر آبادی صاحب فرماتے ہیں کہ اب سوال یہ ہے کہ جب "الائمۃ من قریش" نہ انشا ہے اور نہ خبر تو پھر اس کا مطلب کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جس طرح ہر خاندان کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے اور عام بول چال میں اس خصوصیت کو اس خاندان کے لوگوں میں محدود کر کے بولتے ہیں مثلاً ہم یوں کہیں کہ علماء تو دیوبندیوں یا فرنگی محلیوں میں ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ علماء دیوبند اور فرنگی محلی کے علاوہ اور کہیں پیدا نہیں ہوتے۔ اسی طرح آنحضرت کا منشا یہ ہے کہ امامت کے لئے جن اوصاف و

کمالات کی ضرورت ہے مثلاً تدبیر، شجاعت، شہادت، قیادت کی صلاحیت یہ سب قریش میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اوصاف قریش کے علاوہ کسی خاندان یا قبیلہ کے شخص میں پاتے ہی نہیں جاتے۔ بہر حال مدارِ امامت وہ اوصاف و کمالات ہوئے جو قریش کا طغرائے امتیاز تھے نہ کہ خود قریشی النسب ہونا[1]

## انعقادِ خلافت

اصولِ کلام کی کتابوں میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ اگر کسی شخص میں یہ تمام شرائط موجود ہوں تو وہ خود بخود خلیفہ نہیں بن جائے گا تا آنکہ اس کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت نہ ہو[2] جب کسی امامت کے کئی حقدار ہوں تو جو شخص زیادہ علم و فضل والا اور سب سے زیادہ صفات کا حامل ہوگا اسی کے ہاتھ پر بیعت کی جائیگی[3] اگر لوگ کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں اور اس کے بعد اس سے بہتر شخص مل جائے تو اس سے پہلے شخص کی بیعت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا[4]

اگر کبھی ایسا ہو کہ خلافت کے دو امیدوار موجود ہوں اور دونوں جامع صفات ہوں تو پھر موقع محل کا خیال رکھتے ہوئے ان میں سے

---

۱۔ سعید احمد اکبر آبادی، صدیق اکبر، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۱ء ص ۱۰۰، ۱۰۱

۲۔ فضل اللہ بن روز بہان، سلوک الملوک، مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۶۶ء ص ۴۳

۳۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۸۱ء ص ۶

۴۔ ابو یعلی، احکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۶ء ص ۲۳

کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ مثلاً اگر اس وقت ملک کو جنگ درپیش ہے تو پھر ایسے شخص کو ترجیح دی جائے جو فنِ حرب کا ماہر ہو اور اگر ملک مالی بحران سے گزر رہا ہے تو پھر ایسے شخص کو سربراہ مملکت بنایا جائے جو امورِ مالیات پر دسترس رکھتا ہو۔ اسی طرح اگر دو ایسے امیدوار موجود ہوں جن میں سے ایک عالم لیکن فاسق ہو اور دوسرا جاہل لیکن متقی و پرہیزگار ہو تو پھر عالم فاسق پر جاہل متقی کو ترجیح دی جائے گی[1] ہمارے سیاسی مفکروں نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ جو لوگ نصبِ امام کے ذمہ دار ہیں ان میں بھی گواہ کی جملہ صفات موجود ہونی چاہئیں[2] لوگ کسی ایسے شخص کو جو خلیفہ بننے کا اہل ہو، بیعت لینے پر مجبور نہیں کر سکتے لیکن اگر اس کے سوا اور کوئی شخص جامع صفات نہ ہو تو پھر اسے اس امر پر مجبور بھی کیا جا سکتا ہے[3] جس طرح امت پر نصبِ امام واجب بالکفایہ ہے بعینہٖ جامع شرائط پر بھی واجب ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے ورنہ وہ بھی گناہگار ہوگا۔

ایک وقت میں دو خلیفے نہیں ہو سکتے۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں انصار نے "منا امیر و منکم امیر" کہہ کر مہاجرین اور انصار میں سے ایک ایک خلیفہ مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن شیخین کریمینؓ نے اس تجویز کو فوراً رد کر دیا[4]

---

۱۔ فضل اللہ بن روز بہان سلوک الملوک ص ۴۴

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ابن خلدون، مقدمہ، مطبوعہ بیروت ۱۸۸۶ء ص ۶۹

اگر کبھی دو شخصوں کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے تو جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت ہوگی وہی خلافت کا حقدار ہوگا۔ جس کے ہاتھ پر بعد میں بیعت ہوئی اسے اس فرمان رسالت اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منہما کے مطابق قتل کر دیا جائے[1] فقہا نے اس حدیث کے مطابق اس کے قتل کا فتویٰ دیا ہے کیونکہ اس کے دعوئ خلافت سے ملک میں فتنہ و فساد بپا ہو سکتا ہے جس میں ہزاروں انسان لقمۂ اجل بن سکتے ہیں۔ ابویعلیٰ لکھتے ہیں کہ اگر ایک ہی وقت میں دونوں کی بیعت ہو یا یہ پتہ نہ چل سکے کہ پہلے کس کی بیعت ہوئی ہے تو اس صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے[2]

فقہا کرام نے اس بات کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک وقت میں دو بلکہ کئی کئی پیغمبر ہوئے ہیں تو پھر ایک وقت میں دو خلیفے کیوں نہیں ہو سکتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں اور ان کی نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض نہیں ہوتیں اس لئے ان میں رقابت کا مادہ نہیں ہوتا جو کسی جھگڑے کا باعث بن سکے۔

جب عباسیوں کے دور حکومت میں سپین میں عبدالرحمٰن الناصر نے خلیفہ ہونے کا اعلان کیا تو ہمارے فقہا اور سیاسی مفکر ایک نئی صورتحال سے دوچار ہوئے عباسی خلیفہ میں اتنی قوت کہاں تھی کہ وہ

---

۱۔ خطیب تبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، مطبوعہ دمشق ۱۹۶۱ء ج ۲ ص ۳۱۹

۲۔ ابویعلیٰ، الاحکام السلطانیہ ص ۲۵

سپین پر فوج کشی کر کے عبدالرحمٰن الناصر کی خلافت کا خاتمہ کر دیتا۔ اس لئے اس صورتحال سے نپٹنے کے لئے ہمارے فقہا نے کہا کہ اگر ایک ہی وقت میں دنیائے اسلام میں دو خلیفے موجود ہوں اور ان کے درمیان سمندر یا دارالحرب حائل ہو جو براہ راست تصادم کو روک سکے تو پھر ایک وقت میں دو خلیفے بھی ہو سکتے ہیں[1]

خلافت کا مسئلہ چونکہ انقطاع وحی اور حضورؐ کی رحلت کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے نصب امام کے بارے میں قرآن اور حدیث خاموش ہیں۔ ابویعلیٰ لکھتا ہے کہ انعقاد خلافت کے دو ہی طریقے ہیں: اول یہ کہ برسر اقتدار خلیفہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دے ثانیاً یہ کہ اہل حل و عقد کسی کو خلیفہ بنا دیں[2]

## طریقِ انتخاب

ہمارے سیاسی مفکروں نے نصب امام کے تین طریقے بتائے ہیں جن کے مطابق خلفائے راشدین کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ ان تینوں طریقوں میں سے موقع محل دیکھ کر جس طریقے پر بھی عمل کر لیا جائے وہی طریقہ صحیح اور شریعت کے عین مطابق ہوگا۔

پہلی مثال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب کی ہے ان کا انتخاب مجمع عام میں ہوا تھا اور ان کی خلافت پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اس

---

۱۔ فضل اللہ بن روزبہان، سلوک الملوک ص ۴۴

۲۔ ابویعلیٰ، احکام السلطانیہ ص ۲۳

طریقے کو موجودہ اصطلاح میں عام انتخابات (General Election) کہہ سکتے ہیں۔

دوسری مثال حضرت عمرؓ کے تقرر کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے قبل اکابر صحابہ سے مشورہ کر کے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اس لئے اگر حالات عام انتخابات کی اجازت نہ دیں تو نامزدگی بھی ہو سکتی ہے۔ امام ماوردی نے نامزدگی کے اصول کو بھی نصبِ امام کا صحیح طریقہ تسلیم کیا ہے۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ جس طرح شارع علیہ السلام نے جنگ موتہ کے موقع پر زید بن حارثہؓ، عبداللہؓ بن رواحہؓ اور جعفرؓ بن ابی طالب کو بالترتیب ایک دوسرے کا جانشین مقرر فرمایا تھا۔ بعینہٖ ایک امام بھی اپنے بعد ایک چھوڑ بالترتیب دو تین جانشین نامزد کر سکتا ہے[1] (اموی اور عباسی دور میں اسی طریق پر عمل ہوتا رہا ہے)

فضل اللہ بن روزبہانؒ نے الماوردی کے استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں صرف اس قدر اضافہ کیا ہے کہ اگر کسی شخص میں جملہ شرائط امامت موجود ہوں اور مرنے والا خلیفہ اسے اپنا جانشین نامزد کر دے تو جائز ہے لیکن بغیر شرائط کے جائز نہیں[2]۔

ہمارے سامنے تیسری مثال حضرت عثمان غنیؓ کے تقرر کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے قبل حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی اور اپنے جانشین کا معاملہ ان پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے کافی سوچ بچار اور باہمی صلاح مشورے سے کتاب، سنت اور شیخین کریمینؓ کی پیروی کی شرط پر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی[1] اسے موجودہ اصطلاح میں انتخابی ادارہ (Electoral College) کہتے ہیں۔ اس صورت میں ووٹ کا حق ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا، صرف چند افراد کو ہوتا ہے ان افراد کو سیاسی مفکر اہل "حل وعقد" کہتے ہیں، موجودہ دور میں کابینہ کے وزراء یا قومی اسمبلی کے ارکان کو اہل حل وعقد کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ان تین میں سے کسی ایک طریقے کے مطابق خلیفہ کا تقرر عمل میں آ سکتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد جب صوبائی گورنروں نے نیم خود مختار حکومتیں قائم کر لیں اور وہ اپنی فوجی قوت کے بل برتے پر مسند اقتدار پر قابض ہو گئے تو فقہا اور سیاسی مفکرین ایک نئی صورتحال سے دوچار ہوئے۔ ان حالات میں انہوں نے یہ کہا کہ اگر کوئی شخص اپنی قوت کے بل پر اقتدار پر قابض ہو جائے اور عوام میں اسے اقتدار سے الگ کرنے کی ہمت نہ ہو تو پھر اس کی حکومت بھی جائز ہو گی۔ لیکن ایسی حرکت کا مرتکب گناہگار ہو گا[2] پاکستان کی سپریم کورٹ نے "ضرورت کے نظریئے" کے تحت اس طرح بر

---

[1] الماوردی، احکام السلطانیہ، مطبوعہ قاہرہ ۱۸۸۱ء ص ۱۲

[2] فضل اللہ بن روزبہان، سلوک الملوک، ص ۴۵

---

[1] ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ لیڈن ۱۸۶۸ ج ۳ ص ۵۵

[2] فضل اللہ بن روزبہان، سلوک والملوک ص (۴۷)

سر اقتدار آنے والے شخص کی حکومت کو "قانونی حکومت" تسلیم کیا ہے۔

جب کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے تو پھر کسی ایسے شخص کو جس نے اس کے تقرر کی مخالفت کی ہو اپنی رائے پر اڑے رہنے کی اجازت نہیں۔ جب کوئی شخص امام مقرر ہو جائے تو پھر سب پر اس کی اطاعت اور نصرت واجب ہو گی[1]

## خلیفہ کے فرائض

جب کوئی شخص خلیفہ مقرر ہو جائے تو اس کے لئے مندرجہ ذیل دس امور کی انجام دہی فرض ہو جائیگی:

۱۔ حفاظتِ دین

۲۔ تنفیذِ احکامِ شریعت

۳۔ حفاظتِ ملک

۴۔ اقامتِ حدود

۵۔ حفاظتِ سرحدات

۶۔ جہاد کی تیاری

۷۔ وصولی زکوٰۃ و دوسرے واجبات

۸۔ مستحقین کی بیت المال سے اعانت

۹۔ دیانتدار افسروں کا تقرر

۱۰۔ تمام امورِ حکومت کی ذاتی طور پر نگرانی[2]

---

[1] ۱۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، ص ۱۶ (۲) ایضاً ص ۵۵، ۵۶

قرآن مجید میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ قیام خلافت کا مقصد ہی قیام عدل ہے ارشاد باری ہے:۔

یٰداود انا جعلنٰک خلیفۃً فی الارض فاحکم بین النّاس بالحق[1]

اس لئے عدل و انصاف قائم کرنا خلیفہ کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ امام ابن تیمیہ رح ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس میں رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے[2]

شریعت کی حمایت اور اسلامی شعائر کی حفاظت خلیفہ کے فرائض میں شامل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب انہیں حکومت ملتی ہے تو وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ وصول کرتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند ہوتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:۔

الّذین انّ مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزّکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر[3]

احکام شریعت کا نفاذ اور اقامتِ حدود بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ وہ بیت المال کا امین ہوتا ہے اس لئے اسے سوچ سمجھ کر

---

۱۔ قرآن مجید سورۃ ص آیت ۲۶

۲۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار ص ۱۷۲

۳۔ قرآن مجید سورۃ الحج آیت ۴۱

بیت المال کی رقم خرچ کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے "خداوندِ کفایت" ہونا ضروری ہے[1] اسے عمر فاروق رض کا یہ قول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے:۔

الدوانی انزلت نفسی من المال بمنزلۃ والی الیتیم[2]

یعنی جہاں تک بیت المال کا تعلق ہے میرا معاملہ اس کے ساتھ یتیم کے والی جیسا ہے۔

امام ابن تیمیہ رح لکھتے ہیں کہ حکومت ایک امانت ہے اس کے لئے خلیفہ کو بڑی دیانتداری سے اسے چلانا چاہیئے۔ امام صاحب مستدرک کے حوالے سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں اگر وہ باصلاحیت لوگوں کو چھوڑ کر نااہل لوگوں کو عہدے عطا کرتا ہے تو وہ خدا، رسول ص اور مسلمانوں سے خیانت کرتا ہے[3]

ہمارے سیاسی مفکروں نے خلیفہ کو اپنے مشیروں سے مشورہ کرنے کا پابند کیا ہے۔ اس ضمن میں نظام الملک طوسی لکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے "شاورھم فی الامر" کے تحت اپنے رسول ص کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کا پابند کیا ہے حالانکہ پیغمبر سے زیادہ قوی کوئی نہیں ہو سکتا تو خلفا اور بادشاہوں کے لئے اہم امور میں مشورہ کرنا بے حد ضروری ہے[4]

---

۱۔ فضل اللہ بن روزبہان، سلوک الملوک ص ۴۲

۲۔ ابن قتیبہ دینوری عیون الاخبار مطبوعہ ۱۹۲۸ء ج ۲ ص ۲۳۴.۵

۳۔ رشید احمد "مسلمانوں کے سیاسی افکار" ص ۱۷۰

۴۔ نظام الملک طوسی، سیاست نامہ، مطبوعہ ۱۸۹۱ ص ۸۵

# اورنگ زیب رح کی تخت نشینی میں علماء و مشائخ کا کردار

شاہ جہان کی تخت نشینی کے لئے اس کے بیٹوں میں جنگ ناگزیر تھی اس لئے وہ حصولِ تخت کے لئے علماء اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ تخت نشینی کے لئے جنگ اورنگ زیب رح اور دارا شکوہ کے درمیان نہ تھی بلکہ اصل معرکہ راسخ العقیدہ اور آزاد خیال مسلمانوں، شریعت اور آزاد تصوف، وحدت الشہود اور وحدت الوجود، پابند شریعت نقشبندیوں اور حضرت مجدد الف ثانی رح اور بروے رام کے نظریات کے درمیان تھا۔ اگر اورنگ زیب رح اول الذکر گروہوں کا نمائندہ تھا تو دارا شکوہ موخر الذکر گروہوں کا علمبردار تھا۔ ساموگڑھ کی جنگ حصولِ تخت کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے آئندہ شاہنشاہ کی مذہبی حکمتِ عملی کا فیصلہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔

اورنگ زیب کے سوانح نگار ظہیر الدین فاروقی کے خیال میں ہندو اکبر جیسا بادشاہ تخت پر دیکھنا چاہتے تھے اور مسلمان اس کوشش میں تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ایسے حالات سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔[1]

---

[1] فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء، ص ۲۸

اس لئے فطری طور پر ہندوؤں نے داراشکوہ کی حمایت کی اور راسخ العقیدہ مسلمانوں نے اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا، کیونکہ وہ راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھا۔[52] مشہور مستشرق لین پول رقمطراز ہے کہ اسلام کی خدمت کے لئے اورنگ زیبؒ بڑا متشدد اور سخت گیر نظر آتا ہے۔ اس نے بڑی سختی اور جرأت کے ساتھ اگر ایک طرف اکبر اور داراشکوہ کے وحدت الوجودی نظریات کے خلاف ردِ عمل شروع کیا تو دوسری طرف جہانگیر کی "نائو نوش" اور شاہجہان کی "عیش کوشی" پالیسی کے خلاف جنگ لڑی۔[53]

جب داراشکوہ کے کفر و الحاد کی خبریں عوام کے کانوں تک پہنچیں تو قدرتی طور پر اس کا فائدہ اورنگ زیبؒ کو پہنچا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ داراشکوہ میں ایسے آثار نظر آتے تھے کہ وہ بڑھ کر دوسرا اکبر ثابت ہوگا۔ اسے ولی عہد سلطنت سمجھا جاتا تھا اور امورِ سلطنت میں اسے اتنا دخل تھا کہ راسخ العقیدہ گروہ کی کوششیں اکثر اس کی وجہ سے کالعدم ہوجاتی تھیں۔ اس لئے وہ لوگ جو راسخ الاعتقادی کے مخالف تھے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرسکتے تھے اور یہ امید بھی کرسکتے تھے کہ آئندہ کسی زمانے میں حکومت پر ان کا اقتدار قائم ہوجائے گا۔ راسخ الاعتقاد طبقے کی امیدیں اورنگ زیبؒ پر مرکوز تھیں جو اپنے عقائد و اعمال میں نہ صرف راسخ الاعتقاد تھا بلکہ زاہد و متقی بھی تھا۔ اس کی پارسائی اور اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں

---

[52] لین پول، اسٹینلے، اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا ان دی میڈیول ایجز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۱۷ء، ص ۱۱۱

[53] ایضاً۔

موجود تھیں جو راسخ الاعتقادی کے خیرخواہوں کو اس کے گرد جمع کرنے کے لئے ضروری ہوسکتی تھیں۔[54] شاہجہان کے وزیراعظم نواب سعداللہ خان نے بھی اورنگ زیبؒ کی حمایت پر کمر باندھی اور متعدد بار اس نے بھرے دربار میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی اور اسی وجہ سے اس نے داراشکوہ کی ناراضگی مول لی۔ جب نواب موصوف نے اچانک وفات پائی تو بعض لوگوں نے داراشکوہ پر زہر خورانی کا الزام بھی لگایا۔ شاہجہان کے راسخ العقیدہ درباری امراء نے بھی داراشکوہ کے مقابلہ میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی۔[55]

اورنگ زیبؒ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کا بڑا معتقد تھا۔[56] ان کے علاوہ وہ ان کے بھائیوں اور بیٹوں کا بھی بڑا لحاظ کرتا تھا۔ اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے فوراً بعد خواجہ محمد معصومؒ اور ان کے برادر بزرگ حضرت محمد سعیدؒ شاہی دربار میں باریاب ہوئے، اورنگ زیبؒ نے اس موقع پر تین سو طلائی مہریں پیش کیں۔[57] اس کے بعد بھی اورنگ زیبؒ نے متعدد موقعوں پر خواجہ صاحبؒ کو اپنے دربار میں بلایا اور ہر بار ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ پیش آیا۔[58] ان کے صاحبزادوں کی بھی

---

[54] قریشی، اشتیاق حسین، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

[55] فاروقی، اورنگ زیبؒ اینڈ ہز ٹائمز، ص ۶

[56] (i) یوسف حسین، گلمپسز آف میڈیول انڈین کلچر، مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۷ء، ص ۵۹

(ii) مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، مطبوعہ کانپور ۱۹۰۲ء، ص ۶۴۰

[57] (i) ابوالفتح، آداب عالمگیری، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۳۱۷، ورق ۴۳۱ ب

(ii) محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء، ص ۲۹۳

[58] محمد بقا، مرآت العالم، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۱۲۴، ورق ۵۴۶ ب

شاہی دربار میں بڑی عزت کی جاتی تھی[۹]۔ مرأت العالم کے مصنف کے بیان کے مطابق اورنگ زیبؒ نے اپنے چوتھے سال جلوس میں حضرت محمد سعیدؒ کو شاہی دربار میں بلایا اور ان کی بڑی تکریم کی[۱۰]۔ ان کی باریابی کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ عبدالاحدؒ اور شیخ محمد فرخ اورنگ زیبؒ سے ملے اور رخصت کے وقت بادشاہ نے ان کی خدمت میں بڑے تحائف پیش کئے[۱۱]۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے شیخ محمد یحییٰؒ سے بھی اورنگ زیبؒ کی اکثر ملاقات رہتی تھی اور ہمیشہ انہیں نقد اور تحائف دیا کرتا تھا[۱۲]۔

اورنگ زیبؒ دہلی سے لاہور جاتے اور واپس آتے وقت سرہند میں خواجہ محمد معصومؒ اور خاندانِ مجددؒ کے دیگر افراد سے ملا کرتا تھا۔ عہدِ عالمگیر کے ایک ہندو مؤرخ ایشرداس نے اورنگ زیبؒ کے اٹھارویں سال جلوس کے واقعات میں خانقاہ مجددیہ کے قریب نولکھا باغ میں بادشاہ کے قیام کا ذکر کیا ہے[۱۳]۔ اورنگ زیبؒ نے خواجہ محمد معصومؒ سے متعدد بار استدعا کی کہ وہ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہا کریں، لیکن انہوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی نصیحت کے مطابق بادشاہ کے ساتھ رہنا پسند نہیں فرمایا[۱۴]۔ آپ نے اپنی جگہ اپنے فرزندِ ارجمند حضرت سیف الدینؒ کو دہلی بھیج دیا جہاں وہ بقول محمد ساقی مستعد خان قلعہ کے اندر شاہی محل کے

---

[۹] ایضاً، [۱۰] ایضاً، [۱۱] ایضاً، [۱۲] ایضاً۔ [۱۳] ایشرداس۔ فتوحات عالمگیری، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، ایڈیشنل ۲۳۸۸۴، ورق ۷۲ الف۔

[۱۴] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اول، ص ۶۴۰

۱۱ محمد مراد، مناقب الحضرات، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، ایتھے ۶۵۲، ورق ۱۴۸ الف۔

جوار میں رہنے لگے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بادشاہ کاروبار سلطنت سے فارغ ہو کر رات گئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا[۱۵]۔ مآثر عالمگیری میں ایسی ہی ایک صحبت کی تفصیل درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیبؒ حضرت سیف الدینؒ سے توجہ لینے کے علاوہ ان کی نگرانی میں منازل سلوک بھی طے کیا کرتا تھا[۱۶]۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ نے سلوک کی کئی منازل طے کر لیں۔ حضرت سیف الدینؒ نے اپنے والد مکرم کے نام ایک خط میں بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

> بادشاہ دین پناہ را در خدمتِ حضرت اخلاص متنوع دیگر است از ذکر لطائف و ذکر سلطانی گذشتہ بہ ذکر نفی و اثبات مقید است و ظاہر می سازد کہ بعضے اوقات خطرہ مطلقاً نمی آید و اگاہے کہ می آید استقرار نمی کند۔ ازیں راہ خیلے محفوظ است و می گوید کہ پیش ازیں من از ہجوم خواطر دل تنگ بودم، و شکر ایں نعمت بجا می آرد[۱۷]۔

حضرت سیف الدینؒ کے خط کے جواب میں خواجہ محمد معصومؒ نے جو خط تحریر فرمایا تھا وہ ان کے مکتوبات میں موجود ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے اپنے مکتوب میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔ جس نے بادشاہ کو روحانی

---

[۱۵] محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۰ء، ص ۸۴،

[۱۶] ایضاً۔

[۱۷] مکتوباتِ سیفیہ، مطبوعہ سعید آرٹ پریس حیدر آباد، مکتوب نمبر ۲، ص ۱۱۔

مراتب عطا فرمائے ہیں۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو — فنا قلبی — کا مقام حاصل ہو چکا تھا، جو ولایت میں ایک اعلیٰ مقام سمجھا جاتا ہے۔[۱۸]

اورنگ زیبؒ نے اپنے بارہویں سال جلوس میں اپنے بیٹے محمد اعظم کی شادی کی تو اس تقریب میں جو علماء و مشائخ موجود تھے ان میں حضرت سیف الدینؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔[۱۹] اورنگ زیبؒ کے دل میں حضرت سیف الدینؒ کے برادرِ بزرگ اور خواجہ محمد معصومؒ کے جانشین خواجہ محمد نقشبندؒ کی بڑی عزت تھی۔ ۱۰۹۰ھ میں آپ بادشاہ کے ساتھ موجود تھے۔[۲۰] خواجہ محمد نقشبندؒ کے مکتوبات وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول کے نام سے پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی سعی و کاوش سے دو جلدوں میں ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں خواجہ موصوفؒ کے کئی خطوط بادشاہ کے نام موجود ہیں۔ جن سے ان کے باہمی تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۰۹۹ھ میں اورنگ زیبؒ کے حکم سے خواجہؒ موصوف کے صاحبزادے محمد عمرؒ کی شادی ابوالحسن تانا شاہ کی بیٹی کیساتھ ہوئی۔[۲۱] اگر روضۃ القیومیہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ خواجہ محمد معصومؒ کے صاحبزادے حضرت محمد اشرفؒ اور بھتیجے

---

[۱۸] مکتوبات خواجہ محمد معصوم، (اردو ترجمہ) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء، مکتوب ۲۲۰، ص ۲۸۱-۲۸۰ [۱۹] محمد ساقی مستعد خان، مآثر عالمگیری، ۷۸۔

[۲۰] ایضاً، ص ۲۷۶

[۲۱] ایضاً، ص ۳۱۲

شیخ سعد الدینؒ اورنگ زیبؒ کے زمانۂ شہزادگی میں اس کے ساتھ دکن میں مقیم تھے[۲۲] اور جب اورنگ زیبؒ دارا شکوہ کے مقابلہ پر نکلا تو شیخ محمد اشرفؒ اس کی فوج میں موجود تھے۔[۲۳]

حضرت سیف الدینؒ نے بادشاہ کے ساتھ رہ کر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لئے بڑا کام کیا۔ موصوف کے خطوط کا مجموعہ مکتوبات سیفیہ کے نام سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی محنت اور کوشش سے حیدرآباد سے طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں بادشاہ کے نام حضرت سیف الدینؒ کے دو درجن کے قریب مکتوبات موجود ہیں جن میں بادشاہ کی توجہ رفع بدعت اور احیائے سنت کی طرف مبذول کرائی گئی ہے۔ موصوف کی انہی خدمات کی بنا پر نقشبندی حلقوں میں آپ کو محی السنت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔[۲۴] میری ناقص رائے میں یہ خاندانِ مجددؒ ہی تھا جس نے اورنگ زیبؒ کو محی الدین بنایا۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد ان کے تیسرے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ ان کے جانشین ہوئے۔ آپ اپنی علمیت، تقویٰ اور پرہیزگاری کی وجہ سے عوام میں بے حد مقبول تھے۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی عمر بھر ترویج شریعت اور احیائے سنت کے لئے

---

[۲۲] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم، مطبوعہ لاہور ۱۳۳۵ھ، ص ۱۰۷

[۲۳] ایضاً [۲۴] i. وکیل احمد، ہدیۂ مجددیہ، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ، ص ۳۳۲

ii. مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۶

iii. سید امام الدین، برکاتِ اولیاء، مطبوعہ دہلی ۱۳۲۲ھ، ص ۱۳۲

کوشاں رہے۔ آپ کی اپنے مریدوں کو ہمیشہ یہی نصیحت ہوا کرتی تھی کہ وہ حتی الوسع سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں۔[۲۵] اپنے ایک مکتوب میں آپ اپنے ایک مخلص مرید مولانا محمد حنیفؒ کے نام تحریر فرماتے ہیں کہ ایک صوفی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کئے بغیر اپنے مقصود تک پہنچے۔[۲۶] اسی طرح آپ اپنے ایک دوسرے مرید محمد صدیقؒ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے اُسے قیامت کے دن سو شہیدوں کا ثواب دیا جائے گا۔[۲۷] حضرت مجددؒ صاحب کی طرح خواجہ محمد معصومؒ نے بھی اپنے مکتوبات میں ترویجِ شریعت اور احیائے سنت پر بہت زور دیا ہے۔

جب دارا شکوہ نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے اپنی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے ترجمہ اور نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھانے کے علاوہ اس نے ہندوؤں کے کئی عقائد بھی اپنا لئے تو مذہبی طبقوں میں اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تحریر فرماتے ہیں کہ دارا شکوہ کے تخت نشین ہونے کی صورت میں راسخ الاعتقاد گروہ کے لئے بہت خطرات درپیش تھے، کیونکہ اکبر کے آخری زمانے کے بعد سے اس گروہ کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ سب ملیامیٹ ہو جاتی دارا شکوہ ہندو مت اور اسلام کے بالکل ایک ہونے پر پکا عقیدہ رکھتا تھا اور اس نے

---

[۲۵] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۸۸۶ء، مکاتیب نمبر ۲۳، ۹۰، ۱۸۹، ۱۰۰، ۱۸۰، ۲۲۰

[۲۶] ایضاً، مکتوب نمبر ۲۲ / [۲۷] ایضاً۔ مکتوب نمبر ۲۲۸

اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ اگر دارا شکوہ بادشاہ ہو جاتا تو اس میں اور اکبر میں خاص فرق یہ ہوتا کہ اکبر کا دماغ تو رسمی تعلیم کے ذریعے تربیت یافتہ نہیں تھا اور دارا شکوہ ایک اعلیٰ و فائق فاضل تھا اس طرح وہ راسخ الاعتقادی کے معتقدات کو اور زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہمارے خیال میں، اس موقع پر راسخ الاعتقاد مسلمان دارا شکوہ کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھنے لگے۔ انہی ایّام میں خواجہ محمد معصومؒ اپنے ایک مرید حسن علیؒ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "برادرِ عزیز! آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان دنوں بدعات عام ہوتی جا رہی ہیں اور سنت پس پشت ڈالی جا رہی ہے۔ اس تاریک زمانے میں فوری اور اہم ترین کام، علومِ شریعت کی تحصیل اور ان کی نشر و اشاعت ہے۔ اسی طرح ترویجِ شریعت اور احیائے سنتِ نبویؐ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کو چاہیے کہ آپ علومِ شریعت کی نشر و اشاعت اور احیائے سنت کے لئے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں۔"[۲۹] اسی طرح اپنے ایک مکتوب میں آپ مولانا جمال الدین کو نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ پوری تندہی سے ترویجِ شریعت اور احیائے سنت کے لئے کام کریں۔[۳۰]

اِن امثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ ترویجِ شریعت اور احیائے سنت کے لئے کس قدر کوشاں رہتے تھے۔

---

[۲۸] برِ عظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۲۰۵

[۲۹] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مطبوعہ کانپور ۱۸۸۶ء، مکتوب نمبر ۱۰۰،

[۳۰] ایضاً، مکتوب نمبر ۱۰۰۔

مفتی غلام سرور لاہوری کے قول کے مطابق آپ کے سات ہزار کے قریب خلفا اور نو لاکھ کے قریب مرید سلطنت مغلیہ کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے جو اپنے اپنے دائرۂ اثر میں اپنے پیر و مرشد کے مشن کی تکمیل میں دل و جان سے لگے رہتے تھے۔[31] خواجہ محمد اعظم دیدہ مریؒ کی روایت کے مطابق عالمگیری فوج میں بھی آپ کے خلفا موجود تھے۔[32] مناقب الحضرات کی روایت کے مطابق سینکڑوں کی تعداد میں خواتین اور امرا آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے جو گاہ گاہے آپ سے ملتے رہتے تھے۔[33] علاوہ ازیں علما اور طلبا کا ایک جمِ غفیر ہر اوقات آپ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔[34]

معتبر روایت کے مطابق خواجہ محمد معصوم کے نو لاکھ کے قریب مرید تھے جن میں سے سات ہزار کو خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا۔[35] شیخ محمد بقا رقمطراز ہیں کہ عہد جہانگیر میں ملک کے طول و عرض میں آپ کے بے شمار مرید پھیلے ہوئے تھے۔[36] مغلیہ حکومت کے دائرہ اختیار سے باہر بھی آپ کے مریدوں کی کافی بڑی تعداد آباد تھی۔ جب آپ حج بیت اللہ کے لیے

---

[31] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

[32] تاریخ کشمیر اعظمی، مطبوعہ مری نگر ۱۸۸۶ء، ص ۱۶۳

[33] محمد مراد، مناقب الحضرات، ([illegible]) ورق ۱۷۸ الف

[34] ایضاً۔

[35] رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۹۱ء، ص ۲۱۲

[36] شیخ محمد بقا، مرآۃ العالم، ورق ۵۲۵ ب۔

حجاز تشریف لے گئے تو وہاں بے شمار لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔[37] علاوہ ازیں آپ نے محمد صدیق بخاریؒ کو خرقۂ خلافت دے کر حرمین شریفین میں سلسلۂ عالیہ کی ترویج کے لیے بھیجا تھا۔[38]

خواجہ محمد معصومؒ اور شیخ آدم بنوریؒ کے مریدوں کی اس قدر تعداد باعث تعجب نہیں، صرف اتنی سی بات ذہن میں رکھنی کافی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات عام ہو رہی تھیں اور ان کا سلسلہ اندرون اور بیرونِ ملک آکاس بیل کی طرح پھیل رہا تھا۔ جن ایام میں ہندوستان کا شاہنشاہ اپنے دار الحکومت میں تخت طاؤس پر بیٹھ کر وسطِ ایشیاء پر اپنا تسلط قائم رکھنے میں ناکام رہا، سرہند اور بنوڑ کے بوریہ نشین فقیر وسطِ ایشیاء کے باشندوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ خواجہ محمد معصومؒ سرہندی اور شیخ آدم بنوریؒ کے خلفاء کی فہرستیں دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے جن میں اکثر و بیشتر نام ماوراء النہر والوں کے ہیں۔

اورنگ زیبؒ اپنے عنفوانِ شباب ہی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر ہو چکا تھا اور اس نے ان کے جانشین خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ زمانہ شہزادگی میں اس کی خط و کتابت اکثر خواجہ صاحبؒ سے رہتی تھی۔ خواجہ صاحبؒ کے مکتوبات میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو "شاہزادۂ دین پناہ" کے نام لکھے گئے تھے۔[39] جب خواجہ صاحب حج بیت اللہ کے ارادہ سے [illegible]

---

[37] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

[38] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (اردو) مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۰ء، مکتوب نمبر ۶۴، ص ۲۲۷۔

[39] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی) مکتوب ۶۴، ص ۱۱۳

روانہ ہوئے تو اورنگ زیبؒ ان دنوں دکن میں مقیم تھا۔ اس نے اس موقعہ پر آپ کی ملاقات کو غنیمت جانا اور نربدا عبور کر کے آپ سے ملنے آیا اور آپ کی دعائیں حاصل کیں[۱۴۰]۔ مفتی غلام سرور لاہوری کی روایت کے مطابق آپ نے مدینہ منورہ میں روضہ رسولؐ پر اورنگ زیب کی کامیابی کے لئے دُعا کی تھی[۱۴۱]۔

"شہزادہ دین پناہ" کے نام ایک مکتوب میں خواجہ صاحبؒ اُسے جہاد شروع کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں ایک گھڑی کا جہاد حرم مکہ میں حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے[۱۴۲]۔

جب اورنگ زیبؒ برہانپور سے فوج لیکر نکلا تو خواجہ صاحب نے اُسے ایک خط ارسال کیا جس میں اُسے دار الحکومت پر فوج کشی پر تحسین پیش کی، اسی مکتوب میں آپ اُسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد دلاتے ہیں جس میں اُنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدوں کو اجرِ عظیم کی بشارت دی ہے[۱۴۳]۔ اس مکتوب سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیبؒ کی یلغار کو محض تخت نشینی کے لئے شاہزادوں کی جنگ نہیں بلکہ جہاد سمجھتے تھے۔

---

[۱۴۰] کمال الدین محمد احسان، روضۃ القیومیہ، رکن دوم، ص ۱۰۷

[۱۴۱] خزینۃ الاصفیاء، جلد اوّل، ص ۶۴۰

[۱۴۲] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (فارسی)، مکتوب نمبر ۶۴، ص ۱۱۳

[۱۴۳]

سطورِ بالا سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دارا شکوہ کے خلاف فوج کشی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خاندان اور ان کے عقیدتمندوں کی ہمدردیاں اورنگ زیبؒ کے ساتھ تھیں۔

دارا شکوہ جسے اورنگ زیبؒ رئیس الملاحدہ، ملحدِ نامقبول اور ملحد نکوہیدہ خصال کہا کرتا تھا[۱۴۴]، کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اورنگ زیبؒ نے ایک ماہ برہانپور میں فوجی تیاریوں میں بسر کیا[۱۴۵]۔ یہ شہر ان دنوں مغلیہ سلطنت کے آباد ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا اور عوام اُسے دار السرور کہا کرتے تھے[۱۴۶]۔ یہ شہر نقشبندیوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے خلیفۂ اوّل میر محمد نعمانؒ کو نقشبندیہ سلسلہ کی ترویج کے لئے برہانپور بھیجا تھا[۱۴۷]۔ میر صاحبؒ ترک سکونت کر کے اکبرآباد چلے گئے تو ان کی جگہ حضرت مجددؒ نے خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کو برہانپور بھیجا[۱۴۸]۔ خواجہ موصوف کے "شہزادہ ہائے عالی مرتبہ" کے ساتھ بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور ان کی فرمائش پر آپ نے متعدد غزلیں کہی تھیں جو ان کے دیوان میں موجود ہیں[۱۴۹]۔ مجدد الف ثانیؒ کے بعد یہ شہر خواجہ محمد معصومؒ

---

[۱۴۴] عنایت خان، عنایت نامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۴۱۰۔ ورق ۲۶ الف تا ۲۷ الف

[۱۴۵] محمد کاظم، عالمگیر نامہ، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۴۰۸۔

[۱۴۶] ہمیشہ بہار، نسخہ موزہ شاہی، قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۲۳، ورق ۶ الف تا ب۔

[۱۴۷] محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۹۔

[۱۴۸] ماہنامہ المعارف لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۶۸ء ملاحظہ ہو راقم السطور کا مضمون بعنوان: خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ۔

[۱۴۹] این چند غزل را کہ در اول بیت تا حرفِ آخر است در ردیف مشکل باشارہ شاہزادہ ہائے عالی مرتبہ مدظلہم نظم نمودہ اند۔ دیوان خواجہ محمد ہاشم کشمی، مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری لندن، مائیکرو فیلم [illegible]۔

کی توجہ کا بھی مرکز رہا اور آپ نے اپنے متعدد خلفا کو عوام کی رشد و ہدایت کے لئے برہانپور روانہ کیا۔ ان خلفاء میں سے ابوالمظفر صوفیؒ نے بڑا نام پایا۔ سید امام دین کے قول کے مطابق صوفی صاحبؒ برہانپور کے عوام میں بہت مقبول ہوئے اور بے شمار لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔[۵۰] نقشبندیوں کے علاوہ دیگر سلاسل کے جو بزرگ برہانپور میں رہائش پذیر تھے انھوں نے بھی اورنگ زیبؒ کی حمایت کا اعلان کیا۔[۵۱]

اورنگ زیبؒ کی تعلیم و تربیت اس دور کے بڑے جید اور دیندار علماؒ کی نگرانی میں ہوئی تھی اور وہ سب کے سب اپنے علم و تقویٰ کی بنا پر عوام میں بے حد مقبول تھے اور فطری طور پر انھوں نے دارا شکوہ جیسے "رئیس الملاحدہ، ملحد نامقبول اور ملحد نکوہیدہ فعال" کے خلاف اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا تھا۔ منوچی لکھتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کا ایک استاد شیخ میرک خوافی ۱۶۵۹ء میں اجمیر کے قریب دارا شکوہ کے خلاف لڑتا ہوا میدانِ کارزار میں کام آیا۔[۵۲]

شیخ آدم بنوریؒ نے اپنی وفات سے کافی عرصہ پہلے اپنے مریدوں کو اورنگ زیبؒ کی حمایت کرنے کی نصیحت فرمائی تھی۔[۵۳] شاہ نعمت اللہ ولیؒ کے اخلاف میں سے خلیل اللہ خان نے اپنے ساتھیوں سمیت جنگ تخت نشینی

---

[۵۰] امام الدین، برکاتِ اولیا، مطبوعہ دہلی ۱۳۲۲ھ، ص ۱۳۸

[۵۱] یوسف حسین، گلمپسز آف دی میڈیول انڈین کلچر، ص ۶۰ - ۵۹۔

[۵۲] منوچی، اسٹوریا ڈو موگر، مطبوعہ لندن ۱۹۰۷ء، ص ۲۳۰

[۵۳] محمد مراد، مناقب الحضرات، ورق ۲۰۲ الف

میں اورنگ زیبؒ کی حمایت کی۔[۵۴] قصور کے افغانوں نے شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ شیخ عبدالخالقؒ کی خدمت میں استدعا کی کہ وہ اورنگ زیبؒ کی کامیابی کے لئے دعا فرمائیں۔[۵۵] ان امثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس جنگ میں نقشبندیوں کا عام رجحان اورنگ زیبؒ کی طرف تھا۔

شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے اخلاف میں سے شیخ الاسلام خواجہ عابد، جن کا شمار ماوراء النہر کے جید علما میں ہوتا ہے، اورنگ زیبؒ کی حمایت میں دارا شکوہ کے خلاف لڑے۔ دارا شکوہ کی شکست کے فوراً بعد اورنگ زیبؒ نے انہیں سہ ہزاری ذات اور پانصد سوار کا منصب اور "خان" کا خطاب عطا کیا۔[۵۶] جب دوبارہ دارا شکوہ اور راجہ جسونت سنگھ اورنگ زیبؒ کے مقابلہ کو نکلے تو اس جنگ میں بھی خواجہ عابد نے اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے۔ اورنگ زیبؒ نے اس بار "اضافہ" دے کر چہار ہزاری ذات اور ہفت صد سوار کا منصب عطا کیا۔ چوتھے سال جلوس میں اورنگ زیبؒ نے انھیں صدر کے عہدہ پر فائز کیا۔ اس کے دو سال بعد آپ اجمیر کے گورنر بنے اور چند سال بعد آپ کا ملتان تبادلہ ہو گیا۔[۵۷] چوبیسویں سال جلوس میں اورنگ زیبؒ نے رضوی خان کی جگہ خواجہ عابد کو "صدرِ کل ہندوستان" بنایا۔[۵۸]

---

[۵۴] محمد شفیع، مرأت واردات، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، ایڈیشنل ۶۵۷۹، ورق ۸۶ ب

[۵۵] محمد مراد، مناقب الحضرات، ورق ۷۳ الف

[۵۶] شاہنواز خان، مآثر الامراء، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۸ء، جلد سوم ص ۱۲۰

[۵۷] ایضاً، ص ۱۲۱

[۵۸] ایضاً، ص ۱۲۲

شہرۂ آفاق محدث شیخ طاہر پٹنیؒ کے پوتے شیخ عبدالوہاب سے زمانۂ شہزادگی میں اورنگ زیبؒ کی راہ و رسم تھی۔[۵۹] جب اورنگ زیبؒ برہان پور سے دارا شکوہ کے مقابلہ کے لئے نکلا تو شیخ عبدالوہاب نے فتویٰ جاری کیا کہ شاہجہان بیماری اور ضعف کی بنا پر کاروبار سلطنت چلانے سے معذور ہے۔ اس لئے اورنگ زیبؒ کی دارالحکومت پر فوج کشی شرعاً جائز ہے۔[۶۰] اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے فوراً بعد اس صلہ میں آپ کو قاضی عسکر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔[۶۱]

اسی طرح برہان پور کے ملا قطب ہانس کے ساتھ بھی اورنگ زیبؒ کے بڑے عمدہ مراسم تھے۔ اُنھوں نے بھی اس مہم میں اورنگ زیبؒ کی دل و جان سے مدد کی جس کے صلہ میں اورنگ زیبؒ نے تخت نشین ہوتے ہی انہیں ایک گاؤں بطور جاگیر اور چار لاکھ دام نقد عطا کئے۔[۶۲]

مسلمانوں کے دیندار اور دینی حمیت رکھنے والے طبقہ نے دل و جان کے ساتھ اس جنگ میں اورنگ زیبؒ کا ساتھ دیا کیونکہ وہ حصول تخت کے لئے ان کا نمائندہ تھا۔ مشہور ہندو مورخ لکھمی لال رائے چودھری رقمطراز ہے کہ اورنگ زیبؒ نے "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگایا جو بڑا سود مند

---

[۵۹] ایضاً، جلد اوّل، ص ۲۳۵

[۶۰] ڈاکٹر پی سرن، دی پراونشل گورنمنٹ آف دی مغلز، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۴۱ء، ص ۳۴۵

[۶۱] ماثر الامراء، جلد اوّل، ص ۲۳۶۔

[۶۲] محمد بقا، مرأت جہاں نما، مخطوطہ برٹش میوزیم لندن، اورینٹل ۱۹۹۸، ورق ۲۴۴ الف۔

ثابت ہوا اور اس طرح اس نے اپنا سیاسی مقصد حاصل کیا۔[۶۳] فاروقی صاحب کے خیال میں اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی پر دیندار طبقوں میں بڑی مسرت کا اظہار کیا گیا اور لوگ اسے نجات دہندہ سمجھنے لگے کیونکہ انھیں یہ اندیشہ دامنگیر تھا کہ دارا شکوہ کی کامیابی سے اکبر کا زمانہ واپس لوٹ آئے گا۔[۶۴]

تخت نشینی کے بعد بھی اورنگ زیبؒ نے خواجہ محمد معصومؒ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے۔[۶۵] اور بسا اوقات وہ مذہبی امور میں ان سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ خواجہ صاحبؒ کے بعض مکتوبات سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ مذہبی امور میں اُن کی ہدایات کا منتظر رہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحبؒ بھی اورنگ زیبؒ کی پالیسی سے متفق تھے اور اس کے لئے اکثر دُعا کیا کرتے تھے۔[۶۶] اورنگ زیبؒ نے اپنے دورِ حکومت میں اکبر اور دارا شکوہ کی جاری کردہ بدعات کو ختم کرنے کی دل و جان سے کوشش کی اور اس طرح اس نے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

---

[۶۳] لکھمی لال رائے چودھری، دی سٹیٹ اینڈ ریلیجن ان مغل انڈیا، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۹۔

[۶۴] فاروقی، ظہیر الدین، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، مطبوعہ بمبئی ۱۹۳۵ء، ص ۵۶۴۔

[۶۵] مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (اردو)، مکاتیب نمبر ۶، ۶۴، ۲۲۱، ۲۲۷۔

[۶۶] ایضاً، مکتوب نمبر ۲۲۷، ص ۲۸۶ - ۲۸۵۔

# مسجدِ قبا سے تاج محل تک

دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اقسام کا طرزِ تعمیر رائج ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ممالک کی مذہبی اور تاریخی روایات، آب وہوا اور جغرافیائی محلِ وقوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ان چیزوں کا طرزِ تعمیر پہ گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پہ یورپی ممالک میں، جہاں برف باری کثرت سے ہوتی ہے، مکانات کی چھتیں ڈھلوان بنائی جاتی ہیں تاکہ برف گرتے ہی چھت پہ سے نیچے پھسل جائے۔ اگر وہاں چھتیں ہمارے ہاں کی چھتوں کی طرح ہموار ہوں تو وہ برف کے بوجھ سے نیچے گر پڑیں۔ مذہبی روایات بھی کافی حد تک طرزِ تعمیر میں دخیل ہیں، ہم ایک مسجد کو مندر یا کلیسا کی طرز پر تعمیر نہیں کر سکتے، علاوہ ازیں مسجد کا قبلہ رُخ ہونا بھی شرط ہے۔ اسی طرح یہ چیز بھی مدِ نظر رکھی جاتی ہے کہ وہاں سامانِ تعمیر کس قسم کا میسر آسکتا ہے، مثلاً کشمیر میں عمارتی لکڑی کی افراط ہے اس لئے وہاں کی عمارتوں میں اس کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے۔ سرینگر کے شاہی محلات اور شاہِ ہمدان کی مسجد میں اخروٹ کی لکڑی پر کھدائی کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔ ٹنڈرا کے علاقے میں سوائے برف کے اور کچھ دستیاب نہیں ہو سکتا ہے اس لئے وہاں اینٹ پتھر کی عمارات بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ مختلف حالات کے تحت مختلف ممالک میں مخصوص طرز کی عمارات بنانے کا رواج ہے۔

اس وقت دنیا میں چینی، مصری، سومیری، یونانی، رومن، بازنطینی، گاتھک، ہندی، اسلامی اور مغل طرزِ تعمیر مشہور ہیں۔ چینی طرزِ تعمیر تا حال چین، جاپان، اور قریبی ممالک میں رائج ہے۔ گاتھک طرزِ تعمیر یورپ میں رائج تھا، مگر اب روز بروز ختم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے گرجے اسی طرزِ تعمیر کے نمونے ہیں۔ رومن طرزِ تعمیر یونانی طرزِ تعمیر کا جانشین ہے، لاہور کی اسمبلی کا صدر دروازہ اسی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ رومن طرزِ تعمیر کی جگہ ترکی میں بازنطینی طرزِ تعمیر نے لی۔ استانبول کی مسجد آیا صوفیہ، جامع فاتح، جامع سلیمان اور جامع سلطان احمد اسی طرزِ تعمیر کی مظہر ہیں۔ اس طرزِ تعمیر کی خصوصیت بلند و بالا منار اور چپٹے گنبد ہیں۔ لاہور میں چوک ریگل کے قریب جو مسجدِ شہدا تعمیر ہو رہی ہے، اس کا گنبد بازنطینی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ بازنطینی طرزِ تعمیر نے اسلامی طرزِ تعمیر میں نئی روح پھونکی، اور یہی اسلامی طرزِ تعمیر ایرانی اور ہندی اختلاط سے مغل طرزِ تعمیر میں بدل گیا۔ آج تاج محل جیسی عجوبہ روزگار عمارت ہمارے سامنے مغل طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔

عام عمارات دو مقاصد کے پیشِ نظر تعمیر کی جاتی ہیں۔ ایک تو عام رہائش یا اجتماعی استعمال کے لئے اور دوسری مذہبی نقطۂ نظر سے، مؤخر الذکر قسم میں، منادر، مساجد، مقابر اور گرجے آتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی تعمیر اور ان کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود حضرتِ انسان کا وجود ہے۔ خانۂ کعبہ دنیا بھر میں قدیم ترین عمارت ہے جس کی بنیاد خود حضرت آدم علیہ السلام نے

رکھی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر ثانی اسی بیت العتیق کی بنیادوں پر کی تھی۔ مقبرہ کی عمارت سب سے پہلے ترکی کے مغربی ساحل لیڈیا کے حاکم موسولس نے اپنی زندگی میں ہی تعمیر کروالی تھی، اُسی کے نام کی مناسبت سے انگریزی زبان میں مقبرہ کو موسولی ام کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں بھی ازمنہ قدیم کی عظیم الشان عمارات کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں عمارات میں شیشہ بھی استعمال ہونے لگا تھا۔ حضرت سلیمانؑ اور فرعون کے دربار تاحال مشہور ہیں اور شدادی عمارات تو بطور محاورہ استعمال ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اسلام کا اپنا کوئی مخصوص طرزِ تعمیر نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ غرناطہ کا قصرِ الحمراء، اشبیلیہ کا دربار ہال، قرطبہ کی جامع مسجد، اصفہان کی مسجد شاہ، لاہور میں علی مردان خان کا مقبرہ، فتح پور سیکری کا بلند دروازہ، سہسرام میں شیر شاہ سوری کا مزار اور آگرہ کا تاج محل مسلمانوں کے تعمیر کردہ ہیں اور آج انہیں اسلامی طرزِ تعمیر کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

عہدِ اسلام میں سب سے اوّل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے فوراً بعد مدینہ کی نواحی بستی قباء میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی جو چند دنوں میں ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ ان گھڑت پتھروں کو گارے کی مدد سے کھڑا کر کے ان پر کھجور کے پتوں کی چھت ڈال دی گئی۔ فی الحقیقت یہی وہ اسلامی طرزِ تعمیر تھا جس کی بنیاد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی۔ خداوند قدوس و توانا نے کلام پاک میں اسی مسجدِ قباء کے متعلق فرمایا ہے۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلَى التَّقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ ط

(اس کی بنیاد محض خوشنودیٔ خدا کے لئے تقویٰ و پرہیزگاری پر رکھی گئی)

مسجد قبا کی تعمیر کے چند روز بعد ہی مسجدِ نبوی بھی اسی اصول پر تعمیر ہوئی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس کی کافی حد تک توسیع کروا دی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہٗ نے دمشق میں اپنے لئے ایک عالیشان محل تعمیر کروالیا تھا۔ اس محل کی دیواریں سبز رنگ کی تھیں اس لئے اسے قصر الخضریٰ کہتے تھے۔ یزید کے آخری ایام حکومت میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہٗ کے خلاف حصین نے مکہ مکرمہ پر چڑھائی کی۔ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہٗ حرمِ مکہ میں محصور ہو گئے۔ حصین نے مکہ مکرمہ پر سنگ باری کی جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ محاصرہ ختم ہوا تو ابنِ زبیر رضی اللہ عنہٗ نے کعبہ کی مرمت کے لئے یمن سے ابرہہ کے تعمیر کردہ کلیسا، جسے آباد کرنے کی خاطر وہ کعبہ کو برباد کرنے پر تل گیا تھا، کے منقوش پتھر اور پچیکاری کے نمونے کعبہ میں لگوائے اور عمارت میں بھی کافی ردّ و بدل کیا۔

عبدالملک کے عہدِ خلافت میں حجاج بن یوسف نے ابنِ زبیر رضی اللہ عنہٗ کے تعمیر کردہ حصوں کو مسمار کر کے کعبہ کی عمارت کو قریش کی بنیادوں پر از سرِ نو تعمیر کروایا۔

عبدالملک نے ہی بیت المقدس میں صخرۂ شریف پر مثمن وضع کی عمارت تعمیر کی اور اس کے اوپر ایک گنبد بنوایا۔ اسی وقت سے مسلمانوں نے گنبد کو اپنا لیا۔ اس سے پہلے مصر میں فسطاط کے مقام پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہٗ نے ایک مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ ایک مینار بھی بنوایا۔ اسی دن سے مسجد کے ساتھ مینار تعمیر کرنے کا رواج پڑا۔

خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی تعمیر نو کا منصوبہ تیار کیا اور اسی سلسلہ میں قیصر روم کو خط لکھا کہ ہم اپنے نبی محترم ؐ کی مسجد نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں، تم کاریگر اور سامانِ تعمیر فراہم کر دو۔ قیصر نے ایک لاکھ مثقال سونا، چالیس گٹھے سامان مینت کاری اور بے شمار کاریگر اور دیگر ضروری سامان بھیج دیا۔ ایک روائت کے مطابق مدائن سے بھی کچھ سامان منگوایا گیا تھا۔ یہ شہر کسی زمانہ میں ایران کا پایۂ تخت رہ چکا تھا، اس لئے ایرانی اثرات بھی رومی اثرات کے ساتھ عرب میں آئے اور یہاں عربوں نے انہیں "مشرف باسلام" کر لیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اوّل بار مسجد میں محراب بنائی، اس کے بعد مسجد میں محراب بنانا ضروری ہو گیا۔

ایران میں دامغان کے مقام پر جب مسجد تعمیر ہوئی تو اس کے ساتھ جو مینار تعمیر کئے گئے ان میں کٹہرے (گیلریاں) بھی بنائے گئے۔

عباسی خلیفہ المعتز باللہ (۲۵۵ – ۲۵۲ ہجری) کو عمارات بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے سامرا میں جو محلات بنوائے ان کی دیواروں پر خوبصورتی کے لئے خوشنما رنگوں میں بے جان اشیاء کی تصویریں اور قدرتی مناظر بنوائے۔ اس طرح مسلمانوں نے ایک نئی جدّت اپنا لی۔ مندرجہ بالا مثالوں سے قارئین کرام کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اب تک کس قدر غیر ملکی اثرات اسلامی فنِ تعمیر پر اثر انداز ہو چکے تھے۔ جامع مسجد دمشق ایک گرجا کی بنیادوں پر تعمیر ہوئی۔ کرخ میں زبیدہ خاتون کا مقبرہ، بصرہ میں امام حسن بصریؒ کا روضہ اور بغداد میں حضرت شہاب الدین

عمر سہروردیؒ کی درگاہ پر ارمنی طرز کے مندر نما قبے تعمیر ہوئے۔ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر قابض ہوتے ہی وہاں کے سب سے بڑے گرجے، سینٹ صوفیہ کو بتوں اور تصویروں سے پاک کر کے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ ترکی کی دیگر مساجد مثلاً جامع فاتح، جامع سلیم، جامع سلیمان، جامع سلطان احمد، جامع بایزید اور جامع ایوبؓ اسی طرز پر تعمیر ہوئیں۔ اس طرح مسلمانوں نے ترکی میں بازنطینی طرزِ تعمیر کو معمولی سے ردّ و بدل سے اپنا لیا۔

جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو اس وقت تک اسلامی طرز تعمیر میں وہ تمام عناصر شامل ہو چکے تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک نے ہندوؤں کی عالیشان عمارات کو ذہن میں رکھتے ہوئے دہلی میں اسلام کی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھانے کے لئے ایک عظیم الشان مسجد قوت الاسلام کی بنیاد رکھی۔ اس مسجد کی تعمیر میں ۲۷ مندروں کا پتھر استعمال ہوا تھا۔ تاحال مسجد کے ستونوں پر ٹوٹی پھوٹی مورتیوں کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ مسلمانوں نے ان منادر کو فتح دہلی کے وقت گرایا ہو گا، ہمارے خیال کے مطابق فتح ہندوستان کے بعد جب غیر مسلموں نے کافی بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا تو انہوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مندر اور خود ساختہ معبود توڑ ڈالے۔ سلطان قطب الدین ایبک نے وہی پتھر خانۂ خدا میں لگوا دیئے۔ اگر ایک آدھ مثال مسلمانوں کے مندر گرانے کی مل جائے تو کوئی تعجب بھی نہیں۔ آج بھی مہذب دنیا میں اپنے مخالفین کی عبادت گاہوں کو

کہ نذرِ آتش کرنے یا مسمار کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

فتح ہندوستان کے بعد مسلمانوں نے ہندوؤں کے طرزِ تعمیر خصوصاً ان کے ستونوں کی ساخت اور اونچی کرسی پر عمارت بنانے کے طریقے کو اپنا لیا۔ اس کی واضح مثال اجمیر میں سلطان شمس الدین التمش کی تعمیر کردہ مسجد "اڑھائی دن کا جھونپڑا" ہے۔ اس مسجد کی محرابیں ہندوؤں کے طرزِ تعمیر سے کافی حد تک متاثر ہیں، نیز اس کے ستون ہندوؤں کے فنِ تعمیر کا مظہر ہیں، ان پر ٹوٹے پھوٹے بتوں کے نشانات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے آج تک اتنی بلند کرسی پر بنی ہوئی مسجد نہیں دیکھی۔ اس مسجد میں داخل ہونے کے لئے بیس پچیس کے قریب سیڑھیاں چڑھنا ہوتی ہیں۔

قطب مینار کا شمار اِن عمارات میں ہوتا ہے جو مسلمانوں نے فتح دہلی کے فوراً بعد تعمیر کی تھیں۔ ان عمارات کی تعمیر میں مسلمان معماروں سے کہیں زیادہ ہندو معماروں نے حصّہ لیا تھا، اس لئے ان عمارات میں ہندوانہ رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر قطب مینار کی ابتدائی منازل میں کوفی خط میں کتبات کندہ نہ ہوتے تو دیکھنے والے یہی تأثر لیتے کہ یہ مینار ہندوؤں کے دورِ حکومت میں تیار ہوا تھا۔ یہ قطب مینار کا ہندوانہ رنگ ہی تھا کہ ہندوؤں نے اُسے "رائے پتھورا کی لاٹھ" مشہور کر دیا۔ قطب مینار کے متعلق غالی ہندو اب تک یہی کہہ رہے ہیں کہ پرتھوی راج کی ماں جب تک جمنا جی کے درشن نہیں کر لیتی تھی اس وقت تک ناشتہ کو چھوتی تک نہ تھی۔ جب وہ کافی ضعیف ہو گئی اور سفر کے قابل نہ رہی تو پرتھوی راج نے یہ لاٹھ بنوا دی تاکہ وہ اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کر لیا کرے۔ ہمارے خیال میں قطب مینار کے ہندوانہ طرزِ تعمیر نے

ہندوؤں کو یہ روایت گھڑنے کا موقع دیا ہے۔

شمس الدین التمش کے عہدِ حکومت میں چنگیز خان کے حملوں کی وجہ سے ماوراء النہر، ترکستان، خراسان اور خوارزم سے عام لوگوں کے ساتھ ہر فن کے کاریگر بھی کافی بڑی تعداد میں ہندوستان چلے آئے۔ ان کے یہاں آنے سے ہمارے ہاں کے طرزِ تعمیر پر کافی اثر پڑا۔ مہرولی میں علاؤالدین خلجی کا تعمیر کردہ علائی دروازہ گزشتہ تمام عمارات سے بالکل مختلف ہے۔ اس عمارت کو اگر باہر سے دیکھئے تو دو منزلیں نظر آتی ہیں، لیکن اندر جا کر دیکھیں تو ایک ہی منزل نظر آتی ہے۔ اس کا گنبد بھی مختلف طرز کا ہے، ماہرین فنِ تعمیر نے اسے اس زمانے کا شاہکار قرار دیا ہے۔

خلجیوں کی بساطِ سلطنت اُلٹی تو تغلق خاندان حکمران ہوا۔ ان کا طرزِ تعمیر منفرد رنگ لئے ہوئے ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق جن دنوں دیپال پور اور ملتان کا گورنر تھا، اس نے بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب ہی اپنے لئے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروا لیا تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے وہ مقبرہ حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت رکن عالم علیہ الرحمت کے حوالے کر دیا۔ حضرت رکنِ عالم نور اللہ مرقدہٗ اسی مقبرے میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ اس مقبرے کی تین منزلیں ہیں اور جن دیواروں پر گنبد اُٹھایا گیا ہے وہ سلامی دار ہیں۔ یہ تمام کی تمام عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے اور اس میں زیبائش کے لئے کہیں کہیں منقش اینٹیں بھی لگائی ہوئی ہیں۔ دیواروں کو سہارا دینے کے لئے بڑے مضبوط ستون بنائے گئے ہیں۔ اس عمارت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ گنبد کی تعمیر میں اینٹوں کے درمیان لکڑی

کے شہتیر بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ ماہرینِ فن کا یہ کہنا ہے کہ زلزلہ کی صورت میں یہ شہتیر گنبد کو سنبھال لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ گنبد گذشتہ ساڑھے چھ سو سال میں ہر طرح کے حادثوں سے محفوظ رہا ہے۔ اس عمارت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ صخرہ شریف کی طرح یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے۔ یہ چیز تغلقوں کے فنِ تعمیر کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دہلی میں بھی انھوں نے جتنی عمارتیں بنوائی ہیں ان کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ عمارت کا بنیادی نقشہ مثمن ہو۔

تغلق خاندان کا خاتمہ امیر تیمور نے کیا اور ہندوستان میں اس کی طرف سے سادات حکمرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ امیر تیمور نے مقبروں کی تعمیر میں ایک نئی جدت نکالی۔ جب اس کی ملکہ بی بی خانم کا انتقال ہوا تو امیر موصوف نے اس کی قبر ایک تہ خانہ میں بنوائی اور اس کے اوپر عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔ امیر تیمور کے عہد سے مغلوں میں اصلی قبر تہ خانہ میں بنانے کا رواج پڑا۔ ہمایوں، اکبر، جہانگیر، نور جہاں اور ممتاز محل کے مقبروں کی تعمیر کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

خاندانِ سادات کے بعد ہندوستان کی حکومت لودھیوں کو ملی۔ سکندر لودھی نے آگرہ کی بنیاد رکھی اور وہاں متعدد عمارات بنوائیں۔ لودھیوں کے گنبد عجیب وضع کے تھے اس زمانے میں مربع عمارت پر بالکل گول گنبد بنانے کا رواج ہوا۔ لاہور میں نولکھا چرچ کی حدود میں حضرت بایزید رحمتہ اللہ علیہ کے مقبرہ پر جو گنبد تھا اُسے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے بہت بڑی گیند کو درمیان سے کاٹ کر دیواروں پر رکھ دیا ہے۔ اب ہماری غفلت کی وجہ سے یہ عمارت ڈھ گئی ہے۔ سکندر لودھی کے نا اہل جانشین نے

بابر کے مقابلہ میں شکست کھائی اور مغلوں کی ہندوستان پر قبضہ کرنے کی صدیوں پرانی خواہش پوری ہو گئی۔

بابر کو قدرتی مناظر اور باغات سے بڑا اُنس تھا۔ اس نے اپنے عہد میں باغات تعمیر کروائے۔ مگر موت نے اُسے زیادہ مہلت نہ دی اور وہ ہمایوں کو تاج و تخت سونپ کر راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ ہمایوں پٹھانوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا اور جان بچا کر ایران کی جانب چلا گیا۔ شیر شاہ حکمران ہوا، لیکن اسے بھی موت نے مہلت نہ دی۔ اس کا مقبرہ اس کے عہد کی بہترین عمارت ہے شیر شاہ اپنے آبائی وطن سہسرام میں مدفون ہوا۔ مقبرہ ایک وسیع تالاب کے وسط میں کھڑا ہے۔ ایک پل کے ذریعے وہاں جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف سال گذشتہ اس کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے[1]۔ مقبرہ کے اندر لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں بھڑ موجود تھے، دعائے مغفرت پڑھنی بھی دشوار ہو گئی تھی۔ یہ عمارت بھی ہشت پہلو ہے اور حضرت رکن عالمؒ کے مقبرہ کی طرح اس کی بھی تین منزلیں ہیں۔

شیر شاہ کے جانشین نالائق ثابت ہوئے، ہمایوں دوبارہ ۱۵۵۵ء میں بیرم خان کی ہمت سے ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ لیکن چھ ماہ بعد ہی اس نے شیر منڈل کی عمارت سے گر کر وفات پائی۔ اس کی بیوی حاجی بیگم نے اس کے مقبرہ کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کرائی۔ دس برس میں سولہ لاکھ کی لاگت سے یہ عمارت پایہ تکمیل تک پہنچی۔ ہمایوں کے ساتھ ایرانی صناع بھی ہندوستان آ گئے تھے اس لئے اس عمارت میں ایرانی فنِ تعمیر کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ مقبرہ ایک وسیع باغ کے وسط میں کھڑا ہے۔ اور یہی باغ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ مقبرہ کی عمارت

---

[1] یہ ۱۹۵۵ء کا ذکر ہے۔

۲۲ فٹ بلند کرسی پر اُٹھائی گئی ہے۔ یہ بغدادی طرز کی ہشت پہلو عمارت ہے (بغدادی طرز میں آٹھوں پہلو برابر نہیں ہوتے۔ چار بڑے اور چار چھوٹے ہوتے ہیں) گنبد کی گردن بے حد چھوٹی ہے۔ گنبد سنگِ مرمر کا ہے لیکن باقی تمام عمارت سنگِ سُرخ سے بنی ہے۔ اس میں جابجا سنگدار پتھر آرائش کی خاطر لگا دیئے ہیں ایک بات قابلِ غور ہے کہ مقبرے کے ساتھ منارے نہیں بنائے گئے۔ باقی عمارت کو۔ بالکر ڈلیچر نے تاج محل کا پیش رو قرار دیا ہے۔ یہ عمارت ۱۵۶۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اسی زمانہ میں ۱۵۶۲ء میں گوالیار میں جناب محمد غوث کا مزار تعمیر ہوا، اس کی جالیاں قابلِ دید ہیں۔ ویسے احمد آباد میں سیدی سید کی مسجد کی جالی دنیا بھر میں بہترین جالی قرار دی گئی ہے۔ تاج محل کے اندر مزارات کے گرداگرد جو جالیاں بنی ہیں ان میں ایسی ہی نفاست برتی گئی ہے۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں کافی عمارات بنوائیں۔ اس کی بیوی سلیمہ سلطان بیگم کے محل کی منبت کاری ایک لاثانی نمونہ ہے، لیکن یہ ہے سب سنگِ سُرخ پر۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بلند دروازہ بنایا جو سڑک کی سطح سے ۱۷۶ فٹ بلند ہے اور ہندوستان میں سب سے زیادہ بلند دروازہ ہے۔ اس پر پچی کاری کے نمونہ پر قرآنی آیات اور نقش نگار کندہ ہیں۔ شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ خالص سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا اس کے ستون اور بریکٹ نفاست اور کاریگری کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ اکبر کے آخری ایامِ حکومت میں سنگِ سُرخ کی جگہ سنگِ مرمر نے لے لی تھی۔ اکبر نے اپنے لئے سکندرہ میں مقبرہ تعمیر کروانا شروع کر دیا تھا اور اس میں ہندو آرٹ کو نمایاں دخل ہے۔ مقبرہ کا بیرونی دروازہ اور اس کے سنگِ مرمر کے

مینار بے نظیر ہیں۔ تاج محل میں ان میناروں کی نفاست اور عمدگی مدِنظر رہی ہو گی۔ تاج محل کے میناروں کے بعد خوبصورتی میں ان ہی کا نمبر ہے۔

اکبر اور جہانگیر کی ہندو بیویاں مخصوص طرز کے محلات میں رہتی تھیں۔ ان کی تعمیر میں ہندو طرزِ تعمیر کو خاص دخل تھا۔ اس طرح ہندو آرٹ زیادہ سے زیادہ مغل آرٹ میں داخل ہونے لگا۔ آگرہ میں جودھا بائی کے محل میں گھومتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی مندر میں گھوم رہے ہیں۔

اسی عہد میں عبدالرحیم خانخاناں کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ یہ مقبرہ ہمایوں کے مقبرہ اور تاج محل کے درمیانی کڑی ہے۔ ان سب میں اندازاً نصف صدی کا فرق ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقبرہ ہمایوں کا انداز تا حال جاری تھا۔ اس کے بعد ۱۶۲۶ء میں آگرہ میں نور جہاں نے اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا مقبرہ تعمیر کروایا۔ عمارت دریا کے کنارے واقع ہے۔ تاج محل میں بھی یہی چیز مدِنظر رکھی گئی ہے۔ تمام کی تمام عمارت سنگِ مرمر کی ہے پچیکاری کے نمونے بھی بہت عمدہ ہیں۔ چھت پر گنبد کی بجائے بنگالی وضع کی چھت بنائی گئی ہے۔ مگر چاروں کونوں پر مینار موجود ہیں۔ کہتے ہیں کہ نور جہاں نے خود اس عمارت کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اگر آگرہ میں تاج محل نہ ہوتا تو یہی سب سے عمدہ عمارت ہوتی۔ تاج محل کی موجودگی میں اس کا حسن گہنا گیا ہے۔ پرسی براؤن نے اسے اکبر اور شاہ جہان کے طرزِ تعمیر کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔

لاہور میں انارکلی کا مقبرہ بھی تاج محل کی وضع قطع لئے ہوئے ہے بلکہ اس کا بنیادی نقشہ تاج محل سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تاج محل کی طرز پر عمارات بننے لگ گئی تھیں اور مختلف طرز کے نمونے جن کی تاج میں پیروی کی گئی ہے، ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے تھے۔

شاہ جہان نے ان سب کو معمولی ردّ و بدل سے یکجا کر دیا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ عمارت کے کونوں پہ چار مینار تعمیر ہوئے اور قبر کے تعویذ پہ بڑی عمدہ قسم کی پراچین کاری ہوئی۔ یہی فن دیوانِ عام کے شاہی جھروکہ میں اپنے جوبن پہ نظر آتا ہے۔ قلعہ لاہور میں احاطہ شیش محل میں نو لکھا بارہ دری پہ بھی اس فن کے باریک اور نفیس نمونے پائے جاتے ہیں۔ دو انچ مربعہ جگہ میں ۱۰۵ رنگ برنگے پتھر پھول پتیوں کی شکل میں سنگِ مرمر کھود کر بھرے گئے ہیں۔ تاج محل کے اندرونی حصہ میں جالی پہ بہت ہی عمدہ پراچین کاری ہوئی ہے۔

شاہ جہان نے لال قلعہ میں دیوانِ خاص میں بہترین قسم کے نقش و نگار کروائے اور اس پہ خود ہی یہ شعر بھی منقوش کروا دیا۔ ؏

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اب اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ شاہ جہان کے عہد میں ہندو اثرات جو اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت میں عام ہو گئے تھے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ ایرانی طرز تعمیر زیادہ مقبول ہو گیا۔ لاہور میں وزیر خان کی مسجد، گلابی باغ اور دائی انگا کی مسجد اس پہ شاہد ہیں۔

ممتاز الزمانی ملکہ ارجمند بانو نے ۱۶۳۰ء میں وفات پائی۔ اسی سال تاج محل کی بنیاد رکھی گئی۔ ۲۲ برس میں کروڑوں روپوں کی لاگت سے یہ عمارت تیار ہوئی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے "کہ تاج محل ایک اشک محبت ہے جو شاہ جہان کی چشم پرنم سے ٹپکا ہے۔" اس کی تعمیر میں تمام خوبیاں صرف کر دی گئیں اور آج تک کوئی شخص بھی فنی غلطی نہ نکال سکا۔ تاج محل میں بی بی خانم کے مقبرہ کی پیروی میں تہ خانہ، جہانگیر کے مقبرہ کی طرز پہ کونوں پہ چار مینار، انارکلی کے مقبرہ کی طرح بنیادیں، اکبر کے مقبرہ کے دروازہ کی طرح میناروں میں نفاست، دیوانِ عام دہلی کی طرح پراچین کاری، مقبرہ ہمایوں کی طرح بلند کرسی اور بغدادی مثمن، محمد غوث گوالیاریؒ کے مزار کی طرح جالیوں میں عمدگی اور نفاست مقبرہ اعتماد الدولہ کی طرح تمام کی تمام سنگِ مرمر، بلند دروازہ اور مقبرۂ اکبر کے دروازہ کی طرح دروازوں پہ آیاتِ قرآنی، مغلیہ عمارات کی طرح باغات و انہار اور عمارات کا تقابل اور بلند و بالا دروازے اور دریا کا کنارہ اور دوسری باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاج محل ۲۲ برس میں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ وہ مسلمانوں کے گیارہ صدیوں کے فنِ تعمیر کی فنی خصوصیات کا حامل ہے۔

* * *

# مسلمانوں کی طبّی خدمات

انسانی معاشرہ میں ہر دور میں طبیب کا وجود بڑا ضروری ہے۔ انسان خواہ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہتا ہو یا امریکہ اور سویڈن کے متمدن ترین شہروں میں، ہر جگہ طبیب کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے مسلم سوسائٹی میں طبیب کو جو مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا شرف الدین العطائی نے فوائد فیروز شاہی میں ابواللیث فقیہہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جہاں یہ چھ چیزیں نہ ہوں وہاں رہائش اختیار نہ کرو۔

آبِ رواں، نقدِ رائج۔ قاضیٔ عالم۔ حاکمِ عادل۔ بازارِ آراستہ طبیبِ حاذق۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: علم دو ہیں، علمِ دین اور علمِ طب، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے علمِ دین کے ساتھ ساتھ علمِ طب کی طرف بھی توجہ دی اور اس فن میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ اپنے اور بیگانے یہ کہہ اُٹھے کہ اگر آج ارسطو اور جالینوس زندہ ہوتے تو وہ بھی ان کی تصانیف کا احترام کرتے۔

کتبِ احادیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ملتے ہیں جن میں حضور نے بعض امراض کے لئے علاج تجویز فرمائے ہیں، مثلاً حضور کا ارشاد ہے کہ بخار کی تپش کو پانی ڈال کر ٹھنڈا کیا کرو۔ آج بھی جب بخار کا درجہ حرارت ایک خاص درجے سے بڑھ جاتا ہے تو ڈاکٹر مریض کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو کر رکھتے اور درجہ حرارت نیچے لاتے ہیں، شہد کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اس میں شفا ہے، بعض اہلِ علم نے اس طرف کافی توجہ دی ہے اور آج طبِ نبوی کے نام سے ایک کتاب ہمارے پاس موجود ہے۔

حضور سرورِ کائناتؐ کے شوق دلانے پر مسلمانوں میں علمِ طب کی تحصیل کا شوق پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ طبابت متقی اور دیندار مسلمانوں کا پیشہ بن گیا۔

عہدِ نبوی میں مدینہ طیبہ میں ام سلیمؓ، ام مطاعؓ، ام عطیہؓ، لیلیٰؓ، رفیدہ الضاریہؓ اور اسماء بنت ابوبکرؓ طبابت کے لئے مشہور تھیں۔

اموی عہد میں ابن آثال، تیاذوق، علیٰ بن حکم اور آخری دور میں جابر ابن حیان کا نام ملتا ہے جو اپنے دور میں طبابت اور حذاقت کے لئے مشہور تھے۔ عباسی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی عباسی خلفاءُ نے علمِ طب کی طرف کافی توجہ دی اور ان کی قدر دانی اور زر پاشیوں سے اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ المنصور کے عہد میں جورجیس نامی ایک عیسائی طبیب کے کمالِ فن کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ اسی طرح ہارون الرشید کے عہد میں جبریل بن بختیشوع اپنے زمانے کا جالینوس مانا جاتا تھا، ہارون نے اُسے اپنا ندیم و مشیر بنا رکھا تھا اور شاہی دربا

میں اس کی بڑی عزت اور تکریم کی جاتی تھی۔ ہارون نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ اگر کوئی شخص اُسے ملنا چاہے تو وہ پہلے جبریل سے ملے پھر اس کی وساطت سے مجھے ملے۔ جب جبریل کا انتقال ہوا تو مسلمان شعراء نے اس کے مرثیے لکھے۔ اس سے اس کی عوام میں مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مامون الرشید کے عہد خلافت سے پہلے بھی کئی نامور طبیب مثلاً جابر ابن حیان، جورجیس، جبریل بن بختیشوع اور تیاذوق ہو گذرے ہیں۔ لیکن اس چمن میں بہار اس وقت آئی جب ۸۳۳ء میں المامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اور وہاں ابوبکر محمد بن زکریا رازی، یوحنا ابن ماسویہ اور حنین بن اسحٰق جیسے اطباءؑ کو طبی تحقیق کے لئے مامور کیا۔

المعتصم کے عہد خلافت میں سلمویہ نامی ایک عیسائی طبیب کے کمالِ فن کا بڑا شہرہ تھا اور خلیفہ نے اُسے اپنا مشیر اور ندیم بنا لیا تھا۔ المعتصم کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرے نزدیک سلمویہ کا مرتبہ قاضی القضاۃ سے کہیں زیادہ ہے۔ خلیفہ کی نظروں میں سلمویہ کا جو مقام تھا اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ جب سلمویہ کا انتقال ہوا تو خلیفہ نے اپنے شاہی دربار میں اس کی میت کو لا کر رکھا اور پھر شاہی اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کا جنازہ اُٹھایا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں جن غیر مسلم اطباءؑ نے طبی خدمات انجام دی ہیں ان میں آلِ حنین،

آلِ بختیشوع اور آلِ ماسرجویہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک طبی کتابیں عموماً یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، اس لئے وہ مسلمانوں کی دسترس سے باہر تھیں۔ عیسائی چونکہ یونانی زبان سے بخوبی واقف تھے اس لئے وہ بڑی آسانی کے ساتھ طبِ یونانی کا مطالعہ کر کے طبابت شروع کر دیتے تھے۔ جب المامون کے ایماء پر بیت الحکمت میں یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ ہونے لگیں تو پھر مسلمان اس فن میں غیر مسلموں کو کہیں پیچھے چھوڑ گئے۔ جس دور میں طب پر عیسائی اور صابئی چھائے ہوئے تھے، اس دور میں جبریل بن بختیشوع، حنین، تیاذوق، یوحنا بن ماسویہ، ماسرجویہ، سلمویہ، قسطہ بن لوقا اور ابن البطریق نے بڑا نام پایا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بڑی ضروری ہے کہ قارئین کہیں سطور بالا سے یہ نتیجہ اخذ نہ کریں کہ مسلمانوں نے طب عیسائیوں سے سیکھی ہے یا پھر یونانیوں کی تحریروں سے۔ مسلمانوں نے ان سے یہ فن سیکھا ضرور ہے لیکن ان کی اندھی تقلید نہیں کی۔ مسلمانوں نے اپنے تجربات اور اجتہادات سے طب کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے۔ مثلاً ابو المنصور صاعد نے حکمائے یونان کے طریق علاج کے برعکس لقوہ اور فالج کا علاج ادویۂ باردہ سے کیا ہے۔ اسی طرح رضی الدین نے کثرت غذا سے علاج کیا ہے۔ اور ابن الوافد نے بھی علاج بالغذا پر زور دیا ہے۔ مسلمانوں نے جنون کے لئے افیون اور نکسیر کے لئے سرد پانی کا استعمال تجویز کیا ہے۔ اوحد الزمان ابو البرکات نے ایک خاص وبائی مرض میں قطع انامل سے علاج کیا ہے چیچک کے مرض سے بچاؤ کی خاطر مسلمانوں نے ORAL VACCINATION کا طریقہ ایجاد

نفسیاتی علاج بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اس موضوع پر پورا ایک باب نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ میں موجود ہے۔ ابن جلجل اور ابن البیطار نے نئی ادویہ دریافت کیں جن سے اطبائے یونان واقف نہیں تھے۔ اسی طرح مسلمانوں نے اوّل بار ریوند، کافور اور سنا کے خواص معلوم کئے اور جذام اور چیچک کے موضوع پر رسالے لکھے۔ علم کیمیا تو خاص طور پر مسلمانوں کا مرہونِ منت ہے۔ اگر کسی نے مسلمانوں کے اجتہادات کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنی ہوں تو اسے التنوخی کی — الفرج بعد الشدۃ — کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ آئندہ صفحات میں ہم چند نامور اطباء کا ذکر کریں گے، جن پر طبِ اسلامی کو فخر ہے۔

جابر ابن حیان، جسے طبی کتابوں میں بابائے کیمیا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار ان اطباء میں ہوتا ہے جن پر امتِ مرحومہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ جابر کے ہمعصروں میں کشتوں کی تیاری، تیزاب سازی اور معدنی نمکیات بنانے میں دنیا بھر میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس نے تصعید، ترشیح، تبخیر اور تقطیر کے فن کو ترقی دی اور شراب سے الکحل کو الگ کر کے اپنے ہمعصر اطباء سے خراجِ عقیدت وصول کیا۔ اسی طرح سنکھیا اور انٹی مونی کو دوسری دھاتوں سے الگ کر کے دنیا بھر کے اطبائے سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائیٹرو کلورک ایسڈ، لیکر امیونیا، مرکری کلورائڈ، مرکری اوکسائڈ، پوٹاشیم نائٹریٹ، فرائی سلفاس اور الکحل اسی کی ایجاد ہیں۔

۱۱۴۴ء میں ہی جابر کی کتابوں کے یورپی زبانوں میں ترجمے شروع ہو گئے تھے اور اسی زمانے میں رابرٹ چیسٹر نامی ایک انگریز نے THE BOOK OF THE COMPOSITION OF ALCHEMY کے نام سے کتاب لکھ کر اہلِ انگلستان کو اس کے کارناموں سے روشناس کرایا۔

حنین بن اسحاق (۱۹۴ - ۲۶۴ء) کا شمار ان نامور عیسائی اطباء میں ہوتا ہے جو عہدِ اسلامی میں مسلمان حکمرانوں کی قدردانی اور زرپاشیوں کی بدولت مشہور ہوئے۔ حنین عربی زبان کے علاوہ یونانی اور سریانی زبانوں پر کامل دسترس رکھتا تھا، اس لئے اپنے ہمعصر مسلمان اطباء کی نسبت اُسے یونانی طبی کتابوں سے استفادہ کرنے کا خوب موقع ملتا تھا۔ طبی کتابوں کے حصول کی خاطر اس نے روم تک کا سفر بھی کیا تھا۔ اور اس سفر سے واپسی پر المامون نے اُسے دار الحکمت میں ملازم رکھ لیا، جہاں اس کا بیشتر وقت یونانی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے پر صرف ہوتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ ایک کتاب کا ترجمہ کر کے المامون کی خدمت میں پیش کرتا تھا تو وہ اُسے اس کتاب کے وزن کے برابر سونا عطا کرتا تھا۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۵ - ۹۲۵ء) جسے یورپ میں RHAZES کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کا شمار ان اطباء میں ہوتا ہے جن پر ملتِ اسلامیہ کو بڑا ناز ہے۔ رازی ایک واسطے سے حنین بن اسحٰق کا شاگرد تھا اور اس کے استاد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ یونانی، ایرانی اور ہندوستانی طب میں وقوف کامل رکھتا تھا۔ رازی کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی طبیعت جدت پسند تھی اس لئے وہ نت نئے تجربے کرتا رہتا تھا۔

رازی نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز رے کے ایک ہسپتال میں طبیب کی حیثیت سے کیا جہاں وہ تھوڑے ہی عرصہ میں افسرالاطباء بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے بغداد کے ہسپتالوں کا افسرالاطباء مقرر کیا گیا اور یہیں اس کی لیاقت کے اصلی جوہر کھلے۔ ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور دنیا کے گوشے گوشے سے مایوس العلاج مریض اس کے پاس آنے لگے۔

رازی نے علم طب پر چھوٹی بڑی ۱۴۱ کتابیں لکھی ہیں، ان میں وہ ۱۲ رسالے بھی شامل ہیں جو اس نے علم کیمیا پہ لکھے ہیں۔ رازی کی سب سے اہم تصنیف الحاوی ہے جس کی بیس سے زیادہ جلدیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ۱۴۸۶ء میں اس کتاب کا اوّل بار لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے بعد یہ کتاب یورپ میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں رازی نے اپنا حاصل مطالعہ اور اپنے تجربات لکھ کر اپنے بعد آنے والے اطباء کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔

الحاوی کے علاوہ رازی نے جذام اور چیچک پہ دو الگ رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک رسالے میں گردے اور مثانے سے پتھری نکالنے کے طریقے بتائے ہیں۔ ان کے علاوہ رازی نے علم تشریح البدن پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ یورپ کے مستشرقین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں میڈیکل سائنس کی ترقی میں الحاوی کو بڑا دخل حاصل ہے۔

علی بن عباس جو یورپ میں HALY ABBAS کے نام سے مشہور ہے، دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بڑا نامور طبیب ہو گزرا ہے۔ وہ نسلاً ایرانی اور مذہباً مجوسی تھا، وہ چونکہ اسلامی عہد میں مسلمانوں کی معارف پروری کی وجہ سے مشہور ہوا اس لئے اس کی طبی خدمات کا ذکر بھی مسلمانوں کی طبی خدمات کے ضمن میں ہوتا ہے۔

اس نے علم طب پر۔ الملکی۔ کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی جس پہ مدتوں تک اس کے بعد آنے والے اطباء کا دارومدار رہا، لیکن جب بو علی سینا نے۔ قانون۔ لکھی تو اس کے مقابلہ میں الملکی کی شہرت ماند پڑ گئی، الملکی کا ۱۵۲۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور اس کے بعد یہ کتاب یورپ میں خوب مقبول ہوئی۔

علی بن عباس نے بڑے بڑے اطباء کے طریقِ علاج پہ جی بھر کر تنقید کی ہے اور اس ضمن میں وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں کوئی طبیب اس وقت تک کامیاب طبیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقاعدہ ہسپتال جا کر مریضوں کا معائنہ نہ کرے چنانچہ اس نے طبیب کیلئے ہسپتال کی حاضری لازمی قرار دی ہے۔

مسلمان اطباء میں ابن الجزار (م ۱۰۰۹ء) کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب زاد المسافر عہد وسطیٰ میں ایشیا کے علاوہ یورپ میں بھی بڑی مقبول تھی۔ لاطینی زبان کے علاوہ اس کے عبرانی اور یونانی ترجمے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔

زاد المسافر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اندرونی امراض کی تشخیص اور ان کے طریقِ علاج پہ بحث کی گئی ہے۔

شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا، جو مغرب میں

AVICENNA کے نام سے مشہور ہے، مسلمان اطباء میں امام کا درجہ رکھتا ہے خالقِ ارض و سما نے اس کے ہاتھ میں ایسی شفا بخشی تھی کہ لوگ اُسے آیۃٌ مِنْ آیاتِ اللہ۔ کہتے تھے۔

بو علی سینا سنہ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا اس کا والد بلخ کا رہنے والا اور مذہباً اسمٰعیلی تھا۔ بو علی نے جونہی ہوش سنبھالا اس کا والد بلخ سے ترکِ سکونت کر کے بخارا چلا گیا۔ اس زمانے میں بخارا کا شمار دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علمی مراکز میں ہوتا تھا اور وہاں اس دور کے بہترین اساتذہ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ بو علی کی تعلیم و تربیت اسی مدینۃ العلم میں ہوئی اور اٹھارہ برس کی عمر میں اس کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ سنہ ۹۹۷ء میں امیرِ بخارا ایک ایسی مرض میں مبتلا ہوا کہ اطباءُ اس کے علاج سے عاجز آ گئے۔ اس موقع پر بو علی نے اس کا کامیاب علاج کر کے شاہی لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت لے لی۔ سنہ ۱۰۰۴ء میں جب سلطان محمود غزنوی نے بخارا پر قبضہ کیا تو بو علی کو غزنی آنے کی دعوت دی۔ بو علی نے سلطان کی دعوت رد کر دی اور خیوہ میں شمس المعالی قابوس کے دربار میں پناہ لی۔ سنہ ۱۰۱۲ء میں قابوس نے وفات پائی تو بو علی رے چلا گیا۔ بارہ برس بعد اس نے مستقل طور پر ہمدان میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں جون سنہ ۱۰۳۷ء میں دردِ قولنج سے اس کا انتقال ہوا۔

شیخ الرئیس کے متعلق مشہور ہے کہ سفر و حضر میں شاگردوں کا ایک جمِ غفیر اس کے ساتھ رہتا تھا اور وہ صبح و شام ان کو درس دیتا تھا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ لکھنے پڑھنے میں بھی کافی وقت صرف کرتا تھا۔ شیخ الرئیس نے طبی لٹریچر میں گراں قدر اضافہ کیا اور اس کی القانون

کے مقابلہ میں میں رازی کی الحاوی اور المجوسی کی الملکی کی شہرت ماند پڑ گئی القانون، جس کی وجہ سے بو علی سینا کا نام تا قیامت زندہ رہے گا، کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اس نے اصولِ طب کا ذکر کیا ہے، دوسرے حصے میں مفردات سے بحث کی ہے، تیسرے حصے میں سر سے پیر تک جسم کے ایک ایک حصے کے امراض کا ذکر کیا ہے۔ چوتھے حصے میں شیخ الرئیس نے امراضِ عامہ سے متعلق بحث کی ہے اور پانچویں حصے میں مرکبات کا ذکر کیا ہے۔

القانون کا بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کے فوراً بعد یہ کتاب یورپ کے طبی نصاب میں داخل ہو گئی سنہ ۱۶۵۰ء تک القانون یورپ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں LOUVAIN اور MONTPELLIER کے نصاب میں داخل رہی۔

یورپ میں اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ صرف اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۴۷۰ء سے لے کر سنہ ۱۵۰۰ء تک یہ کتاب سولہ بار طبع ہوئی سولھویں صدی میں اس کے بیس سے زائد ایڈیشن یورپ کے مختلف ممالک میں طبع ہوئے۔ اس کتاب کے متعلق ہمارے اطباءُ کا یہ قول ہے کہ اگر جالینوس اور بقراط زندہ ہو جائیں تو وہ بھی القانون کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

ابوالقاسم الزہراوی جس پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، قرطبہ کی ایک نواحی بستی مدینۃ الزہرا کا رہنے والا تھا۔ قرطبہ کا شمار اس زمانے میں دنیا کے بہترین علمی مراکز میں ہوتا تھا۔

الزہراوی نے اسی مدینۃ العلم میں اس عہد کے بہترین اساتذہ سے

تعلیم پائی۔

الزہراوی ابھی نوعمر ہی تھا کہ اس کے کمالِ فن کا شہرہ پورے اندلس میں پھیل گیا۔ عبدالرحمٰن الثالث نے پہلے اُسے اپنا ذاتی معالج بنایا۔ بعدازاں اُسے شاہی ہسپتال کا ہاؤس سرجن مقرر کیا، اسی ہسپتال میں اُسے مختلف اقسام کے اپریشن کرنے کا موقع ملا۔ الزہراوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ۔ التصریف لمن عجز عن التالیف ۔ میں مختلف اقسام کے اپریشن کرنے کے طریقے بتانے کے علاوہ ان آلات کی تصویریں بھی دی ہیں جو اپریشن کے دوران استعمال ہوتے ہیں۔ الزہراوی کی اس کتاب کو پڑھ کر اور ان آلات کی تصویریں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جراحی کا مکمل نظام موجود تھا۔

الزہراوی کا شمار ان نامور اطباء میں ہوتا ہے جنہوں نے امراضِ نسواں (GYNAECOLOGY) پر کافی کچھ لکھا ہے۔ علم الولادت کا سرجری کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے الزہراوی نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں دائیوں کو خاص ہدایات دی ہیں اس نے ان آلات کی تصویریں بھی دی ہیں جن سے مردہ بچے کو رحم سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اسی ضمن میں الزہراوی نے تدابیر حوامل، منع اسقاط، عسر ولادت، تدبیر سیلان طمثِ حوامل اور اخراج جنین میت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ یورپ میں عہدِ جدید میں سائنس آف مڈوائفری نے جو ترقی کی ہے اس میں الزہراوی کے تجربات اور اس کی تحریروں کو بڑا دخل حاصل ہے۔

امراضِ چشم (OPTHAL MOLOGY) پر بھی مسلمانوں نے کافی تحقیق کی ہے اور اس میدان میں وہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ عہد اموی میں زینب نامی ایک عورت ماہر امراض چشم تسلیم کی جاتی تھی اور دور دور سے لوگ اس سے علاج کرانے آتے تھے۔ تذکرۃ الکحالین میں ابن وصیف، جبریل کحال، شریف کحال اور علی بن عیسٰی کحال کا ذکر موجود ہے۔ یہ لوگ اپنے دور میں اپنے فن میں اپنا مدِمقابل نہیں رکھتے تھے۔ اسی ضمن میں علی ابن عیسٰی بغدادی اور عمار موصلی نام کے دو ماہرین کا ذکر بیجا نہ ہوگا، جنہوں نے امراضِ چشم پہ دو کتابیں قلمبند کیں۔ ان لوگوں نے اس فن پہ یونانیوں سے کہیں زیادہ کام کیا۔ اور اپنے تجربے، مشاہدے اور حاصل مطالعہ ان کتابوں میں درج کیا۔ ان کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا اور ۱۷۵۰ء تک ان کی یہ کتابیں یورپ کے طبّی نصاب میں شامل رہیں۔ جرجی زیدان نے اپنی مشہور تصنیف ۔ تاریخ التمدن الاسلامی۔ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موتیا بند کا علاج اب بھی وہی ہے جو مسلمان اطباء اس دور میں کیا کرتے تھے۔

ابوعلی الحسن ابن الحسن ابن الہیثم (۹۶۵-۱۰۳۹ء) جو امام البصریات کے لقب سے مشہور ہیں، اپنے دور میں اپنے فن میں دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے اوّل بار اپنی تالیف۔ کتاب المناظر۔ میں نظریۂ بصارت کی صحیح وضاحت کی۔ وہ پہلے مسلمان ماہر طبیعیات اور طبیب تھے جنہوں نے روشنی اور رنگ، اشعۂ نور کے انعکاس وانعطاف، اغلاط بصری، شفق اور قوس قزح کی حقیقت، ہالہ امراہا،

قوتِ ثقل، خلا اور تحرکات کے بارے میں توجیہہ کی۔ ان کی کتاب المناظر۔ تو زمانے کے ظالم ہاتھوں سے محفوظ نہیں رہی تاہم اس کا ترجمہ (ON OPTICS) کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب میں ابن الھیثم نے اقلیدس اور بطلیموس کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ نگاہ آنکھوں سے نکل کر مختلف چیزوں پر پڑتی ہے اور انھیں دیکھتی ہے۔ ان کی تحقیق یہ تھی کہ خارجی چیزوں کا عکس آنکھ کی پتلی پر پڑتا ہے جسے دماغ کا ایک عصب محسوس کرتا ہے۔ ابن الھیثم کو THEORY OF VISION کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور انھی کے نظریہ پر تحقیق کر کے دورِ جدید کے سائنسدان کیمرہ، ٹیلی ویژن اور عینک بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ابو المنصور صاعد بن بشر بن عبدوس کا شمار دنیائے اسلام کے نامور ترین اطباء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا بہترین فصّاد تھا اور دور دور سے لوگ فصد کھلوانے کے لئے اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ المنصور کی طبیعت بڑی حد تک جدت پسند تھی اور وہ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے ان پر نت نئے تجربے کرتا رہتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ عام اطباء کے برعکس لقوہ اور فالج کا علاج ادویۂ باردہ سے کیا کرتا تھا۔

علاؤالدین ابوالحسن علی بن حازم قرشی، جنھیں طبی دنیا میں جالینوس ثانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ عرب اطباء کے سرتاج مانے جاتے ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ دمشق میں گذرا اور وہیں سنہ ۶۸۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے شیخ الرئیس

کی شہرۂ آفاق تالیف — قانون — کا خلاصہ — قانونچہ — کے نام سے تیار کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے فصول بقراط کی دو شرحیں لکھ کر اپنے وقت کے اطباء سے خراجِ عقیدت وصول کیا۔

مسلمان اطباء میں قاضی عبداللطیف بغدادی علم التشریح البدن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، وہ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں بڑے طویل سفر کیا کرتے تھے۔ ایک بار وہ اسی سلسلے میں مصر گئے اور وہاں مقس کے ایک ٹیلے پر انھوں نے بیس ہزار کے قریب انسانی ڈھانچے دیکھے۔ انھوں نے ان ڈھانچوں کی ساخت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا اور اس کی تفصیل اپنے سفرنامہ میں درج کی۔ اسی طرح انھوں نے بوصیر کے قبرستان میں خاص قسم کی انسانی ہڈیوں کا مشاہدہ کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے ایسی ہڈیاں ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں۔ قاضی موصوف یہ کہا کرتے تھے کہ اگر جالینوس نے بھی میری طرح انسانی ڈھانچوں پر تحقیق کی ہوتی تو پھر وہ اتنی غلطیاں نہ کرتا۔

منصور بن محمد نام کے ایک مسلمان طبیب کا ذکر بھی اکثر کتابوں میں دیکھنے میں آیا ہے، وہ بھی علم التشریح البدن کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے سنہ ۱۳۹۶ء میں اپنا حاصل مطالعہ — کتاب التشریح — کے نام سے قلمبند کیا اور اس کتاب میں انھوں نے جابجا مختلف اقسام کی ہڈیوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ اس کتاب کا ایک مصور نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

جس طرح موجودہ زمانے میں بعض امراض کے SPECIALISTS

موجود ہیں اسی طرح مسلمانوں کے ہاں بھی قرونِ وسطیٰ میں SPECIALISTS موجود تھے۔ ابن عکاشہ اپنے دور میں امراض مثانہ کا ماہر تسلیم کیا جاتا تھا اور ہارون بن موسیٰ الاشنبوتی سرجری کے فن میں اپنی نظیر آپ تھا۔ صاعد بن لبشر بن عبدوس فصد کھولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور دواسازی میں ابن البذوخ، احمد بن یونس، التمیمی، عمر بن یونس، غافقی، ابن جلجل، رشید الدین اور ابن البیطار بڑے مشہور ہوئے ہیں اسی طرح بعض اطباءؑ کے ناموں کے ساتھ فصاد، اسنانی اور کحال کی نسبتیں پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص فن میں بڑا نام پایا ہے۔

مسلمان اطباء کے زمرہ میں اگر ابو علی التنوخی (۹۹۴ - ۹۳۳ء) اور اس کی مشہور تالیف الفرج بعد الشدۃ کا ذکر نہ کیا جائے تو ان کا تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اس کتاب کے چودہ ابواب ہیں اور ان میں بڑے مزے کی حکائتیں درج ہیں۔ التنوخی نے ان حکائتوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے اطباء بھی عام علاج کی بجائے محض ٹوٹکوں سے کامیاب علاج کرتے ہیں، یا اگر کبھی اطبا کسی مریض کے علاج سے عاجز ہو گئے ہیں تو اتفاقیہ مریض کے ہاتھ کوئی ایسی چیز لگ گئی جسے کھانے سے وہ صحت یاب ہو گیا۔ راقم الحروف نے تاریخ کے شہرۂ آفاق استاد پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب کو ایک نجی محفل میں فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بعض امراض کے علاج یونہی اتفاقیہ دریافت ہوئے ہیں۔

التنوخی لکھتا ہے کہ رازی کے پاس ایک مریض آیا جو استسقاءؑ کے

مرض میں مبتلا تھا۔ رازی نے اس کا معائنہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب لاعلاج ہو گیا ہے۔ رازی نے اس مریض کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ گھر جا کر آرام کرو اور جو چاہو کھاؤ پیو۔ تقریباً سال بھر کے بعد رازی کا اس طرف سے گزر ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ شخص نہ صرف یہ کہ تندرست ہو چکا ہے بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ تنومند ہے۔ رازی نے بڑی حیرت سے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا اور اسی سوچ میں تھا کہ کسی طرح اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ ایک دن ایک سانپ ادِھر آ نکلا اور اس نے چھاچھ کو دودھ سمجھ کر ایک پیالہ میں منہ ڈالا۔ جب سانپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے وہ چھاچھ پیالہ میں اگل دی جس سے چھاچھ کا رنگ بدل گیا۔ جب وہ سانپ وہاں سے چلا گیا تو اس شخص نے خودکشی کی نیت سے وہ چھاچھ پی لی۔ چھاچھ کا پینا تھا کہ اُسے نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینہ سے شرابور تھا اور اس کی بیماری جاتی رہی تھی۔

الفرج بعد الشدۃ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی علاج کارگر نہ ہوتا تھا تو بعض اطباءؑ سکتے کے مریض کو کوڑے مارتے تھے، اسی طرح فالج کے مریض کو دودھ میں حنظل اُبال کر پلاتے تھے اور ذات الجنب کے مریض کے لئے بچھو کا ڈنک تجویز کرتے تھے، اس کتاب میں اس طرح کی درجنوں حکایات ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات ٹوٹکوں سے بھی کامیاب علاج ہو جاتا تھا۔

مسلمانوں نے امراضِ نسواں پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ابو القاسم

الزہراوی نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ شیخ الرئیس ابن سینا، یوحنا ابن ماسویہ، ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور عبداللطیف بغدادی نے بھی اس موضوع پر کافی کچھ لکھا ہے۔ عہد نبوی میں اسماء بنت ابوبکرؓ، ام سلیمؓ، ام مطاعؓ، ام عطیہؓ، لیلیٰؓ اور رفیدہ انصاریہؓ عورتوں کے علاج کے لئے خاص طور پر مشہور تھیں۔ اموی عہد میں زینب نامی ایک عورت امراض چشم کے علاج کے لئے مشہور تھی۔ خلیفہ منصور کے عہد میں حفید کی بہن اور بھانجی شاہی حرم میں بیگمات کا علاج کیا کرتی تھیں۔ سان میں ام الحسن بنت قاضی ابوجعفر اندلسی کی حذاقت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ عہد شاہجہان میں ملک الشعراءؒ طالب آملی کی بہن ستی النساءؒ عورتوں کے علاج کیلئے خاص طور پر مشہور تھی اور شاہی حرم میں اسی کا علاج ہوتا تھا۔

مسلمان اطباء نے جہاں نسوانی امراض کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے وہاں عورتوں کے لئے گلگونے اور غازے بھی تیار کئے ہیں۔ ان کے استعمال کے لئے عطریات اور خضاب بنائے ہیں چہرے مہاسے اور چھائیاں دور کرنے کے لئے دوائیاں ایجاد کی ہیں۔ اسی طرح رنگ گورا کرنے کے لئے اُبٹن اور بال بڑھانے کے تیل تیار کئے ہیں۔

عباسی عہد میں اسکندریہ، رُہا اور جندی شاپور میں میڈیکل کالج موجود تھے جہاں طلباء کو باقاعدہ علمِ طب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ نظامی عروضی کی ایک تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کالجوں میں سات سال کا نصاب تھا۔ فاضل مصنف چہار مقالہ میں لکھتے ہیں کہ میرے زمانے

میں میڈیکل کالجوں میں فصولِ بقراط، مسائل حنین بن اسحٰق، شرح نیلی، الحاوی، قانون، ذخیرۂ ثابت بن قرہ، منصوری، اغراض الطب، ذخیرہ خوارزم شاہی اور کامل الصناعۃ پڑھائی جاتی ہیں۔

ان طالب علموں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ انسانی لاشوں کو چیر پھاڑ کر دیکھیں تاکہ وہ جان سکیں کہ قدرت نے انسانی ڈھانچہ کس طرح سے بنایا ہے اور انسان کے اندرونی اعضاء کی ساخت کیا ہے شیخ الرئیس ابن سینا کا قول ہے کہ جب تک کوئی طبیب انسانی لاشوں کو چیر پھاڑ کر نہ دیکھے اس وقت تک وہ کامیاب طبیب نہیں بن سکتا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب طلباء اپنا کورس ختم کر لیتے تھے تو پھر ماہر طبیب ان کا امتحان لیتے تھے اور امتحان میں کامیاب ہونے والے طلباء کو باقاعدہ سند دی جاتی تھی ایک دوسری روایت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ المقتدر کے عہد میں کسی نیم حکیم نے ایک مریض کو غلط علاج سے مار ڈالا تو خلیفہ نے یہ حکم صادر کیا کہ سنان بن ثابت بغداد کے تمام اطباء کا انٹرویو لے اور جو طبیب اس کے معیار پر پورا نہ اترے اُسے طبابت سے روک دے مصر میں یہی کام مہذب الدین نے انجام دیا۔ ہمارے خیال میں یہ اطباء کی رجسٹریشن کی طرف پہلا قدم تھا۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں دنیائے اسلام میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا۔ عبدالملک بن مروان نے دماغی امراض کے علاج

کے لئے دار المجانین کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ہارون الرشید نے بغداد میں ایک عالیشان ہسپتال بنوایا۔ البرامکہ نے اپنے خرچ سے عوام کے فائدے کے لئے ایک ہسپتال قائم کیا۔ المتوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے بیمارستان مغافر کے نام سے ایک ہسپتال بنوایا المقتدر کے عہد میں اس کے وزیر علی بن عیسیٰ نے بیمارستان حربیہ کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ ان کے علاوہ بغداد میں بیمارستان عضدی، بیمارستان السیّدہ، بیمارستان ابن الفرات اور بیمارستان مقتدری کے نام سے چار اور ہسپتال موجود تھے۔ عین ممکن ہے کہ آج کل بغداد میں اتنے ہسپتال نہ ہوں جتنے آج سے ہزار سال پہلے موجود تھے۔

مقریزی نے قاہرہ کے پانچ ہسپتالوں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ان میں سے اولین ہسپتال احمد بن طولون نے ۸۷۳ء میں قائم کیا تھا اور اس کی تعمیر پہ ساٹھ ہزار دینار خرچ ہوئے تھے۔ قاہرہ کا دوسرا اہم ہسپتال بیمارستان الکبیر تھا جو ملک المنصور نے ۱۲۸۵ء میں قائم کیا تھا۔ اس ہسپتال کا سالانہ خرچ دس لاکھ درہم کے لگ بھگ تھا۔ اس ہسپتال کی جو تفصیل مقریزی نے دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ہسپتال میں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے۔ زنانہ وارڈوں میں نرسیں اور مردانہ وارڈوں میں خدام مریضوں کی خدمت پہ مامور تھے۔ اس کے علاوہ مختلف امراض کے مریضوں کے لئے الگ الگ وارڈ تھے۔ ایک وارڈ میں صرف پیچش کے مریض رکھے جاتے تھے اور دوسرا وارڈ صرف بخار میں مبتلا مریضوں کیلئے

مخصوص تھا۔ اسی طرح ایک وارڈ میں وہ مریض رکھے جاتے جن کے اپریشن کئے جاتے تھے اور ایک وارڈ آنکھوں کے علاج کے لئے وقف تھا۔ ہسپتال میں مریضوں کے لئے پرہیزی غذائیں تیار کرنے کے لئے باورچی خانے موجود تھے۔ ڈسپنسری اور اس کے ساتھ ادویہ کے لئے سٹور موجود تھے جہاں ہر وقت دوائیوں کا بڑا سٹاک موجود رہتا تھا۔ ہسپتال کے سٹاف کے لئے رہائشی کوارٹرز بھی بنے ہوئے تھے مقریزی کے اس بیان کو پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ بیمارستان الکبیر کسی طرح بھی ہمارے عہد کے کسی ہسپتال سے پیچھے نہیں تھا۔

برِ صغیر پاک و ہند میں محمد بن تغلق نے ہسپتال بنانے میں بڑی دلچسپی لی۔ ایک روائت کے مطابق اس کے عہد میں صرف دہلی میں ہی ستر کے قریب ہسپتال اور ڈسپنسریاں موجود تھیں۔ سلطان بذاتِ خود بڑا اچھا طبیب تھا اور وہ مریضوں کا معائنہ کر کے ان کے لئے نسخے تجویز کر دیتا تھا۔ اس کے جانشین فیروز تغلق نے اپنی تصنیف فتوحاتِ فیروز شاہی میں شفا خانے تعمیر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ جہانگیر نے بھی تخت نشین ہوتے ہی اپنی قلمرو میں شفا خانے تعمیر کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں بعض علاقوں میں شہروں سے دور دیہات میں رہنے والوں کی سہولت کے لئے سفری شفا خانے موجود تھے۔ عباسی خلیفہ المقتدر کے عہد خلافت میں سنان بن ثابت ایسے شفا خانوں کا انچارج تھا۔ اکثر کتابوں میں ایسے حوالے عام ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے علاج کے لئے جیلوں میں بھی شفا خانے

موجود تھے۔

سطورِ بالا کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں پوری دنیائے اسلام میں ہسپتالوں کا ایک جال بچھا دیا اور اپنے تجربات اور اجتہادات سے فنِ طب کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ یہ مسلمان ہی تھے جن کی وجہ سے جالینوس اور بقراط کو شہرت دوام ملی یہاں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ طبِ اسلامی، طبِ یونانی کا ہی دوسرا نام ہے۔ آج جسے طبِ اسلامی کہتے ہیں وہ طبِ یونانی، طبِ ایرانی، طبِ ہندوستانی اور طبِ مصری کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مسلمانوں نے دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ لیکن ان کی کورانہ تقلید نہیں کی، بلکہ اپنے اجتہادات اور تجربات سے طبِ اسلامی کے نام سے ایک الگ عمارت کھڑی کر دی ہے۔

موجودہ ایلوپیتھی کی ترقی میں مسلمانوں کی تصانیف اور ان کے لاطینی تراجم کو جو دخل حاصل ہے اس کا ذکر بھی گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ آج جدید میڈیکل سائنس کی کتابیں طبِ اسلامی کی اصطلاحات سے مملو ہیں۔ آج بھی یورپ کے میڈیکل کالجوں میں لیکچروں کے دوران اساتذہ بار بار AVICENNA، ALHAZEN، GABER، RHAZES، HALY ABBAS اور AVERROES کا حوالہ دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم نے مسلمانوں کی طبی خدمات کا ایک بہت ہی مختصر سا جائزہ لیا ہے، اگر ان کی خدمات کا مفصل ذکر کرنا ہو تو۔

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے

## ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

# داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد

تعمیرِ ملت کے اہم فریضہ کو جس انہماک، خلوص اور اہتمام سے صوفیائے کرام نے انجام دیا ہے اس کی مثال دوسرے مذاہب کی تاریخ میں مفقود ہے۔ یہ صوفیائے کرام ہی کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ ہے کہ آج برِصغیر پاک و ہند میں اسلام کے سولہ سترہ کروڑ نام لیوا موجود ہیں اور آج ان دونوں ملکوں کی لاکھوں مساجد سے روز و شب میں پانچ بار صدائے توحید بلند ہوتی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اگر آپ ان بزرگوں کے کارناموں، ان کی تعلیمی اور تبلیغی کوششوں اور سوانحِ حیات سے واقفیت پیدا کرنا چاہیں تو آپ کو صحیح اور مستند حالات نہ مل سکیں گے ان کے متعلق جس قدر لٹریچر ملتا ہے اس پر کشف و کرامات اور عقیدت کی کہر چھائی ہوئی ہے اور جس قدر روایات ملتی ہیں ان سے ہم ان بزرگوں کی سیرت نگاری تو درکنار ان کی دھندلی سی تصویر بھی نہیں بنا سکتے۔ صوفیوں کے تذکروں کے متعلق عموماً اور خزینۃ الاصفیاء کے متعلق خصوصاً مشہور تاریخ دان پیر دستگیر محمد حبیب فرماتے ہیں، "اس کتاب کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقاید کا سہارا لے کر ان تمام اصولِ اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا جو علمائے اسلام

کی نظر میں صدیوں تک علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں، تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کر کے محض عقاید پر علم کی عمارت تعمیر کرنا ناسمجھی نہیں تو کیا ہے۔[1]

تاریخ مشائخ چشت کے دیباچہ میں موصوف لکھتے ہیں،

اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعقیدگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاؒ نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی ایسی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آ جاتی ہے موجودہ نسلیں ان پر بحث و مباحثہ کرنے کی بجائے بے توجہی سے ان کو نظر انداز کرنا بہتر سمجھتی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کشف و کرامات کے بے معنی قصوں کا تصوف سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ کا کہنا ہے کہ کرامات تصوف کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔[2]

ہمارے سوانح نگاروں مثلاً علامہ فرید الدین عطارؒ، مفتی محمد سرور لاہوری، امیر حسن سجزیؒ، نور احمد چشتیؒ، شیخ الہدیہ اور صاحبزادہ کمال الدین محمد احسان نے محیر العقل روایات لکھ کر فن سوانح نگاری اور اصولِ تذکرہ نویسی سے انحراف کیا ہے۔ ان کی بدولت غلط روایات خاص و عام میں مشہور ہو گئیں، ان میں سے ایک حضرت داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق ہے۔

---

[1] خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۳ء ص ۲۰-۲۱

[2] ایضاً۔

خواجہ حسن سجزیؒ فوائد الفواد میں داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق لکھتے ہیں:-

شیخ حسین زنجانی و شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما ہر دو مرید یک پیر بودہ اند و آن پیر قطب عہد بودہ است، شیخ حسین زنجانی از دیرباز ساکن لہاور بود، بعد از چندگاہ پیر الیشان خواجہ ہجویری را فرمودہ کہ در لہاور رو و ساکن شو، شیخ علی ہجویری عرض داشت کرد کہ حسین زنجانی آنجا ہست، پیر فرمود کہ تو برو، و چوں علی ہجویری بحکم اشارت الیشاں در لہاور رسید شب بود بامداد آں جنازہ شیخ حسین زنجانی را بیروں آوردند۔[3]

شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اپنے وقت کے قطب تھے۔ شیخ حسین زنجانی مدت سے لاہور میں قیام پذیر تھے۔ کچھ مدت بعد ان کے پیر نے خواجہ ہجویری سے فرمایا کہ لاہور جاؤ اور وہیں رہو۔ شیخ علی ہجویری نے عرض کی کہ حسین زنجانی جو وہاں ہیں۔ پیر نے فرمایا کہ تم جاؤ۔ جب علی ہجویری ان کے حکم کے مطابق لاہور پہنچے تو اس وقت رات ہو چکی تھی۔ اگلی صبح لوگ شیخ حسین زنجانی کا جنازہ اٹھائے باہر نکلے

یہ روائت کثرت سے تذکروں میں پائی جاتی ہے کہ اب ہر شخص بلاچون و چرا اسے تسلیم کر چکا ہے اور اس کا منکر بدعقیدہ اور بدمذہب ہونے کی تہمت سے نہیں بچ سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ روایت سراسر غلط اور الحاقی معلوم ہوتی ہے۔ اس روائت کا تجزیہ کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم اس روائت کے الفاظ پر غور کریں گے اس کے بعد اسے تاریخ کی کسوٹی پر رکھیں گے۔

---

[3] خواجہ حسن سجزی، فوائد الفواد، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۷

اس روائت میں حضرت داتا گنج بخش کو ایک جگہ شیخ علی ہجویری، دوسری جگہ خواجہ ہجویری اور تیسری جگہ علی ہجویری لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حسین زنجانیؒ کو ایک جگہ شیخ حسین زنجانیؒ، دوسری جگہ حسین زنجانیؒ اور تیسری جگہ پھر شیخ حسین زنجانی لکھا ہوا ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ خواجہ حسن سجزی جیسا ذمہ دار تذکرہ نویس اور فاضل اجل ایسی شتر گربگی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ فوائد الفواد تو ایسی بلند پایہ اور مستند کتاب ہے کہ امیر خسرو اسے دیکھ کر اکثر فرمایا کرتے تھے۔

کاشکے تمام تصنیفات من بنام حسن بودی
وایں کتاب از من بودی[5]

کاش میری تمام تصانیف حسن کے نام ہوتیں
اور یہ کتاب میرے نام ہوتی۔

ہمارے خیال میں یہ روائت الحاقی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی کم عقل کی گھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ حسن سجزی کو سید علی ہجویری کی بجائے گنج بخشؒ لکھنا چاہیے تھا، یہ خطاب سید علی ہجویری کو خواجہؒ موصوف کے پیر چہارم خواجہ معین الدین اجمیریؒ عطا فرما چکے تھے، اس لئے انھیں سنتِ شیخ کا ادب کرنا چاہیئے تھا۔

فوائد الفواد کے متعلق علم تاریخ کے ممتاز عالم اور راقم الحروف کے استاد مرحوم پروفیسر محمد شجاع الدین ماہنامہ "دار العرفان"، بابت ماہ جنوری ۱۹۵۵ء میں اپنے ایک مضمون بعنوان "حسن سجزیؒ" میں تحریر فرماتے ہیں" کہ ان ملفوظات میں بہت سی الحاقی باتیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔" ہمارے بیشتر اکابر کی تصانیف میں تحریف ہو چکی ہے۔ بسا اوقات ایک ہی کتاب کے دو نسخے آپس میں نہیں ملتے۔ اسی طرح کئی فرضی کتابیں مثلاً شجاع حیدری، دیوان خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ، دیوان خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دیوان زیب النساءؒ وجود میں آ چکی ہیں۔ شیخ عبدالحق

---

[5] شیخ عبدالحق محدثؒ، اخبار الاخیار، مطبوعہ، دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۱۰۱

محدث دہلویؒ کے زمانے تک شیخ بو علی قلندر پانی پتیؒ کی مثنویات اور رسائل عام ہو چکے تھے، شیخ محدثؒ نے انہیں مختر عات عوام بتایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ تزکِ جہانگیری کے مختلف نسخوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جب یار لوگوں نے حدیثیں گھڑ گھڑ کر صحاح ستہ میں شامل کر دی ہیں تو پھر صوفیوں کے تذکروں کا کہنا۔ حقائق بالا کی روشنی میں فوائد الفواد کی روایات پر کیونکر اعتماد کیا جائے۔ ہمارے خیال میں جن کتابوں میں فوائد الفواد کے حوالے سے یہ روائت بیان کی گئی ہے وہ بھی پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہیں۔

اس روائت میں شیخ حسین زنجانیؒ اور سید علی ہجویریؒ کو ایک ہی پیر کا مرید ظاہر کیا گیا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ہم عصر تھے۔ جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے شیخ حسین زنجانیؒ اور سید علی ہجویری ہم عصر نہیں بلکہ شیخ حسین زنجانیؒ اور خواجہ معین الدین حسن اجمیریؒ ہم عصر ہیں۔ سیر العارفین میں شیخ جمالی کنبوہؒ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی کہ پیر
حضرت شیخ سعد الدین حمویہ قدس روحہٗ
است در صدر حیات بود میان حضرت
زبدۃ المشائخ والاولیا معین الحق والدین
قدس سرہٗ و حضرت شیخ المشائخ والاولیاءً
شیخ حسین زنجانی قدس سرہٗ محبتے و اتحادی
فوق الحد واقع شد[6]

حضرت شیخ المشائخ حسین زنجانی جو حضرت
شیخ سعد الدین قدس سرہٗ کے پیر ہیں، ان
دنوں حیات تھے حضرت زبدۃ المشائخ والاولیاءً
معین الحق والدین قدس سرہٗ اور حضرت
شیخ المشائخ والاولیاء شیخ حسین زنجانی
قدس سرہٗ کے درمیان بے حد محبت اور
رابطہ ضبط تھا۔

---

[6] شیخ جمالی، سیر العارفین، مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر ۵ II PF، ورق ۳ب۔

عمل صالح کا مصنف محمد صالح کنبوہ بھی خواجہ صاحبؒ کے حالات کے ضمن میں رقمطراز ہے:۔

| | |
|---|---|
| بالجملہ در لاہور بہ صحبت شیخ حسین زنجانی رسیدہ[7] | مختصر یہ کہ انہیں لاہور میں شیخ حسین زنجانیؒ کی صحبت میسر آئی۔ |

داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں اس بات کا ذکر بالصراحت کیا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کی لاہور میں شیخ حسین زنجانیؒ سے ملاقات رہی[8]

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ اور حضرت حسینؒ زنجانی ہم عصر تھے اور دونوں میں بڑی محبت تھی۔

خواجہ معین الدینؒ کے ایک ہم عصر مورخ منہاج سراج جوزجانی اپنی مشہور تصنیف طبقاتِ ناصری میں خواجہ صاحب کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| این داعی از ثقہ شنید کہ از معارف جبال بلاد تولک بود لقب او معین الدین ادمی گفت کہ من دراں لشکر با سلطان غازی الیوم[9] | اس دعا گو نے قابلِ اعتبار لوگوں سے یہ سنا ہے کہ بلاد جبال کا ایک درویش، جس کا لقب معین الدین تھا، یہ کہا کرتا تھا کہ میں سلطان (شہاب الدین غوری) کے لشکر میں غازی کی حیثیت سے شامل تھا۔ |

خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے جس جنگ میں شرکت فرمائی تھی وہ ترائن

---

[7] محمد صالح، عمل صالح، جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۸ء، ص ۵۰

[8] داراشکوہ، سفینۃ اولیاء، (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۸

[9] جوزجانی، طبقات ناصری، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء، ص ۳۵

کی دوسری جنگ تھی جو ۱۱۹۲ء میں لڑی گئی تھی۔ حضرت داتا گنج بخش نے ۱۰۷۶ء میں یا اس کے فوراً بعد وفات پائی ہے[10]، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن ایام میں خواجہ صاحب لاہور میں حسین زنجانیؒ کے ساتھ مقیم تھے اس وقت حضرت داتا گنج بخشؒ کو فوت ہوئے تقریباً ایک صدی گذر چکی تھی۔ اس لئے حضرت داتا گنج بخش اور حسین زنجانیؒ ہم عصر نہیں ہو سکتے۔

تحقیقاتِ چشتی کی روایت کے مطابق حضرت شیخ حسین زنجانیؒ ۶۰۴ھ میں فوت ہوئے تھے[11]۔ مفتی غلام سرور کی تحقیق کے مطابق ۶۰۰ھ ان کا سالِ وفات ہے[12]۔ مولوی نور احمد چشتی اور مفتی غلام سرور لاہوری، دونوں نے حضرت داتا گنج بخش کا سالِ وفات ۴۶۵ھ تحریر کیا ہے۔ ان کے اس بیان کے مطابق جب حضرت حسین زنجانیؒ فوت ہوئے اس وقت داتا گنج بخشؒ کو انتقال کئے ۱۳۹ یا ۱۳۵ سال گذر چکے تھے۔ اب آپ یہ اندازہ لگائیے کہ صاحبِ فوائد الفواد کی یہ روائت کہ جب داتا گنج بخشؒ لاہور پہنچے تو اس وقت رات تھی۔ اگلی صبح حضرت حسین زنجانیؒ کا جنازہ اٹھا، کہاں تک صحیح ہے؟۔

---

[10] شیخ محمد اکرام نے آب کوثر مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۷۷، پر داتا صاحبؒ کا سال وفات ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء بتایا ہے جو غلط ہے۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب نے داتا گنج بخش کے حالات میں جو فاضلانہ کتاب تحریر فرمائی ہے اس میں وہ اس سن پر متفق نہیں ہیں۔ اور اورئنٹل کالج میگزین میں آغا یحییٰ جیبی نے بھی داتا صاحب کے سن وفات پر فاضلانہ بحث کی ہے وہ بھی ۴۶۵ھ پر متفق نہیں ہیں۔

[11] نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۵

[12] مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء، مطبوعہ لاہور ۱۲۸۴ھ، ص ۹۰۵

صاحبِ فوائد الفواد کی تحریر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ سید علی ہجویریؒ کے پیر حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ نے انہیں اپنی حیات ہی میں حضرت حسین زنجانیؒ کی جگہ لینے کے لئے لاہور بھیج دیا تھا، حالانکہ کشف المحجوب میں حضرت علی ہجویریؒ کی یہ تحریر موجود ہے۔

آن روز کہ وی را وفات آمد بہ
بیت الجن بود و آن دہی ست
بر سر عقبہ میان بانیاز و دمشق،
سر بر کنار من داشت [۱۳]

جس دن ان کا انتقال ہوا وہ بیت الجن
میں تھے۔ یہ ایک گاؤں ہے جو عقبہ جانے
والی سڑک پر دمشق کے قریب
بانیا ندی کے کنارے واقع ہے۔
(وفات کے وقت) ان کا سر میرے
زانو پر تھا۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیاء میں حضرت ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ کا سالِ وفات سنہ ۴۵۳ھ تحریر کیا ہے [۱۴] پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب علامہ ذہبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے سنہ ۴۶۰ھ میں انتقال فرمایا تھا۔ [۱۵] نور احمد چشتی کی روائت کے مطابق حضرت حسین زنجانیؒ سنہ ۵۵۷ھ میں لاہور تشریف لائے تھے، [۱۶]

---

[۱۳] سید علی ہجویریؒ، کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۳

[۱۴] غلام سرور لاہوری، خزینۃ الاصفیاؒ، ص ۸۸۵

[۱۵] پروفیسر عبدالرشید، دی لائف اینڈ ٹیچنگز آف حضرت داتا گنج بخشؒ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۲۵ [۱۶] تحقیقات چشتی، ص ۲۱۳

یعنی حضرت ختلیؒ کی وفات کے ۱۰۴ یا ۹۷ سال بعد، اور ان کا انتقال بقول چشتی سنہ ۶۰۴ھ میں یعنی حضرت ختلیؒ کی وفات کے ۱۵۱ یا ۱۴۴ سال بعد ہوا تھا۔ اب کہیے کہ داتا گنج بخش متوفی سنہ ۴۶۹ھ حضرت حسین زنجانیؒ کی وفات پر لاہور میں کیونکر وارد ہوئے تھے۔

مولوی نور احمد چشتی نے بھی داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق وہی واقعہ نقل کیا ہے جو خواجہ حسن سجزی نے فوائد الفواد میں بیان کیا ہے۔ مولوی صاحب کو اتنی بھی ہوش نہیں رہتی کہ وہ اپنی کتاب میں داتا صاحبؒ کی وفات سنہ ۴۶۵ھ اور حضرت حسین زنجانیؒ کی سنہ ۶۰۴ھ لکھ کر پھر بھی داتا صاحبؒ کو حضرت زنجانیؒ کے جنازہ میں شریک کر دیتے ہیں [۱۷]

مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کا قصہ من و عن وہی تحریر کیا ہے جو صاحبِ فوائد الفواد نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد مفتی صاحب نے داتا صاحبؒ کا سال وفات سنہ ۴۶۵ھ لکھا ہے اور حضرت حسین زنجانیؒ کا سنہ ۶۰۰ھ، اس کے باوجود انھوں نے حضرت داتا گنج بخشؒ کو حضرت حسین زنجانیؒ کے جنازہ میں شریک کر کے داخل ثواب کر دیا ہے۔

جب تحقیقات چشتی اور خزینۃ الاصفیاء میں اس طرح کی بے وسرو پا باتیں درج ہوں تو پھر ان پر کس طرح اعتماد کیا جائے ہمارے خیال میں داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد کے متعلق جو روائت فوائد الفواد میں درج ہے وہ صحیح نہیں۔ ہمیں تو وہ روائت الحاقی

---

[۱۷] ایضاً، ص ۱۸۹۔

معلوم ہوتی ہے فوائد الفواد ہی کے ایک اندراج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ رحمۃ اللہ علیہ نے کشف المحجوب کا بغور مطالعہ فرمایا تھا[1] جہاں داتا گنج بخشؒ نے اپنی اس تالیف میں یہ درج فرمایا ہے کہ جب حضرت ختلیؒ کا بیت الجن میں انتقال ہوا تو ان کا سر میرے زانو پر تھا، حضرت نظام الدین اولیاؒ کی نظر سے یہ تحریر ضرور گزری ہو گی۔ اس لئے حضرت سلطان المشائخؒ ایسی بے تحقیق بات نہیں کہہ سکتے تھے کہ حضرت ختلیؒ نے انہیں حضرت زنجانیؒ کی جگہ لینے کے لئے لاہور بھیجا۔ وہ رات کے وقت لاہور پہنچے اور اگلی صبح حضرت زنجانیؒ کا جنازہ اٹھا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ حضرت ختلیؒ نے سنہ ۴۵۳ھ یا سنہ ۴۶۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت ہجویریؒ لاہور تشریف لائے اور انھوں نے سنہ ۴۶۹ھ یا اس کے فوراً بعد انتقال فرمایا۔ حضرت ہجویریؒ کے انتقال کے ۱۱۲ برس بعد حضرت زنجانیؒ لاہور تشریف لائے اور انھوں نے یہاں ۴۳ یا ۴۷ سال قیام کے بعد سنہ ۶۰۰ھ یا سنہ ۶۰۴ھ میں وفات پائی۔

* * *

---

[1] امیر حسن سجزی، فوائد الفواد۔ مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء، ص ۷۰

طوبیٰ ریسرچ لائبریری
اسلامی اردو، انگلش کتب، 
تاریخی، سفرنامے، لغات، 
اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ